میری ذات ذرہ بے نشاں
پاک سوسائٹی
از
عمیرہ احمد
ڈاٹ کام

قارئین کے بے حد اصرار پر پیش خدمت ہے دور حاضر کی مقبول ترین مصنفہ عمیرہ احمد کی کتاب میری ذات ذرّہ بے نشان......
اس کہانی کو ڈرامائی تشکیل کے بعد ایک نجی ٹی وی چینل پر بھی اسی نام سے پیش کیا جا رہا ہے

(تین کہانیوں کا مجموعہ)

مصنفہ: عمیرہ احمد

انتساب!

ثمریہ محمود قاضی کے نام

فہرست

پیش لفظ

کہانی لکھنا بہت آسان کام ہوتا ہے۔اگر آپ پڑھے لکھے ہیں کاغذ قلم آپ کے پاس ہے اور آپ دنیا میں رہتے ہیں تو آپ کسی بھی وقت ایک عدد کہانی لکھ سکتے ہیں۔ جہاں تک کہانی کے اچھا یا برا ہونے کا تعلق ہے تو اس کا فیصلہ آپ نہیں کرتے پڑھنے والے کرتے ہیں یعنی دوسرے لوگ۔ جو کہانی...... کہانی کم حقیقت زیادہ لگے وہ اچھی کہانی ہوتی ہے اور جو کہانی بس کہانی ہی لگے وہ بری کہانی ہوتی ہے۔

''میری ذات ذرہ بے نشاں'' میری پہلی کتاب ہے اور اس میں شامل کہانیاں میری ابتدائی تحریروں میں سے ہیں اچھی ہیں یا بری یہ مجھے نہیں پتہ (کیونکہ میں نے انھیں ہمیشہ جانبداری سے پڑھا ہے) بہر حال ایک چیز پورے دعویٰ سے کہتی ہوں انھیں میں نے سوچا ہے اور میں نے ہی لکھا ہے۔ میرے لیے یہ تینوں کہانیاں بچے کے پہلے قدم کی طرح ہیں اور بچے کا پہلا قدم کبھی بھی بہت متوازن، ہموار اور مستحکم نہیں ہوتا مگر پہلا قدم اٹھائے بغیر چلنا بھی تو نہیں آتا ان تینوں کہانیوں میں کوئی خاص بات نہیں ہے مگر کبھی کبھی ''عام'' چیزوں کو بھی تو دیکھنا اور پڑھنا چاہیے بعض ''عام'' چیزیں اور باتیں آپ کو بہت ''خاص'' بننے میں مدد دیتی ہیں۔

کسی بھی کتاب کو کامیاب بنانے کے لیے جتنی کوشش رائٹر کو کرنی پڑتی ہے۔اتنی ہی کوشش پبلشر کو کرنی پڑتی ہے۔ پچھلے کچھ عرصہ میں میری کتابوں کے حقوق اشاعت حاصل کرنے کے بعد ادارہ علم و عرفان نے اس ذمہ داری کو میری توقعات سے زیادہ بہتر طور پر ادا کیا ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قارئین میری اس رائے سے اتفاق کریں گے۔

عمیرہ احمد

دسمبر 1999ء

میری ذات ذرّہ بے نشاں

''کیا میں عارفین عباس سے مل سکتی ہوں؟''

بیل بجانے پر ایک لمبا تڑنگا چوکیدار نمودار ہوا تھا اور اس نے کچھ جھجکتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

''آپ کون ہیں اور کیوں ملنا چاہتی ہیں ان سے؟''

چوکیدار نے عقابی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے جوابی سوال کیا۔ وہ چند لمحوں کے لیے کچھ بول نہ پائی۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کچھ بوکھلا کر اس نے چوکیدار کو دیکھا تھا اور پھر پتا نہیں کیا خیال آنے پر پرس میں سے وہ خط نکال لیا جو اس کی ماں نے اسے دیا تھا۔

''یہ آپ ان کو دے دیں پھر وہ شاید مجھ سے ملنا چاہیں گے۔''

اس نے خط چوکیدار کی طرف بڑھا دیا۔ وہ کچھ دیر خط ہاتھ میں لیے اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر شاید اسے اس پر ترس آ گیا تھا۔ گیٹ بند کر کے وہ اندر چلا گیا تھا وہ وہیں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ پانچ دن پہلے وہ خود بھی عارفین عباس نامی کسی شخص کو نہیں جانتی تھی۔ وہ اب بھی صرف اس کے نام ہی سے آشنا تھی۔

عارفین عباس کون ہے؟ امی سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ وہ اس کی کیا مدد کرے گا؟ ان سوالوں کے جواب ابھی اس کے پاس نہیں تھے اور نہ ہی اس نے ان سوالوں کے جواب پانچ دن پہلے امی سے لینے کی کوشش کی تھی جب انھوں نے اپنی زندگی کی آخری رات کو فریج میں لکھا ہوا وہ مختصر خط اور ایک پتا اس کے حوالے کیا تھا۔

''اگر میں مر گئی تو اس کے پاس چلی جانا، یہاں اکیلے مت رہنا۔''

کئی دنوں کے بعد یہ پہلا اور آخری جملہ تھا جو ان کے منہ سے ادا ہوا تھا۔ انھوں نے پھر آنکھیں بند کر کے چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اب زیادہ دن زندہ نہیں رہیں گی لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ اس رات کے بعد وہ دوبارہ انھیں زندہ نہیں دیکھ سکے گی۔ وہ کچھ دیر حلق میں اٹکے ہوئے سانس کے ساتھ انھیں دیکھتی رہی تھی۔ پھر پتا نہیں اسے کیا ہوا، وہ کنگھی اٹھا کر ماں کے پاس آ گئی۔

''امی! میں آپ کے بال بنا دوں؟'' اس نے گھٹنوں کے بل چارپائی کے پاس بیٹھ کر بڑی بے قراری سے پوچھا تھا۔ آنکھیں کھل گئی تھیں۔ کچھ دیر تک اس پر نظر مرکوز رکھنے کے بعد اس کمزور وجود میں حرکت ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ یہ اثباتی جواب تھا۔ وہ چارپائی پر ان کے پیچھے بیٹھ گئی اور ڈبڈبائی آنکھوں سے ان کے بکھرے بالوں کو سمیٹنے لگی۔ پتا نہیں کیوں لیکن اس کا دل بار بار بھر آ رہا تھا۔ بال سنوارنے کے بعد وہ پیچھے سے اٹھ کر ماں کے سامنے آ گئی تھی۔

دودھ گرم کردوں؟'' اس نے پھر سے پوچھا تھا۔ جی چاہتا تھا۔ آج تو وہ باتیں کریں۔ اپنے وجود پر چھائی ہوئی خاموشی کا وہ حصار توڑ دیں جس نے کبھی اسے ان کے قریب نہیں ہونے دیا۔

''نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔''

وہ اس پر نظریں جمائے دھیرے سے بولی تھیں پھر بڑی آہستگی سے انھوں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے حصار میں لیا اور اس کا ماتھا چوم لیا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی تھی اسے نہیں یاد تھا کہ کبھی انھوں نے اس کا ماتھا چوما ہو۔ آج کیا خاص بات تھی۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی اور ان کے چہرے کی زردی بھی اس چمک کو ماند کرنے میں ناکام رہ رہی تھی۔ چند لمحوں کے ایک لمس نے اس کے دل میں سے پچھلے کئی برسوں کے گلے شکوے، کدورتیں، ناراضگیاں ختم کردی تھیں۔

''آپ لیٹ جائیں۔'' اچانک اسے خیال آیا تھا کہ وہ بیمار ہیں۔ وہ اسی خاموشی سے لیٹ گئی تھیں۔ رات کو سونے سے پہلے اس نے بہت دیر تک اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھے رکھا تھا۔ دوسری صبح اس نے ناشتے کے لیے انھیں اٹھانا چاہا جب اسے احساس ہوا کہ وہ زندہ نہیں ہیں۔

✿

اس نے ایک گہری سانس لے کر گیٹ پر نظریں جما دیں۔ گیٹ کے دوسری طرف سے یک دم قدموں کی آوازیں ابھری تھیں۔ کوئی دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ وہ دیوار سے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ گیٹ میں موجود چھوٹے دروازے کو کھولنے کے بجائے کسی نے بڑی تیزی سے پورے گیٹ کو کھول دیا تھا۔ پچاس پچپن سال کا ایک دراز قد آدمی تھری پیس سوٹ میں اس کے سامنے موجود تھا۔

''سارہ؟'' وہ اس شخص کے منہ سے اپنا نام سن کر حیران رہ گئی تھی۔ کچھ نروس ہوکر اس نے اپنا سر ہلایا تھا۔

''اندر آ جاؤ۔'' وہ اس شخص کے لہجے کی نرمی پر حیران ہوتے ہوئے گیٹ سے اندر آ گئی تھی۔

''تمہارا سامان کہاں ہے؟'' اس شخص نے اس کے اندر آتے ہی پوچھا تھا۔

''سامان تو گھر پر ہی ہے۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا تھا گھر کو باہر سے دیکھنے پر وہ شش و پنج میں تھی۔ اندر آ کر اضطراب میں مبتلا ہوگئی تھی۔

''میں یہاں کیسے رہوں گی؟'' بار بار ایک ہی سوال اس کے ذہن میں ابھر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ آؤ پھر سامان لے آتے ہیں۔'' وہ اس کا جواب سن کر بغیر کسی تامل کے پورچ میں کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ گئے تھے۔ وہ کچھ جھجکتی ہوئی ان کے پیچھے آئی۔

''پتا نہیں ان کو وہاں لے جانا ٹھیک ہوگا یا نہیں۔'' اس نے سوچا تھا مگر کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ہی وہ گاڑی کا دروازہ کھول چکے تھے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد انھوں نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ وہ کچھ تذبذب کے عالم میں اندر بیٹھ گئی۔

''آپ عارفین عباس ہیں؟'' اس نے اندر بیٹھتے ہی پوچھا تھا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر ابھری تھی۔

''ہاں، میں عارفین عباس ہوں۔'' گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے انھوں نے جواب دیا۔

''صبا کیسی ہے؟'' انھوں نے گاڑی ریورس کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''صبا!'' کچھ غائب دماغی کے عالم میں اس نے نام دہرایا تھا۔ پھر ایک جھماکے کے ساتھ اس کے دماغ کی اسکرین پر ماں کا چہرہ ابھرا تھا۔

''امی۔'' بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔

''ہاں کیسی ہے وہ؟'' عارفین عباس گاڑی گیٹ سے باہر نکال چکے تھے۔ وہ چند لمحوں تک چپ رہی۔ گاڑی سڑک پر بڑھاتے ہوئے انھوں نے ایک بار پھر اس سے وہی سوال کیا تھا۔

''امی مر چکی ہیں۔'' بے حد دھیمی آواز میں آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی تھی۔

''صبا مر چکی ہے؟'' عارفین کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''ہاں!'' اس نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ وہ ان کے چہرے کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ گاڑی میں کچھ دیر تک خاموشی رہی۔

''کب؟'' آواز اب پہلے کی طرح مستحکم نہیں تھی۔

''پانچ دن پہلے۔'' عارفین عباس نے اسٹیرنگ پر ماتھا ٹکا لیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر انھیں دیکھا۔ وہ رو نہیں رہے تھے۔ بس ان کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ وہ خاموشی سے انھیں دیکھتی رہی۔ فریج میں لکھی ہوئی وہ تحریر اس کی نظروں کے سامنے آ گئی تھی۔

عارفین!

سارہ کو اپنے پاس رکھ لینا، اسے میرے خاندان کے پاس مت بھیجنا۔ ماضی دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اس کا خیال رکھنا۔

صبا

''امی کا ماضی کیا ہو سکتا ہے جسے وہ مجھ سے چھپانا چاہتی ہیں۔ اپنی مرضی کی شادی، خاندان کا شادی قبول کرنے سے انکار، ان کا گھر سے چلے جانا، ابو کی موت، امی کا واپس جانا نہ خاندان سے کوئی رابطہ رکھنا۔'' اس نے ہمیشہ کی طرح کڑی سے کڑی ملائی تھی۔ وہ پہیلیاں بوجھنے میں ہمیشہ سے ہی اچھی تھی۔

''لیکن امی کو جان لینا چاہیے تھا کہ میں کبھی بھی بے وقوف نہیں رہی۔'' اس نے سوچا۔ ''اور یہ شخص جو اس خبر پر اس قدر نڈھال ہے۔ یہ کون ہو سکتا ہے۔ یقیناً امی کو پسند کرتا ہو گا اور امی نے اس سے شادی نہیں کی ہو گی۔ میرے ابو کی وجہ سے اسے ٹھکرا دیا ہو گا۔'' اس نے عارفین عباس کی گتھی بھی سلجھائی تھی۔ ''اور اگر امی اس سے شادی کر لیتیں تو ہم کتنی اچھی زندگی گزار سکتے تھے۔ لیکن پتا نہیں یہ محبت نام کا عذاب کیوں چمٹ جاتا ہے جو کچھ سوچنے ہی نہیں دیتا۔''

اس نے رنجیدگی سے سوچا تھا۔ عارفین عباس نے اب اسٹیرنگ سے سر اٹھا لیا تھا۔ انھوں نے دوبارہ اس پر نظر نہیں ڈالی، سارہ کو ان پر بے تحاشا ترس آیا۔ عارفین عباس نے اس سے پتا پوچھا تھا۔ ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس نے پتا بتا دیا۔

''آپ امی کے کیا لگتے ہیں؟'' اس نے پتا بتاتے ہی ان کے چہرے پر نظر جمائے سوال کیا تھا۔

''وہ میری چچازاد تھی۔'' آواز میں شکستگی تھی۔

''امی کے ابو زندہ ہیں؟'' اس نے اگلا سوال کیا تھا۔

''امی فوت ہو چکی ہیں، ابو امریکہ میں ہیں۔''

''امی کے کوئی بہن بھائی ہیں؟'' اس کی بے تابی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''تمہاری ایک خالہ اور ایک ماموں ہیں۔ وہ دونوں بھی امریکہ میں ہی ہوتے ہیں۔'' وہ سڑک پر نظریں جمائے اس کے سوالوں کا جواب دے رہے تھے۔

''میرے ابو کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟'' اس نے جی کڑا کے ان سے پوچھ لیا تھا۔

''تمہاری امی نے تمہیں ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟'' عارفین عباس نے اس بار بھی اسے دیکھے بغیر کہا تھا۔

''بس اتنا کہ ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔''

اس بار عارفین عباس نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔''ہاں ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔'' بے حد عجیب لہجے میں انھوں نے کہا تھا اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور پوچھتی، انھوں نے پوچھا تھا۔

''تم پڑھتی ہو؟''

''نہیں۔ گریجویشن کرنے کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا، اب ایک فیکٹری میں کام کرتی ہوں۔''

''کیا کام کرتی ہو؟''

''سپر وائزر ہوں۔'' گاڑی میں خاموشی چھا گئی تھی۔ اس کے فلیٹ تک پہنچنے تک یہ خاموشی قائم رہی۔ گاڑی سے اتر کر اس پرانی تنگ و تاریک عمارت کی سیڑھیاں طے کرتے وہ خاموشی سے اس کی پیروی کرتے ہوئے تیسری منزل پر پہنچ گئے تھے۔ سارہ نے اپنے بیگ سے چابی نکالی تھی اور دروازے پر لگا ہوا تالا کھول کر اندر داخل ہو گئی عارفین عباس بھی اندر چلے گئے تھے۔ سیلن زدہ ایک کمرے کا فلیٹ اپنے مکینوں کی مالی حالت چیخ چیخ کر بتا رہا تھا۔

''آپ بیٹھ جائیں۔'' سارہ نے ایک کرسی کھینچ کر ان کے سامنے رکھ دی تھی۔ عارفین خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئے۔

''کیا آپ مجھے اپنے پاس رکھ سکیں گے؟'' وہ سوال جو پورا راستہ وہ ان سے کرنا چاہ رہی تھی مگر کر نہیں پائی تھی، اس کی زبان پر آ گیا۔ عارفین عباس اس کی بات پر چونک اٹھے تھے۔

''یہ سوال کیوں کیا تم نے؟''

''میرا مطلب ہے، آپ کی فیملی کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟'' اس نے اپنی بات واضح کی تھی۔

''میری کوئی فیملی نہیں ہے۔ صرف ایک بیٹا ہے اور اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

وہ کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ کچھ دیر بیگز میں کپڑے اور چیزیں بھرنے میں مصروف رہی۔ سامان پیک کرنے کے بعد اس نے کمرے پر ایک نظر دوڑائی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ ہر چیز اٹھا کر ساتھ لے جاتی لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کمرے کی ہر چیز اس گھر میں کاٹھ کباڑ سے زیادہ اہمیت نہیں پا سکے گی۔ اس لیے اس نے صرف اپنے کپڑے اور امی کی کچھ چیزیں ساتھ لی تھیں۔ عارفین عباس اب کھڑکی میں کھڑے باہر جھانک رہے تھے۔

''کب سے رہ رہے ہو تم لوگ یہاں؟'' باہر دیکھتے ہوئے انھوں نے اس سے پوچھا تھا۔

''ہمیشہ سے۔'' انھوں نے اس کے جواب پر مڑ کر اندر دیکھا تھا۔ وہ بیگز اٹھانے لگے تو اس نے انھیں روکنے کی کوشش کی تھی۔

''آپ رہنے دیں۔ میں خود اٹھا لوں گی۔''

''تم نہیں اٹھا سکتیں؟'' انھوں نے بیگز اس کے ہاتھ سے لے لیے تھے۔

''میں آپ کو کیا کہہ کر پکاروں؟'' اس نے انھیں دروازے کی طرف جاتے ہوئے روکا تھا۔ عارفین عباس خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتے رہے۔

''جو کہنے میں آسانی ہو۔ کہہ سکتی ہو۔ چاہو تو...... پاپا کہہ سکتی ہو۔'' وہ ان کی بات پر گم صم ہو گئی۔ عارفین عباس کمرے سے چلے گئے تھے۔

⁂

''اور کتنی دیر یہاں بیٹھو گی؟'' گیٹ کی طرف جاتے جاتے ایک بار پھر اس نے اسے وہاں بیٹھے دیکھا تھا اور وہ اس کی طرف آ گیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔

''تم ان سیاہ کپڑوں میں ملبوس اس رات کا ایک حصہ لگ رہی ہو لیکن میں نہیں چاہتا کہ رات کی طرح تم بھی ختم ہو جاؤ۔ اس لیے اب اندر چلی آؤ، سردی بڑھ رہی ہے۔'' اس کے لہجے میں اس کے لیے وہی نرمی تھی جس کی وہ ہمیشہ سے عادی تھی۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس نے سوال کیا تھا۔

''کچھ کام ہے مجھے، کسی دوست کی طرف جانا ہے۔''

اس نے یونہی کھڑے کھڑے بتایا تھا۔ بات کرتے کرتے اسے لگا جیسے اس نے اس کی بات دھیان سے نہیں سنی۔ وہ پھر سر اٹھا کر پہلے کی طرح آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ کسی ملکوتی حسن کی مالک نہ تھی پھر بھی کوئی بہت عجیب، بہت خاص چیز تھی اس کے چہرے میں، مگر کہاں؟ یہ وہ بتا نہیں سکتا تھا۔ ''شاید آنکھوں میں یا شاید مسکراہٹ میں ہاں لیکن صبا کچھ ہے ضرور تم میں جس کی میں کبھی وضاحت نہیں کر سکتا۔'' عارفین نے ہمیشہ کی طرح اسے دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

''اندر جانے کا ابھی بھی کوئی ارادہ نہیں؟'' اس نے ایک بار پھر اس سے کہا تھا۔ جواب اس کی توقع کے برعکس آیا تھا۔

''عارفین! تم نے کبھی خدا کو دیکھا ہے؟'' اس کی نظریں ابھی بھی آسمان پر ہی تھیں۔ عارفین ایک گہری سانس لے کر اس سے کچھ فاصلے پر برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ گیا۔

''نہیں۔ کیا تم نے دیکھا ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے بھی نہیں دیکھا لیکن میرا دل چاہتا ہے دیکھنے کو۔''

اس کے لہجے میں بچوں جیسا اشتیاق تھا اور چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت، ستون سے سر ٹکائے وہ اب بھی آسمان کو ہی دیکھ رہی تھی۔

''خدا کو کیوں دیکھنا چاہتی ہو صبا؟'' عارفین باہر جانے کا ارادہ ترک کر چکا تھا۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا، وہ اس سے بات شروع کرتا پھر ہر کام بھول جاتا، دانستہ طور پر بعض دفعہ بھولنا بھی ایک نعمت لگتا ہے۔

''پتہ نہیں کیوں دیکھنا چاہتی ہوں لیکن بس دیکھنا چاہتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں عجیب سا اصرار تھا، عجیب سی بے چینی تھی۔

''صبا! یہ پوری دنیا اسی کی بنائی ہوئی ہے، اسے دیکھنے کی خواہش ہو تو ہر خوبصورت چیز دیکھو، وہ ہر خوبصورت چیز میں نظر آئے گا۔''

اس نے جیسے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی، وہ اب اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

''صرف خوبصورت چیزوں میں، بدصورت چیزوں میں کیوں نہیں؟ کیا وہ اس نے نہیں بنائیں، اسے پھول میں ڈھونڈنا چاہیے کیونکہ پھول خوبصورت ہے، وہ اس میں نظر آئے گا پتھر میں نظر نہیں آئے گا کیونکہ وہ خوبصورت نہیں مگر عارفین! لوگ کہتے ہیں خوبصورتی کسی چیز میں نہیں دیکھنے والی کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ مجھے پھول خوبصورت نہیں لگتا۔ پتھر حسین لگتا ہے تو میں کیا کروں۔'' عارفین کی سمجھ میں نہیں آیا، اسے کیا جواب دے، بہت سوچ کر اس نے کہا تھا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ پتھر بھی خوبصورت نظر آ سکتا ہے اور پتھر بھی اس کی بنائی ہوئی چیز ہے تو بس تم دنیا کو دیکھو اور جو چیز تمہیں خوبصورت نظر آئے تم اس میں خدا کو......''

مگر عارفین! میں خدا کو چیزوں میں ڈھونڈنا نہیں چاہتی نہ چیزوں میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں اس کو الگ سے دیکھنا چاہتی ہوں، ایک واحد، جیسا کہ وہ حقیقتاً ہے ہم اچھے کام کریں گے۔ نیکیاں کریں گے۔ اس کی عبادت کریں گے تو کیا ہوگا؟ اس کا اجر ملے گا، جنت مل جائے گی، ہر خواہش پوری ہو جائے لیکن وہ تو پھر بھی نظر نہیں آئے گا۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے۔''

عارفین نے کچھ بے بسی سے اسے دیکھا تھا۔ ''پتا نہیں صبا! مگر تم خدا کے بارے میں اتنا مت سوچا کرو پاگل ہو جاؤ گی۔'' اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''پھر کس کے بارے میں سوچوں؟'' وہ جیسے رہنمائی چاہتی تھی۔

''دنیا کے بارے میں سوچو، ان لوگوں کے بارے میں سوچو جو تمہارے اردگرد رہتے ہیں۔'' عارفین نے بڑی سنجیدگی سے اسے سمجھایا تھا۔

''جو چیز سمجھ میں آ گئی ہے، اس کے بارے میں کیا سوچوں، جو سمجھ میں نہیں آ رہی، اس کے بارے میں کیوں نہ سوچوں؟''

''صبا! بعض دفعہ تم بہت عجیب باتیں کرتی ہو، ہے نا؟'' اس نے عارفین کی بات پر سر جھکا لیا تھا۔

''پتا نہیں۔'' کچھ افسردگی سے اس نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے جواب دیا تھا۔

''تمہاری فرنچ کیسی جا رہی ہے؟'' عارفین نے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے پوچھا تھا۔

''پتا نہیں کیسی جا رہی ہے، بس کوشش کر رہی ہوں۔'' وہ بالآخر مسکرائی تھی۔

نہیں خیر، اب ایسا بھی مت کہو، بہت اچھی فرنچ بولنے لگی ہو۔'' عارفین نے اس کی ہمت افزائی کرنے کی کوشش کی تھی۔

''اگر واقعی کچھ بہتری ہوئی ہے تو یہ تمہاری وجہ سے ہے۔''

''نہیں خیر، اب ایسا بھی استاد نہیں ہوں میں۔ تمہیں صرف اس لیے یہ زبان سکھانا چاہتا ہوں تاکہ فرانس جا کر تمہیں اجنبیت محسوس نہ ہو ورنہ تم سارا دن خدا کو ڈھونڈتی رہا کرو گی۔'' عارفین نے اسے چھیڑا تھا۔

''لیکن میں فرنچ اس لیے سیکھ رہی ہوں تاکہ وہاں کی خواتین کے ساتھ تمہاری گفتگو کو سمجھ سکوں۔''

''خیر، میں ایسا بھی دل پھینک نہیں ہوں۔''

''تم نہیں ہو مگر وہاں کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔''

وہ اس بار اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ''میں کوشش کر رہا ہوں صبا! کہ اپنا فلیٹ بدل لوں، یہ فلیٹ بینک کے تو قریب ہے لیکن اتنی پرسکون جگہ نہیں ہے جتنی تم چاہ سکتی ہو، ایک اور فلیٹ دیکھا ہے میں نے بہت خوبصورت جگہ ہے، وہ مل جائے تو تمہیں زیادہ اچھا لگے گا، تمہیں اس کی تصویریں بھجواؤں گا۔ تم دیکھنا اور بتانا کیسا ہے۔''

''واپس کب جا رہے ہو؟''

''بس پندرہ بیس دن اور ہیں۔ سرمد کی شادی کے تین چار دن بعد کی فلائٹ ہے۔'' اس نے کار کی رنگ ہلاتے ہوئے اپنا پروگرام بتایا تھا۔

''اس دفعہ تم گھر میں بہت کم رہے ہو، بس کراچی اور اسلام آباد کے چکر ہی لگاتے رہے ہو۔''

''ہاں، اس دفعہ بینک کے بہت سے کام ہیں جو نمٹا رہا ہوں حالانکہ چھٹیاں گزارنے آیا ہوں، لیکن مجھے اس لیے ان کاموں پر کوئی اعتراض نہیں کہ ان کی وجہ سے مجھے سال کے اینڈ پر شادی کے لیے چھٹیاں مل جائیں گی، ابھی بھی دو تین دن تک پھر مجھے اسلام آباد جانا ہے اور وہاں سے واپسی شاید ایک ڈیڑھ ہفتے تک ہو۔ تم سناؤ تمہاری یونیورسٹی ٹھیک جا رہی ہے۔'' عارفین نے اپنا تفصیلی پروگرام بتا کر اس سے پوچھا تھا۔

''ہاں ٹھیک جا رہی ہے۔'' اس نے شال کو مزید لپیٹا تھا۔

''اب تو کسی کو اعتراض نہیں ہے؟'' عارفین نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

''جن کو اعتراض تھے ان کو اب بھی ہیں اور رہیں گے۔ اعتراض کرنے میں کوئی ٹیکس تو لگتا نہیں ہے کہ کسی کو فکر ہو، ہاں بس یہ ہے کہ اب بار بار کہتے نہیں ہیں مجھ سے نہ امی نہ تایا وغیرہ۔ ہاں پردے پر اب بھی اکثر لیکچر دیے جاتے ہیں۔''

وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے بتاتی جا رہی تھی۔

''ویسے کیا ہے صبا! اگر تم پردہ کر لو۔ خواہ مخواہ سب کو ناراض کیا ہے تم نے، پھر کچھ ماہ ہی کی تو بات ہے پھر فرانس آ کر تم جیسے چاہو رہنا۔ چاہو تو اسکرٹ پہننا، چاہو تو ٹراؤزرز مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

وہ اس کے لہجے میں چھپی شرارت بھانپ گئی تھی۔

''میں چادر سے اپنا آپ چھپاتی ہوں۔ میں دوسروں کی طرح بیہودہ لباس نہیں پہنتی ہوں نہ میک اپ کرتی ہوں۔ اگر لڑکوں کے ساتھ پڑھتی ہوں تو بھی انھیں ادائیں نہیں دکھاتی ہوں۔ ہاں روایتی برقع نہیں لیتی۔ کیا تم کو بھی اس بات پر اعتراض ہے؟'' وہ مسکراتے ہوئے اس کی بات سنتا رہا تھا۔

''نہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے نہ لڑکوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے پر، نہ چادر لینے پر۔ میں صرف تمہاری آسانی کے لیے کہہ رہا ہوں۔ بہت حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے اتنی بہت سی ناراضگی اور مخالفت برداشت کرنے کے لیے۔''

''ہاں اور مجھ میں بہت سا حوصلہ ہے۔ تمھیں تو شاید کہیں جانا تھا۔'' صبا کو بات کرتے کرتے اچانک یاد آیا۔

''ہاں جانا تو ہے، خیر پھر آپ کی گفتگو سے فیض یاب ہوں گے۔ اب اگر آپ کو برا نہ لگے تو اندر چلی جائیں۔''

عارفین گھڑی دیکھتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ صبا نے ایک بار پھر تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کو دیکھا تھا پھر وہ کھڑی ہو گئی۔

''خدا حافظ۔'' وہ یہ کہہ کر برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر دروازے کی طرف چلی گئی۔ عارفین وہیں کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

ان کی واپسی بڑی خاموشی سے ہوئی تھی۔ عارفین عباس خاموشی سے گاڑی چلاتے رہے اور وہ باہر کے منظر دیکھتی رہی۔ گھر آنے کے بعد انھوں نے اس کا سامان اتروا کر کسی ملازم کے ہاتھ کسی کمرے میں بھجوا دیا تھا۔

''تم اپنا کمرہ دیکھ لو، تب تک کھانا لگ چکا ہوگا۔''

اسے ان کی بات پر بھوک کا احساس ہوا۔ اس وقت سہ پہر کے چار بج رہے تھے اور وہ دو بجے یہاں آئی تھی۔ دوپہر کا کھانا اس نے کچھ اضطراب، کچھ بے چینی میں نہیں کھایا تھا لیکن اب کھانے کا نام سن کر یکدم اس کی بھوک جاگ اٹھی تھی۔ ملازم اسے کمرے میں لے آیا تھا۔ وہ کچھ ششدر، کچھ پریشان سی کمرے کو دیکھنے لگی تھی۔ ملازم اس کا سامان رکھ کر جا چکا تھا۔

''اگر یہ خواب ہے سارہ امین! تو دعا کرو یہ خواب بہت لمبا ہو اور اگر یہ حقیقت ہے تو دعا کرو کہ یہ حقیقت کبھی خواب نہ بنے۔''

اس نے کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے سوچا تھا۔ قدآدم کھڑکیوں میں سے باہر کا وسیع لان اپنی پوری خوبصورتی کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔

''کیا اس جگہ رہنا آسان ہوگا۔'' اس نے باہر سے نظر ہٹا کر کمرے میں موجود آسائشوں پر ایک تشویش بھری نظر ڈالی تھی۔ اسے وہ سیلن زدہ کمرہ یاد آیا جہاں اس نے اپنی زندگی کے پچھلے چوبیس سال گزارے تھے۔ اس کا دل چاہا۔ وہ بھاگ کر واپس چلی جائے۔ ''ایلس ان ونڈرلینڈ۔'' کسی نے زور سے اس کے کانوں میں کہا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگی کمرے کو دیکھتی رہی۔ بیڈ سے کارپٹ اور کارپٹ سے سامنے رکھے ہوئے ٹی وی اور فریج تک ہر چیز اس کے لیے بے حد عجیب تھی۔ وہ کتنی ہی دیر یونہی چپ چاپ کمرے کو دیکھتی رہی یک بہ یک اسے بے حد تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ باتھ روم کا دروازہ کھول کر باتھ روم میں چلی آئی۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے سامنے واش بیسن پر لگا ہوا آئینہ اس کا عکس دکھا رہا تھا۔ اس کی نظر بہت دیر تک آئینے پر مرکوز رہی۔ آئینہ پورے باتھ روم میں جو سب سے بے مایہ چیز دکھا رہا تھا وہ اس کا اپنا وجود تھا۔

''تو سارہ! احساس کمتری کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، سو اب تم کیا کرو گی؟'' ایک بار پھر کسی نے اس کے کانوں میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے بے دلی سے اپنے عکس پر سے نظریں ہٹائیں اور پانی بند کر دیا۔ تولیے سے چہرہ خشک کرنے کے بعد وہ کمرے میں آ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ملازم نے آ کر اسے کھانا لگنے کی اطلاع دی تھی، وہ اس کے ساتھ ہی ڈائننگ میں آ گئی۔ عارفین عباس موبائل پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر انھوں نے موبائل بند کر دیا۔

''آؤ سارہ!'' انھوں نے کہا تھا۔ ملازم نے ایک کرسی کھینچ دی تھی۔ وہ کچھ نروس سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے وہ کھانا یاد آیا جو وہ اپنے گھر اپنی امی کے ساتھ کھاتی تھی۔

''سارہ! کھانا شروع کرو۔'' عارفین عباس نے اس سے کہا تھا۔

''وہ ڈائننگ ٹیبل پر سب سے سادہ چیز ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی۔ عارفین عباس نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔ انھوں نے اپنی اور اس کی پلیٹ میں کچھ چاول نکالے تھے اور پھر آہستہ آہستہ وہ پلیٹ میں مختلف چیزیں رکھتے گئے تھے۔

اس نے جھجکتے ہوئے کھانا کھانا شروع کر دیا تھا۔

''یہ پورا گھر تمہارا ہے۔ تم جیسے چاہو یہاں رہو، جو چاہو کرو، ہو سکتا ہے سارا دن بے کار رہ کر تم بور ہو جاؤ۔ اس لیے چاہو تو اپنی سٹڈیز کا سلسلہ دوبارہ شروع کر سکتی ہو۔''

وہ اس سے بات کرتے ہوئے بھی اس کو نہیں دیکھ رہے تھے بس ہاتھ میں پکڑے ہوئے چمچ کو پلیٹ میں ڈالے ہوئے چاولوں میں پھیرتے رہے۔ اس نے نوٹ کیا تھا۔ وہ کھانا نہیں کھا رہے تھے۔ اس نے جب کھانا ختم کیا، وہ تب بھی ان ہی چاولوں کو پلیٹ میں ڈالے ہوئے تھے، ''شاید وہ صرف مجھے کمپنی دینے کے لیے کھانا کھانے بیٹھے تھے ورنہ انھیں بھوک نہیں تھی۔'' اس نے سوچا تھا۔

کھانے کے بعد ملازم نے لان میں چائے لگا دی تھی۔ وہ اسے ساتھ لے کر لان میں آ گئے۔ سارہ نے انھیں چائے بنا کر دی تھی اور ابھی اس نے اپنا کپ ہاتھ میں لیا تھا کہ کسی گاڑی کا ہارن بجا تھا اور چوکیدار گیٹ کھولنے لگا تھا۔

''حیدر آیا ہے۔'' عارفین عباس نے گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ سلور گرے کلر کی ایک سوک اندر آئی تھی اور اس میں سے اترنے والے شخص کو دیکھ کر وہ کافی حیران ہوئی تھی۔ اس بندے نے اپنا کوٹ اور بریف کیس دونوں ملازم کو پکڑا دیے تھے۔ اور پھر کار کا دروازہ بند کر کے سیدھا لان کی طرف آیا تھا۔ سارہ اب بھی حیرانی سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے نقوش اور رنگت سے کوئی غیر ملکی لگتا تھا اگرچہ وہ مردانہ وجاہت کا کوئی شاہکار نہیں تھا لیکن دراز قد اور غیر ملکی خدوخال نے اسے کافی مختلف بنا دیا تھا۔ آنے والے نے بھی سارہ کو قدرے حیرانی سے ہی دیکھا تھا۔

''السلام علیکم'' قریب آ کر حیدر نے کہا تھا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''سارہ! یہ میرا بیٹا ہے حیدر۔'' عارفین عباس نے اس کا تعارف کروایا تھا۔

''اور یہ سارہ ہے۔''

''ہیلو!'' حیدر نے بہت رسمی سے انداز میں کہا تھا اور پھر بہت شستہ فرنچ میں اس نے باپ سے پوچھا تھا۔ ''یہ کون ہیں؟''

عارفین عباس نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا تھا۔

''صبا کی بیٹی ہے۔'' کچھ توقف کے بعد حیدر نے ایک بار پھر سوال کیا تھا۔

''یہاں کیوں آئی ہیں؟''

''حیدر! میں تم سے اس سلسلے میں بعد میں بات کروں گا۔'' عارفین عباس نے سارہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا تھا جو کسی تاثر کے بغیر چائے پینے میں مصروف تھی۔ وہ جان نہیں سکے کہ وہ فرنچ جانتی ہے یا نہیں۔

''سارہ! تمھیں فرنچ آتی ہے؟''

اس بار انھوں نے اردو میں سارہ سے پوچھا تھا، اس نے نظر اٹھا کر انھیں دیکھا تھا۔

''نہیں۔'' عارفین عباس نے حسب توقع جواب پا کر کچھ سکون کا سانس لیا تھا۔ حیدر نے چند لمحات میں اس کا تفصیلی جائزہ لے لیا تھا۔

''حیدر کے لیے بھی چائے بنا دو'' عارفین عباس نے سارہ سے کہا تھا۔ وہ خاموشی سے ہاتھ میں پکڑا ہوا کپ رکھ کر اس کے لیے چائے

بنانے لگی۔

''اب تو ہم بات کر سکتے ہیں ناں۔آپ بتائیں، یہ یہاں کیوں آئی ہیں؟'' حیدر ایک بار پھر فرنچ میں اپنے باپ سے مصروف گفتگو ہو گیا تھا۔

''حیدر! اب یہ یہیں رہے گی۔''

''کیوں؟'' حیدر نے قدرے حیرانی سے پوچھا تھا۔''چائے لے لیں۔'' سارہ نے گفتگو میں مداخلت کی تھی۔اس نے ایک رسمی سے شکریہ کے ساتھ کپ پکڑ لیا وہ دوبارہ چائے پینے میں مصروف ہو گئی تھی۔

''صبا مر چکی ہے اور یہ اکیلی کیسے رہ سکتی ہے۔'' اس بار حیدر نے سارہ کو دیکھا۔

''ان کی ڈیتھ کب ہوئی؟'' ایک بار پھر اس نے باپ سے پوچھا تھا۔

''پانچ دن پہلے۔'' حیدر نے باپ کو گہری نظروں سے دیکھا تھا وہ اس سے نظر چرا گئے۔اس نے مزید کوئی سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

سارہ فرنچ میں ہونے والی ساری گفتگو سے بے نیاز چائے پیتی رہی۔ایسا نہیں تھا کہ وہ گفتگو اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔جتنی روانی سے وہ دونوں فرنچ بول رہے تھے وہ اتنی روانی سے فرنچ نہیں بول سکتی تھی لیکن بہر حال وہ فرنچ نہ صرف بول لیتی تھی بلکہ اسے اچھی طرح لکھ پڑھ بھی لیتی تھی۔بچپن میں اس نے ماں کو تنہائی میں بیٹھے یہی زبان بولتے دیکھا تھا۔اس نے جاننے کی کوشش کی تھی کہ وہ کون سی زبان بولتی ہیں تب وہ اس زبان کا نام نہیں جانتی تھی اور ہر دفعہ پوچھنے پر امی گم صم ہو جاتی تھیں مگر پھر بعض دفعہ وہ خود ہی خود کلامی میں مگن ہوتیں اور اس کا اشتیاق بڑھتا ہی جاتا پھر وہ جان گئی تھی کہ امی فرنچ بولتی ہیں اور اسے شاک لگا تھا۔

''یہ زبان امی کو کیسے آتی ہے اور اگر یہ زبان آتی ہے تو پھر اور کیا کیا آتا ہے؟''

ان سوالوں نے اس کے تجسس کو اور بڑھا دیا تھا اور ہر سوال کا جواب امی کی طرف سے ایک خاموشی کی صورت میں ملتا تھا۔پھر جب اس نے کالج میں داخلہ لیا تو کسی شعوری کوشش کے بغیر ہی اس نے آپشنل سبجیکٹس میں فرنچ لے لی تھی۔وہ امی کے اسرار کو جاننا چاہتی تھی۔وہ خود سے کیا بات کرتی ہیں؟ کیا کہتی ہیں؟ کیا سوچتی ہیں؟ بہت آہستہ آہستہ وہ اس قابل ہو گئی تھی کہ امی کی باتوں کو، ان کے جملوں کے مفہوم کو سمجھ سکے اور جب وہ ایسا کرنے کے قابل ہوئی تو وہ چکرا گئی تھی۔جب بات سمجھ میں نہیں آتی تھی تب لگتا تھا کہ زبان جاننے کے بعد وہ بات سمجھ جائے گی جب زبان جاننے لگی تھی تو اسے یوں لگنے لگا تھا جیسے وہ کبھی امی کی باتوں کو سمجھ نہیں پائے گی۔ان کی باتوں میں کہیں بھی ان کا ماضی نہیں جھلکتا تھا۔کہیں بھی کوئی نام نہیں آتا تھا سوائے ایک نام کے ''اللہ'' ان کی باتیں اسے ولی کی باتیں لگتی تھیں نہ درویش کی مگر وہ انسان کی باتیں بھی نہیں تھیں۔کیونکہ انسان کی باتوں میں شکوہ آتا تھا ان کی باتوں میں شکوہ نہیں ہوتا تھا۔

سارہ نے کبھی ان پر ظاہر نہیں کیا کہ وہ فرنچ جاننے لگی تھی۔وہ اپنی کتابیں ہمیشہ چھپا کر رکھتی۔اسے امی کی خود کلامی عزیز تھی۔''خود سے ہی سہی بات تو کرتی تھیں اور اگر جوان کو پتا چل گیا تو میں اس آواز سے بھی محروم ہو جاؤں گی۔'' وہ انہیں خود کلامی کرتے ہوئے دیکھتی اور سوچتی اور اب یہاں بھی یہی ہوا تھا۔حیدر نے فرنچ بولنا شروع کی تھی اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ان پر یہ ظاہر نہیں کرے گی کہ وہ یہ زبان جانتی تھی۔بڑی خاموشی

سے تینوں نے چائے ختم کی تھی پھر سب سے پہلے حیدر اٹھ کر اندر گیا تھا۔

''یہ آپ کا اپنا بیٹا ہے؟'' سارہ نے اس کے جانے کے بعد ان سے پوچھا تھا۔

''ہاں، یہ میرا ہی بیٹا ہے۔ میں نے ایک فرنچ عورت سے شادی کی تھی۔''

''وہ کہاں ہیں؟''

''تین سال پہلے اس کی ڈیتھ ہو گئی۔'' اس نے عارفین عباس کے چہرے کو ایک بار پھر دیکھا تھا۔

''میری امی نے فرنچ کہاں سے سیکھی تھی؟''

عارفین عباس نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ وہ بہت گہری نظروں سے انھیں دیکھ رہی تھی۔

''اسے شوق تھا۔'' وہ اس ادھورے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی۔

''میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ تم چاہو تو گھر کو دیکھ لو یا پھر آرام کرو۔''

وہ شاید اس کے اور کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس لیے اٹھ کر اندر آ گئے تھے۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ وہ اٹھ کر لان میں پھرنے لگی۔ عارفین عباس نے اپنے کمرے میں آ کر دروازہ کو لاک کر دیا تھا۔ یکدم بے تحاشا تھکن ان کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔ دراز میں سے چابیاں نکالنے کے بعد انھوں نے وارڈ روب کھولی تھی اور اس کے اندر کہیں سے کچھ البمز نکال کر بیڈ پر آ گئے تھے۔ البم کھولتے ہی وہ چہرہ ان کی نظروں کے سامنے آ گیا تھا۔ جس کی قبر پر کچھ دیر پہلے وہ سارہ کے ساتھ فاتحہ پڑھ کر آئے تھے۔

''تو بس دنیا میں تم صرف چھیالیس سال گزارنے آئی تھیں اور میں خوش ہوں صبا! میں آج بہت خوش ہوں کہ تمھیں زندگی کے عذاب سے نجات مل گئی، اب کم از کم تم سکون سے تو ہو گی۔'' وہ اس کی تصویر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے۔

صبا ان کی چچازاد تھی۔ وہ دو بہنوں اور ایک بھائی میں سب سے بڑی تھی اور عارفین اپنی تینوں بہنوں سے چھوٹے اور اکلوتے تھے۔ ایک ہی بڑے سے احاطے میں ان چاروں بھائیوں کے چار کونوں میں گھر تھے اور چاروں گھروں کے درمیان کا وسیع صحن مشترکہ تھا۔ گھروں کے بیرونی طرف چاروں جانب لان تھا۔ گھروں کی بیرونی دیوار اور گیٹ بھی مشترکہ تھا۔ عارفین کے ابو سب سے بڑے تھے اور صبا کے والد بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔

صبا کے ابو شروع سے امریکہ میں مقیم تھے اور وہ سال میں دو بار پاکستان آیا کرتے تھے۔ لیکن صبا کی فیملی نے کبھی باہر شفٹ ہونے کی کوشش نہیں کی کیونکہ نہ تو اس کے ابو ان لوگوں کو باہر لے جانا چاہتے تھے اور نہ ہی خود صبا کی امی باہر جانا چاہتی تھیں۔ وہ اتنی دور نہیں رہ سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شادی کے بعد وہ اسی گھر میں ایک الگ حصے میں منتقل ہو گئیں۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ یہ گھرانہ ایسا تھا جہاں لڑکیوں کو بس اتنی تعلیم دی

جاتی تھی جس سے انھیں لکھنا پڑھنا آ جاتا۔ صبا کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد وہ حیران ہوئی تھی جب بڑے تایا نے اسے گھر بیٹھنے کے لیے کہا۔ امی کی بھی یہی رائے تھی کہ اتنی تعلیم لڑکیوں کے لیے کافی ہوتی ہے۔

''نہیں۔ مجھے تو آگے پڑھنا ہے اور میں ابو سے بات کرلوں گی لیکن میں تعلیم نہیں چھوڑوں گی۔''

اس کے دوٹوک جواب پر اس کی امی سکتے میں آ گئی تھیں۔

''گھر میں کوئی اس بات کو پسند نہیں کرے گا اور خود تمھارے ابو بھی۔ پھر تمھیں پڑھ کر کرنا بھی کیا ہے۔'' اس کی امی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''پڑھنا لکھنا کوئی ایسی چیز نہیں جس پر کسی کو اعتراض ہونا چاہیے اور مجھے پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے۔ یہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد طے کروں گی۔ ابھی کیسے بتادوں۔''

اس نے بڑے سکون سے کہا اور پھر پتا نہیں اس نے اپنے باپ کو کیا لکھ کر بھیجا تھا کہ انھوں نے اسے کالج میں داخلہ لینے کی اجازت دی تھی۔

عارفین ان دنوں لندن اسکول آف اکنامکس میں اپنی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ وہ عمر میں صبا سے پانچ سال بڑا تھا۔ اپنی دوسری کزنز کی طرح اس نے صبا پر بھی کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔ صبا سے اس کی پہلی باقاعدہ ملاقات تب ہوئی تھی جب تعلیم سے فارغ ہو کر اس نے ایک بینک میں جاب کر لی تھی اور چھٹیوں میں پاکستان آیا تھا۔ گھر پہنچتے ہی وہ باری باری ہر چچا کے گھر گیا تھا۔ صبا ان دنوں ایف۔ اے میں داخلہ لینے کی کوششوں میں تھی۔ عارفین کے لیے چائے وہی لائی تھی اور چائے کا کپ دیتے ہی اس نے عارفین سے پوچھا تھا۔

''تعلیم کیسی چیز ہوتی ہے؟''

عارفین! سوال پر قدرے حیران ہوا تھا۔ ''بہت اچھی چیز ہوتی ہے۔''

''صرف لڑکوں کے لیے یا لڑکیوں کے لیے بھی؟'' سوال کا جواب ملتے ہی ایک اور سوال پوچھا گیا تھا۔

''صبا! کیا فضول سوال جواب شروع کر دیے ہیں۔'' صبا کی امی نے اسے ٹوکا تھا۔

''دونوں کے لیے ہی اچھی ہے۔'' عارفین نے چچی کی بات پر غور کیے بغیر اس کے سوال کا جواب دیا تھا۔

''پھر تایا تعلیم کے اتنے خلاف کیوں ہیں؟ اپنے بیٹے کو پڑھنے کے لیے لندن بھیج دیتے ہیں، دوسروں کو گھر سے باہر تک جانے نہیں دیتے۔''

''صبا! منہ بند کرلو۔ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ عارفین! تم اس کی بات پر دھیان مت دینا۔'' صبا کی امی نے کچھ گھبرا کر عارفین سے کہا تھا جو کافی دلچسپی سے صبا کو دیکھ رہا تھا۔

''کس کو گھر سے باہر جانے سے روک دیا؟''

''مجھے۔'' اس کے سوال کا فوراً جواب آیا تھا۔

''صبا بی بی! آپ تو پہلے ہی ایف۔ اے کر چکی ہیں۔ آگے اور کیا پڑھیں گی اور پھر پڑھ کر آپ کو کرنا بھی کیا ہے؟''

''آپ اتنا پڑھ کر کیا کریں گے؟'' لہجہ ابھی ابھی نرم تھا لیکن سوال نہیں۔

''بھئی۔ میں تو مرد ہوں۔ مجھے تو کمانا ہے تاکہ گھر چلا سکوں۔'' اس نے کچھ شگفتگی سے کہا تھا۔

''اتنی زیادہ تعلیم حاصل کرنے کا واحد مقصد کمانا تھا؟'' عارفین اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا تھا۔

''بہر حال، میں کمانے کے لیے تعلیم حاصل کرنا نہیں چاہتی۔ شعور حاصل کرنے کے لیے تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

''شعور حاصل کر کے کیا کریں گی؟'' عارفین نے بے اختیار پوچھا تھا۔

''دنیا کو سمجھوں گی۔ انسانوں کو جانچوں گی۔''

عارفین نے کچھ حیرانی سے اپنی اس کزن کا چہرہ دیکھا تھا۔

''آپ بی۔ اے میں داخلہ لینا چاہتی ہیں۔ ضرور لیں۔ میں ابو سے بات کر لوں گا۔ وہ اعتراض نہیں کریں گے۔''

عارفین نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی اور وہ اندر چلی گئی تھی۔

چچی ناراض ہونے لگی تھیں، انھیں سمجھانے میں عارفین کو کافی وقت لگ گیا تھا۔ پھر واقعی تایا نے پچھلی بار کی طرح اس بار مخالفت نہیں کی تھی لیکن یہ نہیں تھا کہ انھیں صبا کی تعلیم پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ان کے اعتراضات اور ناپسندیدگی اپنی جگہ پر تھی اور انھوں نے اب صبا سے بات کرنا ہی چھوڑ دی تھی۔ صبا کو خود بھی اس بات کی قطعاً پروا نہیں تھی۔

''امی! مجھے لوگوں سے تعریف پا کر کرنا بھی کیا ہے۔ مجھے کوئی پسند کرے تو اس کا مجھے کیا فائدہ ہے؟ ناپسند کرے تو اس کا مجھے کیا نقصان ہے؟ ہاں بس میں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ کوئی میری تعلیم میں مداخلت نہ کرے۔''

اس کی منطق، اس کی فلاسفی اس کی امی کی سمجھ سے باہر تھی۔ انھیں تو ہر وقت یہ ہی دکھ لگا رہتا تھا کہ ابھی تک صبا کے لیے خاندان میں سے کسی نے پیغام نہیں دیا اور صبا کی حرکتوں کو دیکھ کر انھیں یہ ممکن لگتا بھی نہیں تھا۔

مگر اس وقت عارفین کے ماں باپ پر بجلی گر پڑی تھی جب عارفین نے صبا کے لیے پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ پورے خاندان کی نظریں جس پر لگی ہوئی تھیں اسے پسند آئی بھی تو بقول تائی امی ایک ''رسوائے زمانہ'' لڑکی۔ تائی امی کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ صبا کو گولی مار دیں۔ یہی حال تایا کا تھا۔ صبا انھیں ہی سب سے زیادہ ناپسند تھی اور اب اسے بہو بنانا انھیں قیامت سے بھی زیادہ دشوار لگ رہا تھا۔ عارفین کو سمجھانے میں وہ ناکام رہے تھے۔ وہ کبھی ضد نہیں کرتا تھا مگر اس بار وہ اپنی بات پر اڑ گیا تھا۔ اسے صبا کی کسی بات میں کوئی خامی نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ وہ اس کی تعلیم کو اس کی خوبی قرار دے رہا تھا۔ تایا اس پر زیادہ سختی نہیں کر سکتے تھے۔ آخر وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ بھی لائق فائق۔ وہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے دل پر جبر کرتے ہوئے صبا کا رشتہ مانگ لیا تھا۔

''امی! عارفین سے پوچھیں۔ آگے پڑھنے دیں گے؟ اگر اقرار کریں تو پھر مجھے اس رشتہ پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

صبا نے اس رشتہ پر اپنے ردعمل کا اظہار ایک جملہ میں کیا تھا۔ صبا کی امی سر پیٹ کر رہ گئی تھیں۔ انھیں یقین ہو چکا تھا کہ صبا کا دماغ خراب ہو چکا ہے ورنہ وہ اتنے اچھے رشتے پر خدا کا شکر ادا کرنے کے بجائے شرطیں نہ رکھتی۔ انھوں نے عارفین تک اس کا جواب پہنچا دیا تھا اور عارفین کو واقعی اس کی تعلیم پر کوئی اعتراض نہیں تھا نہ ہی وہ اسے مزید تعلیم حاصل کرنے سے روکنا چاہتا تھا۔

بڑی سادگی سے نسبت طے کرنے کے بجائے دونوں کا نکاح کر دیا گیا تھا۔ رخصتی دو سال بعد ٹھہرائی گئی تھی۔

صبا نے ایک بار پھر سب کو ناراض کرتے ہوئے ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا تھا، اس بار اعتراضات اس لیے بھی زیادہ ہوئے تھے کیونکہ اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا اور خاندان بھر کو یہ سوچ کر ہی طیش آ رہا تھا کہ ان کے خاندان کی لڑکی اب لڑکوں کے ساتھ پڑھے گی۔ تایا جب اسے یونیورسٹی میں داخلہ لینے سے نہیں روک سکے تو انھوں نے شرط عائد کر دی تھی کہ وہ برقع اوڑھ کر یونیورسٹی جایا کرے کیونکہ وہ ان کے خاندان کی بہو ہے اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ وہ اس طرح بے حیاؤں کی طرح منہ کھولے لڑکوں کے ساتھ پڑھتی رہے۔ مگر ہر بات کی طرح اس بار بھی صبا کی منطق نرالی تھی۔ ''میں تعلیم حاصل کرنے جا رہی ہوں اور مجھے اپنی عزت کا پاس ہے اور میں یونیورسٹی بے پردہ نہیں جا رہی ہوں۔ چادر لے کر جاؤں گی۔ میرا سر اور جسم اس چادر میں چھپا رہے گا مگر میں روایتی برقع نہیں پہنوں گی اور اگر پہنوں گی بھی تو گھر سے پہن کر جاؤں گی اور دوسری لڑکیوں کی طرح یونیورسٹی جا کر اتار دوں گی۔ ایسے برقع کا ہمارے خاندان کو کیا فائدہ ہوگا۔''

تایا اور تائی اس کی ضد پر تلملا کر رہ گئے تھے۔ انھوں نے عارفین کو خط لکھ لکھ کر اس کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی تھی مگر ایسے لگتا تھا جیسے فرانس جا کر عارفین بھی اس کا ہم نوا ہو گیا تھا، وہ ان کے پانچ خطوں کے جواب میں ایک خط لکھتا اور وہ بھی اس بات کے ساتھ کہ صبا اگر برقع نہیں پہننا چاہتی تو نہ پہنے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یہی بات وہ صبا کو بھی خط میں لکھتا تھا۔

دونوں کے درمیان مسلسل خط و کتابت ہوتی رہی تھی مگر یہ خطوط کوئی روایتی قسم کے خطوط نہیں تھے۔ ان میں اقرار محبت اور اظہار محبت کے علاوہ سب کچھ ہوتا تھا اور شاید ان دو چیزوں کی دونوں کو کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ صبا کا خط عارفین کو کتاب کی طرح لگتا تھا۔ ہر لفظ کوئی نیا مفہوم، کوئی نیا معنی لیے ہوتا تھا وہ پڑھتا۔ کچھ جملوں پر حیران ہوتا کچھ پر سکتے میں آ تا۔ کچھ پر اس کی سانس رک جاتی۔ خط دوبارہ پڑھتا تو کوئی دوسرا جملہ کسی دوسری دنیا کا دروازہ اس پر کھول دیتا۔ بعض دفعہ اس کا دل چاہتا، وہ صبا سے کہہ دے۔ ''چیزوں کے بارے میں ایسے مت سوچو ورنہ زندگی گزارنا بہت مشکل ہو جائے گی۔'' ہر دفعہ وہ صرف سوچ کر رہ جاتا۔ اسے کبھی لکھ نہیں پاتا، اس میں اتنی جرأت ہی نہیں تھی۔ بعض دفعہ اس کا دل چاہتا۔ وہ اس سے کہے کہ ہر چیز کے بارے میں سوچتی ہو، مجھے لکھ دیتی ہو۔ میرے بارے میں کیا سوچتی ہو، یہ کیوں نہیں لکھتیں؟

ایک بار اس نے ہمت کر کے یہ سوال اسے لکھ ہی دیا تھا۔ اسے اس کا جواب ابھی تک یاد تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

''جس چیز سے بے حد محبت ہو، اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہیے۔ سوچ شبہات کو پیدا کرتی ہے اور شبہ محبت کو ختم کر دیتا ہے۔ تم چاہتے ہو، تم سے میری محبت ختم ہو جائے؟''

وہ دوبارہ اس سے اپنے بارے میں کچھ جاننے کی فرمائش نہیں کر سکا تھا۔

''سارہ! میں پرسوں صبا کے لیے قرآن خوانی کروا رہا ہوں۔ سب خاندان والے آئیں گے اور بھی کافی لوگ ہوں گے۔ میں نے ملازمین سے کہہ دیا ہے وہ سارے انتظامات دیکھ لیں گے مگر پھر بھی تم خود ان کی نگرانی کرنا۔''

صبح ناشتہ پر عارفین عباس نے اس سے کہا تھا۔ حیدر نے باپ کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ شاید وہ رات کو سوئے نہیں تھے۔ وہ ان سے کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے ایک نظر سارہ پر ڈالی۔ وہ چائے کے کپ کے گرد ہاتھ جمائے کسی سوچ میں گم تھی۔ چند لمحوں تک اس نے سارہ کے چہرے پر نظر جمائے رکھی۔ نامحسوس طور پر اسے احساس ہوا تھا کہ اس کے چہرے کے نقوش بہت دلکش تھے۔ خاص طور پر دراز پلکوں والی آنکھیں۔ ''اس کی امی بھی اسی کی طرح ہوں گی ورنہ پاپا جیسے شخص کو محبت جیسا روگ کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر کیا صرف اچھی شکل کی وجہ سے پاپا ان کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ کیا ممی سے زیادہ خوبصورت تھیں وہ؟'' وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے مسلسل سوچ رہا تھا۔ یکدم اس نے سارہ کو چونکتے ہوئے دیکھا تھا۔ یقیناً اسے لاشعوری طور پر احساس ہو گیا تھا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔

حیدر نے بڑے سکون سے اپنی نظر ناشتے کی پلیٹ پر مرکوز کر لی۔ سارہ نے عارفین عباس کو دیکھا۔ وہ بریڈ پر جیم لگا رہے تھے پھر اس نے حیدر کو دیکھا۔ وہ بڑے انہماک سے اپنی پلیٹ پر جھکا چھری سے انڈے کو کاٹنے اور کانٹے سے اسے کھانے میں مصروف تھا۔ وہ ایک بار پھر سوچوں میں گم ہو گئی۔

''عارفین عباس کو تو امی سے کوئی شکایت نہیں ہے مگر باقی خاندان والوں کا ردعمل کیا ہوگا؟''

یہ سوال تھا جو بار بار اسے تنگ کر رہا تھا۔ درحقیقت وہ یہ سن کر خوفزدہ ہو گئی تھی کہ اسے امی کے خاندان والوں کا سامنا کرنا ہوگا۔

اس دن وہ کافی بے چین رہی۔ دوپہر کو عارفین گھر نہیں آئے تھے نہ ہی حیدر آیا تھا۔ عارفین نے اسے فون کر کے لنچ کرنے کے لیے کہہ دیا۔ اسے عجیب سی آزادی کا احساس ہوا تھا۔ اس نے بھی دوپہر کا کھانا نہیں کھایا بلکہ وہ لان میں آ کر بیٹھ گئی۔

''میرے ابو میں ایسی کون سی خاص بات تھی جو امی نے عارفین عباس جیسے شخص کو چھوڑ دیا۔ وہ یہاں اچھی زندگی گزار سکتی تھیں۔ اس زندگی سے بہت بہتر جو انھوں نے وہاں گزاری۔''

اسے بار بار وہ سیلن زدہ ایک کمرے کا فلیٹ یاد آ رہا تھا۔ جو برسات میں بہت سی جگہوں سے ٹپکتا اور وہ بہت دل گرفتگی سے پانی کے ان قطروں کو دیکھتی رہتی جو آہستہ آہستہ پورے کمرے کو گیلا کر دیتے۔

''اگلی دفعہ برسات سے پہلے کچھ روپے جمع کر کے اس کی مرمت کروا لیں گے۔''

ہر برسات میں وہ اپنی امی سے یہی کہتی مگر کبھی بھی اتنے پیسے جمع نہیں ہو پائے جس سے وہ اس چھت کی مرمت کروا پاتے۔ صرف سارہ تھی جو اس فلیٹ اور وہاں موجود چیزوں کی حالت کے بارے میں فکر مند رہتی تھی ورنہ اس نے اپنی امی کو کبھی ان چیزوں کے بارے میں پریشان نہیں دیکھا تھا۔ ہاں شاید وہ اگر کسی چیز کی پروا کرتی تھیں تو وہ سارہ کا وجود تھا۔ اسے یاد تھا۔ وہ بچپن میں اسے خود اسکول چھوڑنے جاتیں اور پھر اسکول سے لے کر آتیں۔ انھوں نے کبھی بھی اسے دوسرے بچوں کے ساتھ کہیں آنے جانے نہیں دیا تھا۔ سارہ کو اسکول سے لے کر وہ سیدھا اپنی فیکٹری چلی

جاتی تھیں۔ جہاں وہ ریڈی میڈ کپڑوں کی پیکنگ کیا کرتی تھیں اور سارہ وہیں ایک کونے میں بیٹھ کر اسکول کا ہوم ورک کرتی اور بعض دفعہ تھک جانے پر وہیں ایک طرف سو جاتی۔

اس نے اپنی امی کو فیکٹری میں بھی کبھی کسی کے ساتھ ضرورت سے زیادہ بات چیت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کا پورا دھیان صرف اپنے کام پر ہوتا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ سارہ نے کبھی اپنی ماں کو کسی کی جھاڑ کھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ ایک مشین کی طرح کپڑوں کو لفافوں میں اور بعد میں ڈبوں میں بند کرتی تھیں اور سارہ کو یہ سب ایک دلچسپ کھیل کی طرح لگتا تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بڑی ہوتی گئی تھی اور اس کھیل سے اسے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ ابھی بھی وہ اسکول سے ماں کے ساتھ ہی فیکٹری چلی جاتی تھی اور میٹرک تک اس کی یہی روٹین رہی۔

میٹرک کے بعد اس نے اپنی امی سے کہا تھا کہ وہ پڑھنے کے بجائے کوئی کام کرنا چاہتی ہے مگر امی نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا مگر وہ زیادہ خوش نہیں تھی۔ امی کی صحت آہستہ آہستہ خراب ہو رہی تھی اور ہر گزرتا دن اسے خوفزدہ کر دیتا تھا وہ فورتھ ایئر میں تھی جب اس کی امی بہت بیمار ہو گئی تھیں۔ وہ کام پر نہیں جا پاتی تھیں۔

چند ماہ تک جوں توں کر کے جمع پونجی سے گھر چلایا گیا پھر بی۔ اے کے پیپرز دینے کے بعد سارہ نے اسی فیکٹری میں سپروائزر کے طور پر کام شروع کر دیا تھا جہاں اس کی امی کام کرتی تھیں۔

فیکٹری اس کے گھر کے قریب تھی اور وہاں جاب حاصل کرنے کے لیے اسے کسی گارنٹی کی ضرورت نہیں پڑی۔ کچھ عرصہ کے بعد امی کی حالت ٹھیک ہو گئی تھی اور انھوں نے دوبارہ فیکٹری جانا شروع کر دیا تھا۔ سارہ نے ان کے اصرار پر جاب چھوڑ دی تھی اور ایک بار پھر سے پرائیویٹ طور پر اکنامکس میں ایم۔ اے کی تیاری شروع کی تھی مگر آٹھ نو ماہ بعد پھر امی پہلے کی طرح بیمار پڑ گئیں اور اس بار وہ کافی عرصہ تک بیمار رہیں۔ سارہ نے ایک بار پھر اسی فیکٹری میں جاب کر لی تھی اور پھر امی کے ٹھیک ہونے اور ان کے اصرار کے باوجود اس نے جاب نہیں چھوڑی۔ فیکٹری سے اسے اتنے روپے مل جاتے تھے جس سے فلیٹ کا کرایہ اور باقی اخراجات پورے ہو جاتے تھے اور سارہ کے لیے یہ کافی تھا۔

کسی دوسری جگہ پر اس نے جب بھی جاب حاصل کرنے کی کوشش کی۔ گارنٹی کا مسئلہ اس کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ بن کر سامنے آتا اور اب اسے جاب کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک طویل سانس لے کر سر کرسی سے ٹکا دیا۔

❁

حیدر کل کی طرح آج بھی چار بجے آیا تھا اور لان کی طرف آنے کی بجائے اندر چلا گیا تھا۔ پندرہ منٹ کے بعد سارہ نے ایک بار پھر اس کو ٹریک سوٹ میں ملبوس باہر آتے دیکھا تھا۔ وہ دوبارہ گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا تھا اور پھر اس کی واپسی رات کو ہوئی تھی۔

عارفین عباس بھی رات کو ہی آئے تھے۔ کھانے کی میز پر حیدر اور عارفین کے درمیان فرنچ میں گفتگو ہوتی رہی۔ وہ دونوں اپنی جاب کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔ سارہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ کھانے کے دوران ایک بار پھر سارہ کو کسی کی نظروں کی تپش کا احساس ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر عارفین اور حیدر کو دیکھا۔ دونوں اب بھی پہلے ہی کی طرح مصروف گفتگو تھے۔ وہ ایک بار پھر کھانا کھانے میں مصروف ہو گئی۔ کھانے کی

میز سے سب سے پہلے حیدر گیا تھا۔

''کتابیں پڑھنے کا شوق ہے تمہیں؟'' عارفین عباس نے اس کے جانے کے بعد اس سے پوچھا تھا۔

''شوق کا مجھے پتا نہیں۔ ہاں اگر کبھی کوئی کتاب ملتی ہے تو اسے پڑھ ضرور لیتی ہوں۔'' عارفین عباس کی نظر لحہ بھر کو اس کے چہرے پر ٹک گئی تھی۔ اس وقت وہ انہیں بالکل صبا کی طرح لگی تھی۔

''اسٹڈی روم دیکھا ہے تم نے؟''

''نہیں۔''

''دیکھنا۔ وہاں کافی کتابیں ہیں۔ انہیں پڑھنے سے تمہارا وقت اچھا گزر جائے گا۔''

وہ نیپکن سے منہ پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

❁

دوسرے دن ایک ملازم سے پوچھ کر وہ اسٹڈی میں آئی تھی۔ اسٹڈی میں واقعی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ اس میں پنجابی، اردو، انگلش اور فرنچ چاروں زبانوں میں کتابیں موجود تھیں۔ وہ کچھ دیر تک مختلف کتابیں نکال نکال کر دیکھتی رہی۔ پھر ایک کتاب نکال کر بیٹھ گئی۔

دوپہر تک وہ وہیں اسٹڈی میں رہی۔ پھر اس نے ڈائننگ روم میں آ کر لنچ کیا۔ عارفین اسے بتا چکے تھے کہ وہ لنچ آفس میں ہی کرتے ہیں اور حیدر بھی لنچ کرنے گھر نہیں آتا تھا۔ لنچ کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر اسٹڈی میں آ گئی تھی۔ اس بار وہ اپنے کمرے سے اپنی ڈائری اٹھا لائی تھی اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھ کر اس نے وہ قلم اٹھا لیا جس نے اسٹڈی میں آتے ہی اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی تھی۔ وہ سیاہ رنگ کا ایک فاؤنٹین پین تھا جس کی نب کے اطراف میں چھوٹے چھوٹے سٹونز لگے ہوئے تھے۔ سونے سے بنی ہوئی نب بھی اسے بہت پُرکشش لگ رہی تھی۔

قلم ہاتھ میں لے کر اس نے ایک شاعری کی کتاب سے کچھ اشعار اپنی ڈائری میں اتارنے شروع کر دیے۔ قلم اتنی خوبصورتی، نفاست اور روانی سے لکھ رہا تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بہت دیر تک اس سے لکھتی رہی تھی۔ اس کی توجہ تب ہٹی تھی جب کوئی ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر آیا تھا سارہ نے بے اختیار مڑ کر دیکھا تھا۔ آنے والا حیدر تھا۔

وہ خود بھی خلاف توقع اسے یہاں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ چند لمحے وہ یونہی دروازے کا ہینڈل پکڑے کھڑا رہا پھر وہ دروازہ بند کر کے تیزی سے اس کی طرف آیا تھا۔ اس کے بالکل قریب آ کر وہ جھکا تھا اور باری باری اس نے اسٹڈی ٹیبل کے دراز کھولنے شروع کر دیے تھے۔ سارہ کا سانس حلق میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ بالکل بے حس و حرکت تھی۔ حیدر نے ایک دراز میں سے کچھ پیپرز نکالے تھے پھر اس نے اسٹڈی ٹیبل کے ایک کونے میں رکھی ہوئی کچھ کتابیں اٹھا لی تھیں۔

"Please pen" (پلیز میرا قلم دے دیں) اس نے سیدھا ہونے کے بعد سارہ کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے قلم کی طرف اشارہ کیا تھا اور ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا۔

سارہ نے بے اختیار پین کی طرف دیکھا تھا اور پھر اسے حیدر کے ہاتھ میں پکڑانے کے بجائے ٹیبل پر پڑی ہوئی اس ڈبیا میں رکھ دیا جس میں سے اس نے اسے نکالا تھا۔ حیدر نے اس کی اس حرکت پر کچھ عجیب سے تاثرات سے اسے دیکھا تھا اور پھر ٹیبل پر پڑی ہوئی وہ ڈبیا اٹھا کر اسٹڈی سے باہر چلا گیا۔ سارہ کی جان میں جان آ گئی تھی۔

''اور اگر یہ کوئی بدتمیزی کرتا تو میں کیا کرتی؟'' وہ بے حد فکر مند تھی۔

پچھلے تین دن سے حیدر کے رویے نے اسے پریشان نہیں کیا تھا۔ وہ سارا دن گھر سے باہر ہوتا تھا اور رات کو کھانے کے بعد اوپر چلا جاتا۔ جتنی دیر وہ اس کے سامنے ہوتا وہ اس کو نظر انداز کیے رکھتا تھا اور سارہ کو یہ بات پسند تھی لیکن اس وقت وہ پریشان ہو رہی تھی۔

''کیا امی کو پتا تھا کہ وہ جہاں مجھے بھیج رہی ہیں۔ وہاں عارفین عباس کا بیٹا بھی ہوگا اور وہاں کوئی دوسری عورت نہیں ہوگی اور گھر کا ملازم مجھے اس کے ساتھ اکیلا دیکھ کر کچھ بھی سمجھ سکتا ہے۔ میں دوبارہ کبھی بھی اسٹڈی میں نہیں بیٹھوں گی۔'' اس نے یکدم خود ہی فیصلہ کر لیا تھا۔

❁

''صبا! بعض دفعہ تم مجھے بہت Embarras (شرمندہ) کر دیتی ہو۔'' اس روز عارفین کا موڈ خاصا خراب تھا۔

''تم آج پھر یونیورسٹی آ گئے ہو؟'' صبا نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''تمھیں اچھا نہیں لگا؟''

''میں نے ایسا کب کہا۔''

''امی نے کل مجھ سے پوچھا تھا کہ میں یونیورسٹی تم سے ملنے گیا ہوں میں نے کہہ دیا نہیں۔ انھوں نے میری بات کی تصدیق کے لیے تم سے پوچھا اور تم نے صاف کہہ دیا کہ ہاں میں یونیورسٹی آیا تھا۔''

''عارفین! اس میں چھپانے والی کون سی بات تھی؟'' صبا کے لہجے میں اطمینان برقرار تھا۔

''بات سچ جھوٹ کی نہیں ہے۔ تمھیں پتا ہے۔ امی کو میرا تم سے ملنا پسند نہیں ہے۔ انھیں یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ میں تمھارے گھر آنا جانا رکھوں کیونکہ یہ خاندانی روایات کے خلاف ہے۔ میں صرف ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے تمھارے گھر نہیں آتا۔ یونیورسٹی آ جاتا ہوں لیکن تم نے اس بات کی بالکل پروا نہیں کی کہ امی کو کتنا برا لگے گا اور وہ مجھ سے کتنی ناراض ہوں گی۔''

''عارفین! میں تم سے چوری چھپے نہیں ملتی ہوں۔ سب کے سامنے ملتی ہوں اور بھی اس لیے کیونکہ تم میرے شوہر ہو اگر منگیتر ہوتے تو میں کبھی نہ ملتی نہ یونیورسٹی میں نہ گھر پر۔ جو چیز غلط ہے ہی نہیں میں اسے غلط طریقے سے کیوں کروں۔ اگر اپنی امی کو سچ بتا دیتی ہوں تو تمھاری امی سے غلط بیانی کیوں کروں پھر بھی اگر میری وجہ سے تمھیں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔''

''خیر، میں نے ایکسکیوز کرنے کو تو نہیں کہا بہر حال میں تمھیں یہ بتانے آیا تھا کہ میں کل اسلام آباد جا رہا ہوں۔'' عارفین نے موضوع بدل دیا تھا۔

''کتنے دنوں کے لیے جا رہے ہو؟''

''ابھی تو ایک ہفتہ کے لیے جا رہا ہوں لیکن ہو سکتا ہے چند دن اور لگ جائیں۔تم یہ بتاؤ تمھارے لیے کیا لاؤں؟'' عارفین نے اس سے پوچھا تھا۔

''عارفین! تم جانتے ہو، میں چیزوں کی فرمائش نہیں کیا کرتی۔'' صبا نے بڑی رسانیت سے جواب دیا تھا۔

''پھر بھی یار! کچھ تو فرمائش کیا کرو۔ مجھے اچھا لگے گا۔'' ''پہلے بھی اپنی مرضی سے گفٹ لاتے ہو، اب بھی جو دل چاہے لے آنا۔''

صبا! میرا دل چاہتا ہے، کبھی تم مجھ سے کوئی فرمائش کرو۔ پھر دیکھو، میں اسے کیسے پورا کرتا ہوں۔''

وہ اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔''چلو کبھی مانگوں گی تم سے کچھ۔ دیکھوں گی میری فرمائش پوری کرتے ہو یا نہیں۔''

"Any Time" عارفین نے خوش دلی سے سر ہلایا تھا۔

''ایک بات کہوں عارفین؟'' صبا یکدم سنجیدہ ہو گئی تھی۔

''ہاں ضرور۔ اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے؟''

''یہ جو انسان ہوتا ہے بعض دفعہ یہ بنا مانگے تو کچھ بھی دے دیتا ہے لیکن مانگنے پر کچھ بھی نہیں دیتا۔''

''تمہارا اشارہ میری طرف ہے؟'' وہ کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتا رہا تھا۔

''مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تمھیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔''

''عارفین! کیا انسان اعتبار کے قابل ہے؟''

''صبا! میں اپنی بات کر رہا ہوں۔''

وہ اس کی بات پر کچھ جھنجلا گیا تھا۔

''عارفین! یہ ضروری نہیں ہے جس سے محبت کی جائے، اس پر اعتبار بھی کیا جائے جیسے یہ ضروری نہیں کہ جس پر اعتبار کیا جائے اس سے محبت بھی کی جائے۔''

وہ اس کی بات کے جواب میں خاموش بیٹھا رہا۔

''ناراض ہو گئے ہو؟'' صبا نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا تھا۔

''نہیں۔ ناراض کس بات پر ہونا ہے۔ تم نے کوئی اتنی قابل اعتراض بات تو نہیں کہی۔''

''پھر بھی تمھیں برا لگا ہے نا؟'' صبا اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش میں تھی۔

''ہاں۔ برا لگا ہے لیکن بہت زیادہ نہیں۔ خیر تم پریشان مت ہو۔ میرا خیال ہے، اب مجھے چلنا چاہیے۔'' عارفین نے گھڑی دیکھی تھی۔

''لیکن جانے سے پہلے ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ مجھے تمہاری بہت پروا ہے، کل بھی تھی اور ہمیشہ رہے گی۔''

وہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے جاتے دیکھتی رہی۔

وہ اس دن صبح سے ہی پریشان تھی۔ ''اگر امی اپنی مرضی سے شادی نہ کرتیں تو آج میں امی کے رشتہ داروں کا سامنا کرنے سے اس قدر پریشان نہ ہوتی۔''

وہ بار بار بے دلی سے سوچ رہی تھی۔ قرآن خوانی سہ پہر کے وقت تھی اور چونکہ چھٹی کا دن تھا۔ اس لیے حیدر بھی گھر ہی تھا۔ مردوں کے بیٹھنے کا انتظام لان میں ٹینٹ لگا کر کیا گیا تھا۔ سارہ کو ملازموں کو کوئی ہدایت نہیں دینی پڑ رہی تھی۔ وہ کسی مشین کی طرح خود ہی ہر کام نبٹا رہے تھے۔ لوگوں کے آنے کا سلسلہ آہستہ آہستہ شروع ہو گیا تھا۔ عارفین آنے والوں کا اس سے تعارف کروا رہے تھے۔ ہر ایک رسمی سے کلمات دہراتا اور ہال میں بیٹھ جاتا۔

''سارہ! یہ میری سب سے بڑی بہن ہیں۔''

عارفین ایک عورت کے ساتھ اس کے پاس آئے تھے۔ وہ عورت یکدم سارہ سے لپٹ گئی اور اس نے بلند آواز میں رونا شروع کر دیا۔

''صبا نے ضد پوری کر لی۔ کتنا سمجھایا تھا۔ کتنا کہا تھا اسے مگر اس نے بات نہیں مانی، واپس نہیں آئی۔ ارے غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے پھر وہ تو......''

''آپا! پچھلی باتوں کو چھوڑیں۔ ماضی کو رہنے دیں۔''

''کیسے رہنے دوں عارفین! کیسے رہنے دوں۔ مجھے صبر نہیں آتا۔ مجھے سکون نہیں ملتا۔ کوئی ایسے کرتا ہے جیسے صبا نے کیا۔ یہ کوئی اس کے مرنے کی عمر تھی۔ مگر اس پر تو ایک ہی ضد......''

''آپا پچھلی باتیں نہ دہرائیں۔ بس کریں جو ہو گیا۔ اسے بھول جائیں۔ اس کے لیے دعا کریں۔''

عارفین نے زبردستی انھیں سارہ سے الگ کیا تھا۔ عارفین انھیں لے کر ہال سے باہر چلے گئے۔ وہ بوجھل دل سے وہیں دوسری عورتوں کے پاس بیٹھ گئی۔

''اور اب وہ آپا کو سمجھائیں گے کہ وہ میرے سامنے میری ماں کے ماضی کے بارے میں کوئی بات نہ کریں کیونکہ اس سے مجھے تکلیف ہو گی۔ کاش یہ بات ایک بار امی نے بھی سوچ لی ہوتی کہ اس طرح کے رشتے اولاد کے لیے کتنا بڑا عذاب بن جاتے ہیں۔''

آیت کریمہ کا ورد کرتے ہوئے وہ سر جھکائے بھیگی پلکوں کے ساتھ مسلسل امی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد عارفین کی دوسری دونوں بہنیں بھی آ گئی تھیں مگر بڑی بہن کی نسبت وہ سارہ سے بہت محتاط اور نارمل انداز میں ملی تھیں۔ ان کے آنے کے چند منٹ بعد عارفین کی بڑی بہن دوبارہ ہال میں آ گئی تھیں۔ وہ اب بھی نڈھال نظر آ رہی تھیں۔ مگر پہلے کی طرح رو نہیں رہی تھیں۔ وہ آ کر سارہ کے پاس بیٹھ گئی تھیں۔

آیت کریمہ کا ورد کرنے اور قرآن خوانی کے بعد دعا کروانے والی عورت نے دعا کرنی شروع کردی تھی۔ وہ مختلف آیات کو ترجمے کے ساتھ پڑھتی جارہی تھی۔

''اس روز لوگ متفرق حالت میں پلٹیں گے تا کہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی۔ وہ اس کو دیکھ لے گا۔''

دعا کرانے والی عورت نے ایک آیت کا ترجمہ کیا تھا۔ آپا ایک بار پھر بلک بلک کر رونے لگی تھیں۔ سارہ کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ اس کا سر دوبارہ کبھی اٹھ نہیں پائے گا۔ ضبط کرنے کے باوجود اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

''اللہ تم امی کو بخش دینا۔'' ''تم ان کو معاف کر دینا جیسے ان سب لوگوں نے کیا ہے۔''

بے اختیار اس کے دل سے دعا نکلی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد آہستہ آہستہ سب لوگ جانے لگے تھے ایک بار پھر وہی تعزیتی کلمات سنتی لوگوں کو جاتا دیکھتی رہی۔ آپا بھی اسے اپنے یہاں آنے کی دعوت دے کر چلی گئی تھیں۔ ملازموں نے چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں۔ باہر عارفین عباس اور حیدر لوگوں کو رخصت کر رہے تھے۔ لوگوں کے جانے کے بعد دونوں اندر آ گئے۔

''سارہ! تم اگر آرام کرنا چاہتی ہو تو آرام کر سکتی ہو۔''

اس کی متورم آنکھیں دیکھ کر عارفین عباس نے اس سے کہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس رات وہ سو نہیں پائی۔ امی کا چہرہ بار بار اس کی نظروں کے سامنے آ جاتا پھر اسے ان کے ساتھ گزارا ہوا وقت یاد آ جاتا۔

وہ بے حد بے چین تھی۔ ایک بجے کے قریب وہ لان کی طرف کھلنے والا دروازہ کھول کر لان میں نکل آئی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بیرونی دیوار پر لگائی ہوئی فلڈ لائٹس نے لان کی تاریکی کو ختم کر دیا تھا۔ ٹھنڈک ہونے کے باوجود اسے باہر آ کر سکون ملا تھا۔ گھاس اوس سے بھری ہوئی تھی۔ پاؤں میں چپل کے باوجود گھاس پر چلنے کی وجہ سے اس کے پاؤں اوس سے گیلے ہو رہے تھے مگر اس کو ان کی پروا نہیں تھی۔ وہ چادر کو اپنے گرد لپیٹے بلا مقصد لان کے طول و عرض کو ناپتی رہی۔

حیدر نے دو بجے اپنا کام ختم کیا تھا، لائٹ آف کرنے سے پہلے وہ کھڑکیوں کے پردے برابر کرنے کے لیے کھڑکی کی طرف آیا تھا۔ مگر نیچے لان میں نظر ڈالتے ہی اس کے ہاتھ پردہ کھینچتے ہوئے رک گئے تھے۔ لان میں کوئی چکر لگا رہا تھا۔ اس نے غور سے نیچے دیکھا تھا اور دوسری نظر ڈالتے ہی جان گیا تھا کہ چکر لگانے والا کون ہے۔ ناگواری کی ایک لہر سی اس کے اندر اٹھی تھی۔ وہ خود بھی نیچے آیا تھا اور پورچ کا دروازہ کھول کر باہر لان میں آ گیا تھا۔

''دیکھیں! اس وقت رات کے دو بجے ہیں اور آپ اپنے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر یہاں لان میں پھر رہی ہیں۔ کوئی بھی جو اس لان میں کسی غلط نیت سے چھپا ہو۔ وہ آرام سے آپ کی بے خبری میں آپ کے کمرے اور پھر وہاں سے گھر میں کہیں بھی جا سکتا ہے۔ میں نہیں جانتا آپ کو یہ گھر، اس میں رہنے والے کتنے عزیز ہیں لیکن میرے پاپا نے اس گھر کی ہر چیز بڑی محنت سے بنائی ہے۔ اس لیے مجھے اس گھر کی سیکورٹی کی پروا

ہے۔ گھر کے گیٹ پر کھڑا چوکیدار باہر کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اندر آ کر کسی کو نہیں بچا سکتا۔ اس لیے اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو لان میں پھرنے کا شوق دن کے وقت پورا کیا کریں۔''

سارہ اپنے قریب ابھرنے والی اس کی آواز پر چونکی تھی اور پھر ہونق بنی اس کی باتیں سنتی رہی۔ اس کی بات کے خاتمہ پر کچھ شرمندگی کے عالم میں وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ حیدر وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔ جب اس نے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا تو وہ خود بھی اندر چلا گیا۔

اگلے دن صبح وہ ناشتہ کی میز پر موجود نہیں تھی۔ عارفین نے ملازم کو اسے جگانے سے منع کر دیا۔ عارفین اور حیدر سے اس کا سامنا رات کے کھانے پر ہوا تھا۔

''عارفین انکل! کیا آپ میرے نانا سے میرا رابطہ کروا سکتے ہیں؟''

حیدر چائے پیتے پیتے رک گیا اور عارفین عباس نے بے حد حیرانی سے اسے دیکھا۔

''تم ان سے رابطہ کیوں چاہتی ہو؟'' عارفین نے کچھ بے چینی سے اس سے پوچھا تھا۔

''میں ان کے پاس جانا چاہتی ہوں اگر وہ مان گئے تو۔'' وہ اب میز کی سطح کو گھورنے لگی تھی۔

''ان کے پاس جانا چاہتی ہو؟ کیا تم یہاں خوش نہیں ہو۔'' عارفین نے کچھ بے یقینی سے کہا تھا۔

وہ چپ رہی تھی۔

''سارہ! تمہاری امی چاہتی تھیں کہ تم میرے پاس رہو اور میں تمہیں ان کے گھر والوں کے پاس نہ بھیجوں۔''

''وہ ایسا کیوں چاہتی تھیں؟'' اس نے یک دم سر اٹھا کر سوال کیا تھا۔ عارفین کوئی جواب نہیں دے سکے۔ حیدر خاموشی سے چائے کے سپ لیتا ہوا دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔

''یہ صبا ہی بہتر جانتی ہوگی۔'' بہر حال ان کے پاس جانے کا تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

کچھ دیر بعد انھوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا تھا۔

''پاپا! اگر یہ اپنے نانا کے پاس جانا چاہتی ہیں تو آپ انھیں جانے دیں۔ یہ واقعی ان کے حق میں بہتر ہوگا۔'' یکدم حیدر نے فریج میں اپنے باپ سے کہا تھا۔

''تم اسے کیوں بھیجنا چاہتے ہو؟'' عارفین نے بڑے تیکھے لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔ وہ کچھ گڑبڑا گیا۔

''نہیں۔ میں کیوں بھیجنا چاہوں گا۔ میں تو ویسے ہی آپ کو اپنی رائے دے رہا تھا۔ پاپا! میرا اپنا بھی یہی خیال ہے کہ یہ اپنے نانا اور ماموں کے پاس زیادہ محفوظ رہے گی، کیونکہ یہاں یہ ساری عمر تو نہیں رہ سکتیں اور پھر ہم انھیں کتنی دیر رکھیں گے۔'' وہ دھیمے لہجے میں سنجیدگی سے کہا گیا تھا۔

''حیدر! یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ اسے کب تک یہاں رہنا ہے۔ اس کا دارومدار اس پر ہے۔ چاہے وہ ساری عمر رہے۔ تمہیں اس کے بارے میں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

عارفین عباس نے بے حد خشک لہجے میں اس سے کہا تھا۔ حیدر دوبارہ بولنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ وہ بے حد خاموشی سے ناشتہ کرتے ان کی باتیں سنتی رہی۔ اسے پہلے ہی دن یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ حیدر کو اس کا یہاں آنا اچھا نہیں لگا اور اس وقت اس کی باتوں نے اس کے اندازے کی تصدیق کردی تھی۔

اس کا دل مزید بوجھل ہوگیا۔ بار بار اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ وہاں سے بھاگ جائے۔ اس طرح بوجھ بن کر رہنا اس کے لیے یکدم دشوار ہوگیا تھا۔

''کسی کو بھی خوامخواہ کی ذمہ داری اور خرچ اچھا نہیں لگتا، حیدر نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ وہ مجھے کتنی دیر یہاں رکھ سکتے ہیں اور حیدر میرے بارے میں عزت سے کیسے سوچ سکتا ہے، جب وہ جانتا ہے کہ اس کا باپ کسی زمانے میں میری ماں کو پسند کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہے اور اب اس عورت کی بیٹی ایک بوجھ بن کر ان کے گھر آ گئی ہے۔''

وہ دل ہی دل میں حیدر کو حق بجانب سمجھ رہی تھی اور وہ جانتی تھی وہ اس کے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔

''اگر میں اپنے نانا کے پاس نہیں جا سکتی تو پھر مجھے کسی نہ کسی طرح اس گھر سے بھی چلے جانا چاہیے۔ میں واقعی یہاں بہت زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتی۔''

اس نے ناشتہ کرتے ہوئے دل ہی دل میں طے کرلیا تھا۔

سرمد کی شادی کا ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔ تقریباً ایک ماہ پہلے سے ڈھولک رکھ دی گئی تھی، رات گئے تک ایک طوفان بدتمیزی برپا رہتا۔ اسے ایسی محفلوں سے شروع سے ہی کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اگر وہ ان کے پاس جا کر بیٹھتی بھی تو بہت مختصر وقت کے لیے۔ اس رات بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ رات کے وقت جب ڈھولک بجنا شروع ہوتی تو ان کے گھر تک آواز آتی۔ وہ پڑھتے پڑھتے بعض دفعہ جھنجلا جاتی لیکن وہ کسی کو روک نہیں سکتی تھی۔ نہ ہی اس کا ایسا کوئی ارادہ تھا۔

شادی سے تین چار دن پہلے اس کے چھوٹے تایا کی بیٹیاں زبردستی اسے اپنے حصے میں لے آئی تھیں وہ ان کے اصرار کی وجہ سے انکار نہیں کر سکی پھر اب شادی میں چند دن رہ گئے تھے اور یہ سارا ہنگامہ ختم ہو ہی جانا تھا، باقی کزنز کے ساتھ بیٹھی وہ بھی تالیاں بجاتی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد واپس آ جاتی۔

اس رات بھی وہ ابھی اپنے کمرے میں آ کر بیٹھی ہی تھی کہ عارفین کی امی آ گئیں۔

''صبا! تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔ اصل میں تمہارے تایا ابو نے کہا ہے کہ اوپر عارفین کے کمرے میں کچھ بستر لگا دوں کیونکہ کچھ دیر میں کچھ اور لوگ آنے والے ہیں۔ عورتوں کے رہنے کا انتظام تو خالد نے اپنے ہاں کر لیا ہے مگر مردوں کے لیے ان کے ہاں جگہ نہیں رہی۔ اس لیے تمہارے تایا نے انھیں اپنے ہاں ٹھہرانے کو کہہ دیا ہے۔ نیچے تو تمھیں پتا ہے پہلے ہی جگہ نہیں ہے، ویسے بھی کل نجمہ اور سلمیٰ بھی سرمد کی شادی میں شرکت کے لیے اپنے بچوں کے ساتھ آ جائیں گے۔ اس لیے میں نے سوچا، عارفین کے کمرے میں بستر لگا دوں۔ وہ تو ابھی اسلام آباد سے آیا نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے تائی امی! میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔''

اس نے کچھ خوشگوار حیرت سے اٹھتے ہوئے کہا تھا، پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ تائی نے اتنی اپنائیت سے اس سے بات کی تھی۔ ورنہ وہ تو ہمیشہ لعن طعن ہی کرتی رہتی تھیں۔ تائی اسے اپنے حصہ میں لے آئی تھیں۔ اسٹور میں جا کر جب تائی بستر نکالنے لگیں تو انھیں اچانک کوئی خیال آ گیا تھا۔

''صبا! مجھے تو یاد ہی نہیں رہا میں نے آسیہ سے کہا تھا کہ عارفین کے کمرے میں بستر لگا دو۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید اس نے بستر لگا دیے ہیں کیونکہ یہاں بستر کم ہیں۔ تم ایسا کرو، ذرا عارفین کے کمرے میں جا کر دیکھ آؤ کہ وہاں بستر لگے ہیں یا نہیں، خواہ مخواہ بستر اٹھا کر اوپر جاتی آتی رہو گی۔''

''ٹھیک ہے تائی امی! میں دیکھ آتی ہوں۔'' اس نے تابعداری سے کہا تھا اور اوپر چلی آئی۔ عارفین کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور اندر لائٹ بند تھی لیکن ہلکی ہلکی روشنی باہر آ رہی تھی۔ وہ کچھ ٹھٹک کر رک گئی۔

''اندر کون ہے؟'' اس نے وہیں سے آواز لگائی تھی۔

''صبا! میں ہوں اندر۔ عارفین کے کمرے کے بلب ہولڈر میں کچھ خرابی ہو گئی تھی۔ میں وہ ٹھیک کر رہا ہوں۔ تائی امی نے کہا تھا مجھ سے۔'' اس نے اپنے تایازاد عادل کی آواز پہچان لی۔ ایک اطمینان بھری سانس لے کر وہ کمرے کے اندر چلی گئی۔ وہ ایک ہاتھ میں لالٹین پکڑے دوسرے ہاتھ سے بلب لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میں دیکھنے آئی تھی کہ یہاں کوئی بستر تو نہیں لگے مگر یہاں پر تو کوئی بستر نہیں ہیں۔'' اس نے نیم روشنی میں کمرے کا جائزہ لیا تھا۔

''اچھا اب اگر آ ہی گئی ہو تو یہ ذرا لالٹین......'' عادل کے الفاظ منہ میں رہ گئے تھے۔ کسی نے باہر سے دروازہ کھینچ کے بند کر دیا تھا۔ عادل یکدم کود کر اسٹول سے نیچے اترا۔

''یہ کیا ہوا ہے؟'' وہ حواس باختہ سا دروازے کی طرف گیا تھا۔ اس نے دروازہ پکڑ کر کھینچا تھا مگر دروازہ ہلا تک نہیں۔

''صبا! کسی نے باہر سے کنڈی لگا دی ہے۔'' اس نے پریشانی کے عالم میں اس سے کہا تھا۔

''میں دروازہ بجاتی ہوں۔ تائی امی نیچے ہی ہیں۔ وہ کھول دیں گی۔''

صبا، عادل کے برعکس بالکل نہیں گھبرائی تھی۔ اس نے دروازے کو زور زور سے بجانا شروع کر دیا۔ مگر ایک دو منٹ گزرنے کے بعد بھی کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ عادل کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ہولڈر میں بلب لگانا بھول چکا تھا۔

چند منٹ مزید دروازہ بجانے کے باوجود جب کوئی اوپر نہیں آیا تو یکدم وہ بھی حواس باختہ ہو گئی تھی۔ دونوں کو اس نازک صورت حال کا احساس تھا جس کا وہ سامنا کر رہے تھے۔ پھر یکدم ہی نیچے سے شور کی آواز آنے لگی تھی۔ صبا دروازہ بجاتے بجاتے رک گئی۔

شور کچھ عجیب سا تھا یوں جیسے کوئی بین کر رہا تھا۔ صبا نے کچھ خوفزدہ ہو کر عادل کو دیکھا تھا۔ لالٹین کی ہلکی روشنی بھی اس کے چہرے کی زردی کو نمایاں ہونے سے نہیں بچا سکی۔ آوازیں اب اوپر کی طرف آ رہی تھیں۔ صبا نے تائی امی کی آواز پہچان لی۔ وہ اونچی آواز میں رو رہی تھیں اور ساتھ کچھ کہتی جا رہی تھیں۔ پھر کچھ لوگ تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ وہ دونوں دم سادھے زرد رنگت کے ساتھ دروازہ بجانے کے بجائے ایک دوسرے کے چہرے دیکھتے رہے۔ تائی امی جو کہہ رہی تھیں۔ وہ دونوں نے سن لیا تھا۔ وہ جانتے تھے، اب اگر وہ دروازہ نہ بھی بجائیں تو بھی دروازہ کھل جائے گا۔

❁

ہر روز وہ اخبار لے کر بیٹھ جاتی اور ایک ایک اشتہار پڑھ ڈالتی۔ ہر وہ ملازمت جو اسے ذرا بھی مناسب لگتی وہ وہاں اپلائی کر ڈالتی۔ پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ گریجویشن کی عملی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اب ہر جگہ کم از کم ماسٹرز والے بندے کی ضرورت ہوتی تھی اور اگر کسی جگہ گریجویشن مطلوبہ کوالیفیکیشن ہوتی تو ساتھ فریش گریجویٹ بھی لکھا ہوتا اور سارہ کو گریجویشن کیے چار سال ہو چکے تھے۔ البتہ اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ کسی جاب کے لیے صرف گارنٹی نہ ہونے کی وجہ سے اپلائی نہ کرنے کے مسئلے سے دوچار نہیں تھی۔

اس نے ابھی عارفین عباس کو جاب کی تلاش کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جاب ملنے کے بعد وہ انھیں بتا دے گی۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر اس نے پہلے انھیں اپنی جاب کے بارے میں بتایا تو وہ شاید اسے جاب ڈھونڈنے کی اجازت نہ دیں۔ آہستہ آہستہ اسے انٹرویو کالز ملنے لگیں اور اس نے گھر سے باہر جانا شروع کر دیا۔ عارفین عباس کو ابھی بھی اس نے نہیں بتایا تھا کہ وہ انٹرویوز کے لیے مختلف جگہوں پر جا رہی ہے، بعض دفعہ وہ اس کی غیر موجودگی میں گھر میں فون کرتے تو ملازم ان سے کہہ دیتا کہ سارہ اپنی کسی دوست کے ہاں گئی ہے۔ سارہ ملازم سے یہی کہہ کر جاتی تھی اور پھر جب وہ سارہ سے پوچھتے تو وہ انھیں مطمئن کر دیتی۔

عارفین عباس کو بھی یہ سوچ کر تسلی ہو جاتی کہ وہ رفتہ رفتہ نارمل زندگی کی طرف آ رہی ہے اور اپنے لیے مصروفیت ڈھونڈ رہی ہے۔ سارہ کو گھر سے باہر نکل کر پہلی دفعہ یہ احساس ہو رہا تھا کہ شہر کتنا بڑا ہے اور جاب کا حصول کتنا مشکل ہے۔ اس سے پہلے اسے امی کی وجہ سے بڑی آسانی سے ایک فیکٹری میں جاب مل گئی تھی اور چند اور جگہ جب اپلائی کرنے پر اسے جاب نہیں ملی تھی تو اس نے زیادہ تردد نہیں کیا تھا اور فیکٹری کی جاب کو ہی غنیمت سمجھ لیا تھا مگر اس بار وہ ایک بہتر جاب کی تلاش میں تھی جو اس کے اخراجات پورا کر سکتی۔

سارا دن پیدل دفتروں کے چکر کاٹتے کاٹتے وہ آہستہ آہستہ دل برداشتہ ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگنے لگا تھا جیسے پوری دنیا میں اس کے لیے ایک بھی جاب نہیں تھی۔

اس روز رات کے کھانے پر حسب معمول حیدر اور عارفین فرنچ میں باتیں کر رہے تھے اور وہ بڑی بے دلی سے کھانا کھاتے ہوئے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ خلاف معمول حیدر دیر تک بیٹھا رہا تھا سب سے پہلے ٹیبل سے عارفین عباس اٹھ کر گئے تھے۔ سارہ بھی کھانا کھا چکی تھی اور عارفین عباس کے اٹھنے کے چند منٹ بعد جب اس نے اٹھنا چاہا تو حیدر نے اسے روک دیا۔

''ایک منٹ سارہ! آپ بیٹھیں۔ مجھے آپ سے ایک بات کہنی ہے۔''

حیدر نے سویٹ ڈش کھاتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ وہ کچھ حیران سی دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''آج میں نے آپ کو فیکٹری ایریا میں دیکھا تھا۔ پوچھ سکتا ہوں آپ وہاں کس لیے گئی تھیں؟'' پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے اس پر نظریں جمائے اس نے پوچھا تھا۔ سارہ کے لیے اس کا سوال خلاف توقع تھا۔ وہ چند لمحے چپ رہی اور پھر اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

''میں فیکٹری ایریا نہیں گئی۔'' اس نے بڑے اطمینان سے جھوٹ بولا۔

حیدر اسے حیرانی سے دیکھ کر رہ گیا، شاید اسے سارہ سے اس سفید جھوٹ کی توقع نہیں تھی۔ ''لیکن آپ آج گھر پر نہیں تھیں۔ میں نے ملازم سے پوچھ لیا ہے۔''

''ہاں میں گھر پر نہیں تھی۔ میں اپنی ایک دوست کے پاس گئی ہوئی تھی لیکن میں فیکٹری ایریا نہیں گئی۔''

سارہ کو خود حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کتنے اطمینان سے جھوٹ بول رہی ہے۔

''ہو سکتا ہے، مجھے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو بہر حال آئی ایم سوری۔''

حیدر نے جس طرح یہ جملہ ادا کیا تھا اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اسے سارہ کی بات پر یقین نہیں آیا اور وہ صرف مروتاً ایکسکیوز کر گیا تھا۔

سارہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے حیدر کی یہ تفتیش اچھی نہیں لگی تھی اور نہ ہی وہ اس سے پریشان ہوئی تھی۔ ہاں چند دن احتیاطاً باہر نہیں گئی۔ گھر پر ہی رہی لیکن چند دن گزر جانے کے بعد ایک بار پھر اس نے جاب کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی تھی۔

اس دن بھی دو جگہ انٹرویو دینے کے بعد تیسری جگہ جانے کے لیے وہ بس اسٹاپ پر کھڑی تھی جب اچانک ایک گاڑی اس کے پاس آ کر رک گئی۔

''آئیں۔ آپ کو جہاں جانا ہے۔ میں چھوڑ دیتا ہوں۔'' ایک مانوس آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔''

''یا اللہ! کیا ضروری تھا کہ اس سے میرا سامنا اس آخری انٹرویو سے پہلے ہوتا۔'' سارہ نے بے اختیار دل میں کہا تھا۔ بجھے دل سے وہ گاڑی کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''سارہ! میں آپ کا ڈرائیور نہیں ہوں۔ آپ آگے آ کر بیٹھیں۔'' اس نے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔ وہ کوئی اعتراض کیے بغیر آگے بیٹھ گئی تھی۔

''کہاں جانا ہے آپ کو؟'' حیدر نے گاڑی بڑھاتے ہوئے پوچھا تھا۔

''مجھے گھر جانا ہے۔'' اس نے جھوٹ بولا تھا۔ حیدر نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔

''اگر کہیں اور جانا ہے تو میں وہاں بھی چھوڑ سکتا ہوں۔''

''نہیں مجھے گھر ہی جانا ہے۔''

چند لمحے گاڑی میں خاموشی رہی۔

''آپ سارا دن کہاں پھرتی رہتی ہیں؟ روزانہ کسی دوست کے گھر تو نہیں جایا جا سکتا۔''

حیدر نے اسے دیکھے بغیر اس سے پوچھا تھا سارہ نے یک دم سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا۔

''میں جاب کی تلاش کر رہی ہوں۔''

اسے لگا، حیدر پہلے ہی اسی جواب کی توقع کر رہا تھا۔ ''اور اسی لیے اس دن فیکٹری ایریا میں گئی......''

سارہ نے اس کی بات کاٹنا ضروری سمجھا۔

''نہیں۔ میں اس دن وہاں نہیں گئی تھی۔''

''سارہ! آپ وہاں گئی تھیں۔ مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے آپ کو جس فیکٹری سے نکلتے دیکھا تھا آپ کے انکار کے بعد وہاں فون کر کے آپ کے بارے میں پوچھ لیا تھا۔ اگر اس دن میرے ساتھ میرا دوست نہ ہوتا تو میں گاڑی روک کر آپ کو پک کر لیتا پھر کم از کم آپ اسے میری غلط فہمی قرار نہ دیتیں۔''

سارہ کو اس کا لہجہ قدرے تلخ لگا۔ وہ کچھ بول نہیں پائی۔

''کوالیفیکشن کیا ہے آپ کی؟'' کچھ دیر بعد اس نے پوچھا تھا۔

''گریجویشن۔''

''سبجیکٹس کون سے تھے آپ کے۔''

''اکنامکس اور......اردو۔'' فرنچ کہتے کہتے رک گئی اور پھر اس نے فرنچ کے بجائے اردو کہہ دیا۔

''پاپا کو پتا ہے کہ آپ جاب ڈھونڈ رہی ہیں؟'' اس نے کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد ایک بار پھر پوچھا تھا۔

''میں انھیں بعد میں بتادوں گی۔''

اس بار حیدر نے گردن گھما کر اسے دیکھا تھا۔سارہ کو اس کے چہرے پر کچھ خفگی نظر آئی۔

''دیکھیں سارہ! آپ ہمارے گھر رہتی ہیں اور ہماری ذمہ داری ہیں۔ جو آپ کر رہی ہیں اور جو آپ کرنا چاہتی ہیں۔ پاپا کو اس کے بارے میں پتا ہونا چاہیے۔ بعد میں اگر کوئی پرابلم ہوا تو سارا الزام پاپا پر آئے گا کیونکہ آفٹر آل انھوں نے ہی آپ کو گھر میں رکھا ہے۔ مجھے دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے لیکن آئندہ آپ جاب کے لیے گھر سے باہر جائیں تو پاپا کو اس بات کا پتا ہونا چاہیے اور اگر ایسا نہ ہوا تو میں پاپا کو بتادوں گا۔ مجھے امید ہے آپ میری باتوں پر سنجیدگی سے غور کریں گی۔''

وہ جتنی اچھی فرنچ بولتا تھا۔اس سے زیادہ شستہ اردو میں بات کرتا تھا مگر اس وقت تو سارہ کو زہر لگ رہا تھا۔وہ اسے گیٹ پر اتار کر چلا گیا تھا۔وہ تھکے تھکے قدموں سے اندر چلی آئی۔

دروازہ کھل گیا تھا۔باہر کھڑے مجمع کو جیسے توقعات کے مطابق ان دونوں کو اندر سے نکلتے دیکھ کر بھی حیرت ہوئی تھی۔

''تائی امی! کسی نے باہر سے......'' صبا نے آخری بار صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔

''میں نے کیا تھا دروازہ بند تاکہ تم دونوں کے کرتوت سب کو دکھا سکوں۔'' تائی امی شیر کی طرح اس پر جھپٹی تھیں۔

''آپ کو کیا ہو گیا ہے۔آپ کیا کہہ رہی ہیں۔آپ ہی نے تو مجھے یہاں بستر دیکھنے کے لیے بھیجا تھا۔'' صبا نے یکدم چلا کر کہا تھا۔

''آوارہ، چڑیل! حرافہ! میں نے تمھیں یہاں بستر دیکھنے کے لیے بھیجا تھا۔میرا دماغ خراب تھا۔ میں یہاں عارفین کے کمرے میں کس کے لیے بستر لگواؤں گی۔ بے غیرت! بے حیا! تمھیں شرم نہیں آئی میرے بیٹے کے کمرے میں منہ کالا کرتے ہوئے۔ ہائے میرا عارفین۔ اسے کیا پتا تھا، وہ کس بے حیا کو بیاہنے کی بات کر رہا ہے۔''

تائی امی نے دہائی دیتے ہوئے اپنا سینہ پیٹ لیا تھا۔

''آپ جھوٹ بول رہی ہیں تائی امی! آپ تہمت لگا رہی ہیں۔'' صبا نے سفید پڑتے چہرے کے ساتھ کہا تھا۔

''ہوش کریں تائی امی! خدا کے لیے ہوش کریں۔ایسی بات نہ کریں۔آپ نے تو مجھے بلب ہولڈر ٹھیک کرنے بھیجا تھا۔'' عادل نے بھرائی ہوئی آواز میں تائی امی کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''میں ہوش کروں؟ میں ہوش کروں؟ تم لوگوں کے کرتوت لوگوں کو نہ بتاؤں۔تم لوگوں کے کارناموں پر پردہ ڈال دوں۔ عارفین تمھیں بھائی کی طرح سمجھتا تھا۔تم نے بھائی کی پشت میں خنجر گھونپ دیا ہے یا اللہ میں یہ دن دیکھنے سے پہلے مر کیوں نہ گئی۔''

تائی امی نے ہاتھ ملنے اور بلند آواز میں رونا شروع کر دیا۔ صبا نے ایک نظر اپنی امی کی طرف دیکھا جو گم صم ایک طرف کھڑی تھیں۔اس کی چھوٹی بہن رو رہی تھی۔

''تائی امی! میں نے کچھ نہیں کیا۔ اللہ جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔ میں عارفین کی بیوی ہوں۔ میں اسے دھوکا کیسے......''

تائی امی نے اس کے چہرے پر تھپڑ کھینچ مارا تھا۔ ''نام مت لے بے غیرت! عارفین کا نام مت لے۔ تو عارفین کے لیے مر گئی ہے۔ کیا تیرے جیسی بدکردار کو اس گھر میں لائیں گے۔ ارے جاؤ جا کر گھر کے مردوں کو بلا کر لاؤ۔ ان سے کہو، دیکھیں اس گھر پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔''

تائی امی نے ہاتھ لہرانے شروع کر دیے تھے۔

''خدا کا خوف کریں تائی امی! خدا کا خوف کریں۔'' عادل ایک بار پھر ان کے سامنے گڑگڑایا تھا۔

''تم لوگوں کو خدا کا خوف کیوں نہیں آیا؟ میں تو تم دونوں کے ٹکڑے کر کے کتوں کے سامنے ڈلواؤں گی۔ بخشوں گی تو نہیں۔'' انہوں نے زہریلے لہجے میں کہا تھا۔ عادل کے دل میں پتا نہیں کیا آئی تھی۔

''تم ایک ذلیل عورت ہو۔ تم نے جان بوجھ کر ہم دونوں کو پھنسایا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ میں تمھارے ہاتھوں مرنے کے لیے یہاں بیٹھا رہوں گا، لیکن تم یاد رکھنا۔ میں جب بھی واپس آؤں گا۔ تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

عادل یک دم ادب آداب بالائے طاق رکھتے ہوئے تائی پر دھاڑا تھا اور پھر اس سے پہلے کہ کوئی اسے پکڑنے کی کوشش کرتا، وہ بھاگتا ہوا نیچے چلا گیا تھا۔ تائی امی نے اس کے بھاگنے پر کوئی شور وغوغا بلند نہیں کیا۔

''اگر یہ بے گناہ ہوتا تو یہاں سے بھاگتا کیوں؟ دیکھ لو عالیہ دیکھ لو اپنی بیٹی کے کرتوت۔ تمھیں کتنا سمجھایا تھا کہ اسے روکو۔ تم نے ایک نہیں سنی تھی۔ اب ساری عمر اپنا منہ چھپاتی پھرنا۔''

تائی امی نے صبا کی امی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا جو اب ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔ صبا نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی۔ ہجوم اس کے اردگرد گھیرا ڈالے کھڑا تھا۔ وہ عادل کی طرح وہاں سے بھاگ نہیں سکتی تھی، وہ بھاگنا چاہتی ہی نہیں تھی۔ جو کچھ ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ ہاں اگر کچھ سمجھ میں آ رہا تھا تو وہ سامنے کھڑے لوگوں کی نظریں تھیں جو نیزے کی انی کی طرح اس کے جسم کو چھید رہی تھیں۔ وہ اب انتظار میں تھی کہ تایا اور دوسرے لوگ اوپر آئیں اور وہ انھیں اپنی بات سمجھائے۔ اسے توقع تھی کہ وہ اس کی بات سمجھ لیں گے اور توقع ہمیشہ صرف توقع ہی رہتی ہے۔

عارفین کی بڑی بہن نے نیچے جا کر اپنے باپ کو سب کچھ اسی طرح بتا دیا تھا جس طرح تائی امی کہہ رہی تھیں۔ وہ آگ بگولا ہو کر اوپر آئے تھے۔ تائی نے انھیں دیکھتے ہی اپنے بین اور دہائیوں کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا تھا۔ صبا کو دیکھتے ہی وہ آپے سے باہر ہو گئے تھے۔ انھوں نے صبا کی بات نہیں سنی۔ کوئی بھی اب اس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ گونگی ہو گئی ہے یا باقی سب بہرے ہو چکے تھے۔ مغلظات کا ایک طوفان تھا جو تایا کے منہ سے ابل پڑا تھا۔

''میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ میں اسے گولی ماردوں گا تا کہ آئندہ ایسی حرکت کرنے کی کسی میں جرأت نہ ہو سکے۔''

انھوں نے یک دم فیصلہ کیا تھا اور لپکتے ہوئے نیچے چلے گئے تائی کو اچانک صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ وہ بھی بھاگتی ہوئی ان کے پیچھے چلی گئیں۔

''بے غیرت! جاؤ اب اپنے گھر اور کیا تماشا کروانا چاہتی ہو یہاں؟ چاہتی ہو کہ میرا باپ تمہیں مار کر خود پھانسی چڑھ جائے۔ ہمارا گھر تباہ ہو جائے۔ نکلو یہاں سے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

یکدم عارفین کی سب سے بڑی بہن اس کی طرف آئی تھیں اور اس کا بازو کھینچ کر انھوں نے اسے سیڑھیوں کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ اس کا دوپٹہ نیچے گر پڑا۔ آپا نے اسے دوپٹہ اٹھانے کی مہلت نہیں دی۔ وہ ہونٹ کاٹتے آنسوؤں کو ضبط کرتے دوپٹے کے بغیر ہی نیچے اترنے لگی۔

نیچے ہنگامہ برپا تھا۔ تایا ابو اپنا پستول نکال رہے تھے اور تائی اور ان کے دونوں چھوٹے بھائی انھیں پکڑ رہے تھے۔ سرمد کے ابو نے ان سے پستول چھین لیا تھا۔ صبا اندھوں کی طرح چلتی ہوئی باہر صحن میں نکل آئی تھی۔

''میرے لیے تم مرگئی ہو۔ میرے گھر آنے کی ضرورت نہیں ہے، جہاں دل چاہے چلی جاؤ لیکن اپنے گندے قدم میرے گھر میں مت لانا۔''

صحن میں نکلتے ہی اس نے پیچھے اپنی ماں کی آواز سنی تھی۔ انھوں نے اقصیٰ کا ہاتھ پکڑا تھا اور تقریباً بھاگتے ہوئے اپنے حصے کی طرف چلی گئی تھیں۔ وہ وہیں ساکت ہوگئی۔ کوئی چیز اس کے چہرے کو بھگونے لگی تھی۔

اس کے حصے کے علاوہ باقی ہر حصے کے برآمدوں میں لوگ جمع تھے۔ کچھ کو وہ جانتی تھی کچھ کو نہیں جانتی تھی مگر آج کے بعد ساری عمر اس کا چہرہ انھیں یاد رہنا تھا۔ یک دم اسے کھڑا رہنا دشوار لگنے لگا۔ وہ فرش پر بیٹھ گئی اور اس نے اپنے سر کو گھٹنوں میں چھپا لیا۔ خطرے کے سامنے آنکھیں موند لینا کبوتر کو کیوں اس قدر پسند ہے۔ اسے آج پتا چلا تھا۔ پھر اچانک اسے تایا کی دھاڑ سنائی دی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر تایا کے گھر کی طرف دیکھا۔ وہ صحن میں نکل آئے تھے اور اسی کی طرف آ رہے تھے۔ وہ بے اختیار اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

''میں ان سے کہوں گی۔ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں انھیں بتاؤں گی۔'' اس نے سوچا تھا۔ وہ اب بھی اسے گالیاں دے رہے تھے۔ ان کا چہرہ آگ کی طرح سرخ تھا۔

''تایا ابو! میری بات سنیں۔'' اس نے ان کے قریب آنے پر بلند آواز سے کہا تھا لیکن وہ بات سننے نہیں آئے تھے۔ انھوں نے اس کے قریب آتے ہی دونوں ہاتھوں سے اس کے بال پکڑ لیے تھے۔

''یہ نہ کریں تایا ابو! یہ نہ کریں۔'' وہ خوف سے چلائی تھی۔

برآمدے لوگوں سے بھر گئے تھے۔ بچے اشتیاق کی وجہ سے صحن میں نکل آئے تھے۔ انھوں نے بال کھینچتے ہوئے گالیاں دیتے ہوئے اسے فرش پر دھکا دیا تھا۔ پھر پاؤں سے جوتا اتار لیا تھا۔ اس نے خوف کے عالم میں انھیں دیکھا تھا۔

''تایا......!'' اس کی آواز حلق میں گھٹ گئی تھی۔ وہ پوری طاقت سے اس کے سر پر جوتے برسا رہے تھے۔ صبا نے ان کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ ان کے اشتعال میں اور اضافہ ہوگیا۔ انھوں نے ایک ہاتھ سے اس کے بال پکڑ لیے تھے۔ پتا نہیں صبا کے دل میں کیا آیا، اس نے دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے۔

''نہیں تایا ابو! یہاں صحن میں لوگوں کے سامنے اس طرح نہ ماریں۔ مارنا چاہتے ہیں تو مجھے گولی مار دیں یا مجھے پسٹل دے دیں۔ میں خود

اپنے آپ کو گولی مار لیتی ہوں۔''

انھوں نے اس کے سر پر جوتے مارنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس نے آخری بار سر اٹھا کر دور برآمدوں میں کھڑے لوگوں کو دیکھا تھا پھر اس نے اپنے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر سر چھپالیا تھا۔

تایا ابا اس پر جوتے برسا رہے تھے، وہ کسی حرکت، کسی شور کے بغیر خاموشی سے پٹ رہی تھی۔ دور کہیں سے اسے اقصیٰ کے رونے اور چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

''یہ کیوں کیا آپی؟ یہ کیوں کیا؟'' وہ چلا رہی تھی۔ وہ جواب دینا چاہتی تھی مگر وہ بول نہیں سکتی تھی۔

درد کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ سر اٹھا کر ایک بار اقصیٰ کو دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ سر نہیں اٹھا سکتی تھی۔ آج یوم حساب تھا۔

٭

حیدر کی دھمکی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے ملازمت کی تلاش اور تیز کر دی تھی لیکن جب چند اور ہفتے اسی طرح گزر گئے تو اس نے ایک اکیڈمی کے ذریعے ایک گھر میں آٹھویں کلاس کے ایک بچے کو میتھس کی ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی۔ دو گھنٹے کے لیے دو ہزار روپے کی یہ جاب اس کے لیے بے حد پُرکشش تھی۔ اسے شام کو دو سے چار بجے تک اس بچے کو پڑھانے کے لیے جانا ہوتا تھا اور اس نے عارفین عباس سے کہا تھا کہ وہ ایک جگہ پر کپڑوں کی کٹنگ اور سلائی کا کورس کرنا چاہتی ہے اس لیے اسے دو گھنٹے کے لیے وہاں روز جانا ہوگا۔ عارفین عباس نے کسی اعتراض کے بغیر اسے اجازت دے دی تھی۔ اور حیدر کے استفسار پر انھوں نے اسے بھی یہی بتایا تھا حیدر کو کچھ حیرت ہوئی تھی کہ یکدم جاب کی تلاش چھوڑ کر اس نے ایسی سرگرمی میں دلچسپی لینا شروع کر دیا۔ مگر اس نے اس پر زیادہ غور و خوض نہیں کیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید سارہ پر اس کی باتیں اثر کر گئی ہیں۔

اس دن چھٹی کا دن تھا اور اس کا کوئی دوست اس سے ملنے آیا تھا۔ سارہ، عارفین عباس کے پاس باہر لان میں بیٹھی تھی۔ حیدر نے اپنے دوست کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا لیکن وہ ڈرائنگ روم کی قد آدم کھڑکیوں سے باہر لان کی طرف دیکھتے ہی چونک اٹھا تھا۔

''یہ کون ہیں؟'' اس نے انگلی سے باہر لان کی طرف اشارہ کیا تھا جہاں سارہ، عارفین عباس کے پاس بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ حیدر اس کے سوال پر کچھ حیران ہوا تھا۔

یہ میرے پاپا کی کسی کزن کی بیٹی ہیں۔ ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔ تم جانتے ہو انھیں؟'' حیدر نے اس سے پوچھا تھا۔

''نہیں ایسا کچھ خاص نہیں، دراصل یہ میرے بھانجے کو پڑھاتی ہیں۔ یہاں دیکھا تو حیرانی ہوئی۔ اس لیے پوچھ لیا۔''

حیدر اس کی بات پر چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

''کب سے پڑھا رہی ہیں؟'' اس نے کچھ دیر بعد پوچھا تھا۔

''یہ تو مجھے نہیں پتا، اصل میں دو تین بار مجھے اپنی بہن کے گھر جانے کا اتفاق ہوا، وہیں میں نے ان کو دیکھا تھا لیکن مجھے یہ نہیں پتا کہ انھوں نے اسے کب سے پڑھانا شروع کیا ہے۔''

وہ اسے تفصیل بتا رہا تھا۔ حیدر نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کا موڈ یکدم خراب ہو گیا تھا۔ اس کا دوست کچھ دیر بیٹھا تھا اور پھر چلا گیا تھا۔ دوست کے جانے کے بعد وہ سیدھا باہر لان میں آ گیا تھا۔ جہاں سارہ اور عارفین ابھی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

کچھ اکھڑے ہوئے تیوروں کے ساتھ وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

''سارہ! میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کو جو کام بھی کرنا ہے، پاپا کو اس کے بارے میں پتا ہونا چاہیے لیکن آپ نے میری بات کی قطعاً پروا نہیں کی اور پاپا کے ساتھ غلط بیانی کر کے ٹیوشن کرنے جا رہی ہیں۔''

اس نے کسی تمہید کے بغیر براہ راست اس سے بات شروع کر دی تھی۔ عارفین عباس نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اخبار سامنے پڑی میز پر رکھ دیا تھا۔ سارہ کچھ حواس باختگی کے عالم میں حیدر کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح پکڑی جائے گی اور حیدر کسی لحاظ کے بغیر عارفین عباس کے سامنے اس کا پول کھول دے گا۔

''کیا بات ہے حیدر؟ کیا کیا ہے سارہ نے؟'' عارفین نے کچھ حیرت سے اس سے پوچھا تھا۔

''آپ ان سے پوچھیں۔'' اس نے اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ سارہ نے اب سر جھکا لیا۔

''کیوں سارہ! کیا ہوا ہے؟'' عارفین نے اب اس سے پوچھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ اس کے خاموش رہنے پر حیدر بول اٹھا تھا۔

''یہ کوئی کورس کرنے نہیں جاتی ہیں۔ کسی جگہ پر ٹیوشن کے لیے جاتی ہیں۔''

عارفین عباس کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ چند لمحوں تک وہ کچھ بول ہی نہیں پائے۔ ''سارہ! یہ کیوں کر رہی ہو۔ جو روپے میں تمھیں دیتا ہوں۔ کیا وہ کافی نہیں ہیں اور اگر وہ تمہاری ضروریات کے لیے کافی نہیں ہیں تو تم مجھ سے اور روپے لے سکتی ہو مگر اس طرح۔''

سارہ نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''انکل! مجھے آپ سے روپے لینا اچھا نہیں لگتا نہ ہی مجھے وہ روپے خرچ کرنے اچھے لگتے ہیں۔'' اس نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی تھی۔ عارفین اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئے۔

''دراصل مجھے اس طرح آپ کے گھر رہنا اور آپ پر بوجھ بننا اچھا نہیں لگ رہا۔ میں یہاں رہنا بھی نہیں چاہتی۔''

''کیوں؟'' عارفین نے بے اختیار پوچھا تھا۔

''انکل! میں نہیں جانتی تھی۔ امی مجھے کہاں اور کس کے پاس بھیج رہی ہیں اور عارفین عباس ان کے کیا لگتے ہیں۔ آپ کا اور ان کا کیا رشتہ تھا۔ میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جان پائی لیکن جو تھوڑا بہت جان سکی ہوں۔ وہ میرے لیے کوئی زیادہ خوشی کا باعث نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں، آپ کو یہ جان کر دکھ ہوگا لیکن آپ دونوں کا رشتہ میرے لیے کوئی قابل فخر چیز نہیں ہے اور اس حوالے سے یہاں رہنا میرے لیے تکلیف دہ ہے۔ آپ پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔ جس کے حوالے سے میں آپ سے کچھ لے سکوں یا یہاں رہ سکوں۔ میں نے اسی لیے آپ سے کہا تھا کہ آپ میرے نانا سے میرا رابطہ کروا دیں۔ میں ان کے پاس جانا چاہتی تھی۔ لیکن آپ نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی۔ اب میں جاب ڈھونڈ رہی ہوں

ابھی تک جاب نہیں ملی ہے۔ اس لیے میں نے ٹیوشن کرنا شروع کر دیا کیونکہ اس سے کم از کم میرے اخراجات تو پورے ہو سکتے ہیں۔ جاب ملتے ہی میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

اس نے آہستہ آواز میں ان دونوں کو حیران کرنے کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔

''سارہ! تم اکیلے کیسے رہو گی؟'' عارفین نے کچھ بے چینی سے اس سے پوچھا تھا۔

''انکل! بہت سی لڑکیاں اکیلی رہتی ہیں پھر میرے لیے تو یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے امی کی زندگی میں بھی میں اکیلی ہی ہوتی تھی۔''

''سارہ تمھیں اچھا لگے یا برا لیکن تمھیں یہیں رہنا ہے۔ میں تمھیں اکیلے کہیں نہیں رہنے دوں گا۔ صبا تمھیں میری ذمہ داری بنا گئی ہے۔ میں تمھیں اس طرح خوار ہونے کی اجازت نہیں دوں گا۔'' عارفین نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

''لیکن میں......''

عارفین نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''سارہ! اس مسئلے پر میں بات نہیں کروں گا۔ میرے لیے تم میری بیٹی ہو۔ یہ گھر جتنا حیدر کا ہے۔ اتنا ہی تمہارا ہے۔ تم مجھ پر پہلے بھی بوجھ تھیں نہ آئندہ کبھی ہو گی۔ میرے اور صبا کے رشتے کے بارے میں کچھ غلط مت سوچو، یہ ٹھیک ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور کسی وجہ سے ہماری شادی نہیں ہو سکی لیکن ہمارے درمیان یہ واحد رشتہ نہیں تھا۔ ہم ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست بھی تھے اور اس حوالے سے تمہارا مجھ پر حق ہے۔''

''لیکن آپ یہ کیوں نہیں چاہتے کہ میں اپنے نانا کے پاس چلی جاؤں؟'' وہ ان کی بات پر کچھ جھنجلا گئی تھی۔

''صبا یہ نہیں چاہتی تھی کہ تم اس کے گھر والوں کے پاس جاؤ۔''

''وہ یہ کیوں نہیں چاہتی تھیں؟''

''میں نہیں جانتا کہ وہ یہ کیوں نہیں چاہتی تھی۔''

''میں جانتی ہوں۔ انھوں نے اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کی وہ سب ان سے ناراض ہو گئے اور انھوں نے امی سے قطع تعلق کر لیا۔ امی کا خیال ہو گا کہ وہ اب تک ان سے ناراض ہیں اور شاید وہ مجھے قبول نہیں کریں گے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اب امی کے مرجانے کے بعد ان کی ناراضگی ختم ہو چکی ہو گی۔ اب وہ مجھے ٹھکرائیں گے نہیں۔ کم از کم میں ان سے بات کر کے ان کی ناراضگی دور کر سکتی ہوں۔''

عارفین اس کی باتوں پر حیران ہو گئے تھے۔ ''سارہ! تمھیں یہ سب کس نے بتایا؟'' انھوں نے پوچھا تھا۔

''کسی نے نہیں، میں نے خود اندازہ لگایا ہے۔ میں بچی نہیں ہوں۔ میں بڑی ہوں۔ چیزوں کو سمجھ سکتی ہوں۔''

''ہر چیز ویسے نہیں ہے جیسے تم سمجھ رہی ہو۔ بہت سی باتوں سے تم لاعلم ہو۔ بہت سی چیزوں کے بارے میں تمھارے اندازے غلط ہیں۔'' انھوں نے تھکے ہوئے لہجے میں اس سے کہا تھا۔

''تو پھر آپ مجھے بتائیں۔ حقیقت کیا ہے۔ کس چیز کے بارے میں میرا اندازہ غلط ہے امی نے کبھی مجھے کچھ نہیں بتایا مگر آپ تو بتا سکتے ہیں۔''

''سارہ! میں تمھارے نانا سے کانٹیکٹ کروں گا لیکن تم یہ بات ضرور یاد رکھنا کہ صبا یہ نہیں چاہتی تھی کہ تم ان کے پاس رہو۔''

اس کی توقع کے برعکس عارفین عباس نے اس کی بات مان لی تھی اور پھر وہ تیزی سے اٹھ کر چلے گئے تھے۔

حیدر نے اس پوری گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا مگر وہ دلچسپی سے دونوں کی باتیں سنتا رہا تھا۔ سارہ نے پہلی بار اسے صحیح معنوں میں چونکایا تھا۔

عارفین کے جانے کے بعد وہ بھی اٹھ کر اندر چلا آیا تھا۔ سارہ دیر تک لان میں بیٹھی رہی۔

...✿...

اس کی آنکھ کھلتے ہی درد کی ایک لہر اس کے سر سے پیر تک دوڑ گئی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ کہیں سے چڑیوں کے چہچہانے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ قالین پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کی۔ پورا سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح بیٹھنے کے بعد اس نے سر کو دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ پچھلی رات ایک ڈراؤنے خواب کی طرح اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے رات کے واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کی تھی۔ بہت دیر تک اسے پیٹتے رہنے کے بعد تایا چلے گئے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ برآمدوں میں کھڑے لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہوئے غائب ہونے لگے۔ ان سب کے جانے کے بعد وہ آہستہ آہستہ کھڑی ہوئی تھی اور کسی نہ کسی طرح خود کو اپنے گھر تک لے آئی تھی۔

گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ کسی کمرے سے امی اور اقصیٰ کے رونے اور عظیم کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں وہ کمرے میں آ گئی تھی۔ پتا نہیں کب امی کو اس کے اندر آنے کا پتا چلا تھا اور وہ اونچی آواز میں بولتے ہوئے اس کے کمرے میں آ گئی تھیں۔

''منہ کالا کرنے کے بعد یہاں کیا لینے آئی ہو؟ بے غیرت، جاؤ جا کر کہیں ڈوب مر۔''

''منہ کالا میں نے نہیں کیا۔ آپ سب نے مل کر کر دیا ہے۔ عارفین کو آنے دیں۔ سب کو پتا چل جائے گا کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون۔''

''ہاں آئے گا عارفین۔ ضرور آئے گا تمھارے منہ پر تھوکنے۔ طلاق کے کاغذات تمھارے منہ پر مارنے۔ صبا تو تو میرے گھر کے لیے سانپ سے بھی بڑھ کر زہریلی ثابت ہوئی ہے۔ میں نے پیدا ہوتے ہی تیرا گلا کیوں نہ گھونٹ دیا۔''

''گھونٹ تو دیا ہے امی! چند گھنٹے پہلے سب نے مل کر میرا گلا ہی تو گھونٹا ہے۔ اب بچا کیا ہے جس کا واویلا کر رہی ہیں۔''

''اس بے شرم کو دیکھو۔ یہ ابھی بھی مظلوم بن رہی ہے۔ ابھی بھی انکاری ہے۔ میرا بس چلتا صبا! تو میں تجھے سب کے سامنے بیچ صحن میں کوڑے مارتی۔ تو نے اپنا منہ اس دنیا میں خود کالا کیا۔ اگلی دنیا میں اللہ کالا کرے گا۔ تو دیکھنا صبا! کتنی رسوائی ہے تیرے لیے آگے۔''

''اب کوڑوں کی ضرورت نہیں رہی امی! اب کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی۔ مجھے جتنی رسوائی ملنی تھی۔ مل گئی۔ اب دوسروں کی باری ہے۔ آپ کی، اس خاندان کے ہر اس شخص کی جس نے مجھ پر تہمت لگائی۔''

''کتنا جھوٹ بولے گی۔ صبا! تو کتنا جھوٹ بولے گی۔ سب نے دیکھا ہے تجھے عادل کے ساتھ اس کمرے سے نکلتے سب نے دیکھا ہے اور پھر بھی کہتی ہے کہ تو سچی ہے۔''

''ہاں سب نے دیکھا ہے...... سب نے دیکھا ہے، بس اللہ نے نہیں دیکھا۔ تم لوگوں کا دیکھنا نہ دیکھنا برابر ہے۔ لوگوں کے دیکھنے نہ

دیکھنے سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔''

وہ بے ساختہ چلانے لگی تھی۔ اقصیٰ۔ امی کو اس کے کمرے میں سے لے گئی۔ پھر کوئی اس کے کمرے میں نہیں آیا تھا۔ اسے یاد نہیں کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور اب صبح ہو چکی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ پردے کھینچ کر اس اندھیرے کو ختم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے اب صرف عارفین کا انتظار تھا۔ صرف وہ تھا جو اب اس کی زندگی کا فیصلہ کر سکتا تھا۔ اسے یقین تھا وہ اس پر اعتبار کرے گا وہ اسے گناہگار نہیں سمجھے گا۔

وہ اسی شام آ گیا تھا۔ تائی امی کو اس کی آمد کے بارے میں پہلے سے پتا تھا اور جو انہیں اس سے کہنا تھا، وہ سب کچھ بھی طے کر چکی تھیں۔ انھوں نے اس کا استقبال روتے ہوئے کیا تھا اور پھر آنسوؤں اور ہچکیوں کے بیچ اس پر قیامت توڑ دی تھی۔ عارفین کو یقین نہیں آیا تھا۔ وہ سانس روکے بے یقینی کے عالم میں سب کچھ سنتا رہا تھا۔ عادل گھر سے غائب تھا اور سارے ثبوت صبا کے خلاف تھے لیکن وہ ایک بار صبا سے پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ تائی امی سے سارا قصہ سنتے ہی انہی قدموں پر صبا کے گھر آیا تھا اور صبا اسے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ لیکن وہ جو کچھ اس سے پوچھنے آیا تھا اس کا تعلق دل سے نہیں تھا۔

''صبا مجھے بتاؤ۔ تم نے کیا کیا ہے؟'' وہ وحشت زدہ تھا۔

''عارفین! میں نے کچھ نہیں کیا۔ یقین کرو۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ کیا میں ایسا کر سکتی ہوں؟ کیا میں تمہیں دھوکا دے سکتی ہوں۔''

''لیکن سب لوگ جو کہہ رہے ہیں وہ......''

''سب لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔'' اس نے بے اختیار عارفین کی بات کاٹی تھی۔

''کیا آنکھوں دیکھی جھوٹ ہو سکتی ہے۔''

''آنکھیں کچھ نہیں دکھاتیں۔ آنکھیں تو صرف وہ دکھاتی ہیں جو ہمارا دل، ہمارا دماغ دیکھنا چاہتا ہے۔''

''صبا! آج فلاسفی مت بولو۔ آج اس زبان میں بات کرو جو میری سمجھ میں آ جائے جس سے مجھے یقین آ جائے کہ تم بے گناہ ہو۔ تم نے کچھ نہیں کیا۔''

صبا کو اس کے لہجے پر شاک لگا تھا۔ وہ دس دن پہلے کا عارفین نہیں تھا۔ وہ اس کا ساتھ دینے نہیں آیا تھا وہ اس کی پارسائی کا ثبوت لینے آیا تھا۔ اس نے پست آواز میں پورا واقعہ سنا دیا تھا۔ اس کا چہرہ بے تاثر رہا۔ وہ جان گئی۔ وہ یہ آخری بازی بھی ہار چکی تھی۔

''تمہارا مطلب ہے، یہ سب میری ماں نے کروایا ہے۔ ہے نا؟''

صبا کی بات ختم ہونے پر اس نے پوچھا تھا۔ وہ چپ رہی تھی جان گئی تھی۔ یہ سوال نہیں تھا۔

''اگر تم اور عادل سچے ہو اور میری ماں جھوٹی ہے تو عادل کہاں بھاگ گیا ہے؟ کیوں بھاگ گیا ہے؟ سامنے کیوں نہیں آتا۔ اپنی بے گناہی ثابت کیوں نہیں کرتا۔'' وہ چلا اٹھا۔

وہ چند لمحے کچھ نہیں بول سکی۔ ''تو تم نے بھی مان لیا کہ میں......'' عارفین نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میں نے کچھ نہیں مانا مگر تم مجھے اپنی بے گناہی کا ثبوت دو۔ مجھے ثبوت دو اس بات کا کہ یہ سارا منصوبہ میری ماں نے بنایا ہے اور تمہارا عادل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور تم دونوں وہاں......''

وہ بات مکمل کرنے کی بجائے اپنا سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ کسی بھی بات کا اور میں پھر بھی کہتی ہوں کہ میں بے قصور ہوں۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ ہاں اللہ کو پتا ہے۔ وہ جانتا ہے۔ اس سے پوچھو۔'' وہ اس کی بات پر چلا اٹھا تھا۔

''خدا سے کیسے پوچھوں، میں کوئی پیغمبر ہوں؟''

''لوگ کہتے ہیں۔ اللہ دلوں میں بستا ہے۔ تم اپنے دل سے پوچھو۔''

''میں دل سے کیوں پوچھوں۔ میں تم سے کیوں نہ پوچھوں؟''

''میں سچ کہتی ہوں۔ تم کو اعتبار نہیں آتا۔ میں جھوٹ بولوں گی۔ تمھیں فوراً یقین آ جائے گا۔ تم کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تمھیں لوگوں کی باتوں پر یقین آ چکا ہے۔ مجھ سے تو صرف تصدیق چاہتے ہو۔''

وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے اسے دیکھتا رہا پھر کھڑا ہو گیا۔

''تم چاہتی ہو ناں، اللہ سے پوچھوں، میں اللہ سے ہی ہر بات کا فیصلہ کرواؤں گا۔ قرآن لاؤں گا تمھارے سامنے۔ اس پر ہاتھ رکھ کر کہو گی کہ تم بے گناہ ہو۔ تم نے کچھ نہیں کیا۔''

''اگر فیصلہ قرآن پر ہی ہونا ہے تو اپنی ماں کو بھی لاؤ۔ پہلے ان سے کہو کہ وہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ انھوں نے مجھے اور عادل کو تمھارے کمرے میں نہیں بھیجا۔ انھوں نے یہ سارا منصوبہ نہیں بنایا اور اگر وہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر یہ سب نہ کہیں تو پھر انھیں بھی صحن کے بیچوں بیچ اسی طرح جوتے سے مارا جائے جیسے تمھارے باپ نے مجھے مارا ہے۔ بولو، لاؤ گے اپنی ماں کو؟

عارفین کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ ''لاؤں گا۔ اپنی ماں کو بھی لاؤں گا۔'' وہ دروازے سے نکلنے لگا پھر جاتے جاتے رک گیا۔

''اور صبا! اگر تم جھوٹی ہوئیں تو میرا ہر رشتے، ہر چیز سے اعتبار اٹھ جائے گا۔ حتیٰ کہ خدا سے بھی۔'' وہ کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

* * *

اس دن کے بعد وہ گھر میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ ٹیوشن اس نے چھوڑ دی تھی کیونکہ حیدر کو اس بات پر اعتراض تھا کہ وہ اس کے دوست کی بہن کے گھر پڑھانے جاتی ہے اور اس کی عزت پر حرف آتا ہے۔ کسی اور جگہ اس نے ٹیوشن کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ منتظر تھی کہ عارفین اس کے نانا سے بات کریں اور اسے کچھ بتائیں مگر انھوں نے ابھی تک اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ سارا دن گھر میں بے مقصد پھرتی رہتی۔ اس کا دل اب کتابیں پڑھنے میں بھی نہیں لگتا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی ہر وقت اس کے اعصاب پر سوار رہتی تھی۔ پھر ایک دن عارفین کی سب سے بڑی بہن نے اسے فون کیا تھا۔ اسے ان کا فون اٹینڈ کرتے ہوئے حیرت ہو رہی تھی۔

''سارہ! تم کو میں نے اپنے ہاں آنے کے لیے کہا تھا مگر تم آئیں ہی نہیں۔ میں اس دن سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔''

اس کے سلام کا جواب دیتے ہی انھوں نے شکوہ کیا تھا۔ اسے ان کی بات پر خوشگوار حیرت ہوئی۔

''آنٹی! میں آنا چاہتی تھی لیکن مجھے آپ کے گھر کا پتہ نہیں ہے، اکیلے میں کیسے آ سکتی ہوں۔''

''گھر کا کیا مسئلہ ہے۔ تم حیدر سے کہو۔ وہ تمھیں چھوڑ جائے گا۔'' وہ ان کی بات پر خاموش ہو گئی۔

''میں کسی دن آپ کی طرف آؤں گی۔''

''کسی دن نہیں، میں کل تمہارا انتظار کروں گی۔ تم ضرور آنا۔'' انھوں نے اس قدر اصرار کیا تھا کہ اس نے ہامی بھر لی۔ رات کے کھانے پر اس نے عارفین عباس سے اس بات کا ذکر کیا تھا وہ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے اور جب اسے یقین ہو گیا کہ انھوں نے اس کی بات سنی ہی نہیں تو وہ بول اٹھے تھے۔

''ٹھیک ہے۔ چلی جانا حیدر تمھیں چھوڑ آئے گا۔''

لیکن پاپا! مجھے تو صبح آفس جانا ہے۔ میں کیسے انھیں چھوڑنے جا سکتا ہوں؟'' حیدر پانی پیتے پیتے رک گیا تھا۔

''تم آفس جاتے ہوئے اسے چھوڑ آنا اور لنچ آور میں اسے گھر چھوڑ جانا۔''

عارفین عباس نے خود ہی پروگرام سیٹ کر دیا تھا۔ حیدر خاموش ہو گیا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے جاتے جاتے کہا تھا۔

''آپ صبح ساڑھے آٹھ بجے تیار رہیے گا۔'' اس نے سر ہلا دیا۔

وہ صبح ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے تیار ہو کر نیچے آ گیا تھا۔ سارہ ناشتہ سے فارغ ہو کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ''چلیں؟'' اس نے سارہ کو دیکھتے ہی پوچھا تھا۔

''آپ ناشتہ نہیں کریں گے؟''

''نہیں۔'' حیدر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اس کے پیچھے چلتی ہوئی لاؤنج کے دروازے کی طرف آ گئی۔ حیدر نے لاؤنج کا دروازہ کھولا تھا اور خود باہر نکلنے کے بجائے اسے پہلے نکلنے کا اشارہ کیا تھا۔ سارہ نے قدرے حیرت سے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد حیدر بھی باہر آ گیا تھا۔ سارہ لاشعوری طور پر گاڑی کے پچھلے دروازے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی مگر حیدر نے گاڑی کے اندر بیٹھتے ہی فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا تھا۔ اور بلند آواز میں کہا تھا۔

''میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ میں ڈرائیور نہیں ہوں۔ میرے ساتھ اگر آپ کو کہیں جانا ہے تو آگے بیٹھنا ہو گا۔''

سارہ کچھ جھینپ کر آگے بیٹھ گئی تھی۔ چند منٹوں بعد گاڑی سڑک پر آ گئی تھی۔

''آپ کہاں جاب کرتے ہیں؟''

''ٹرینی'' کے طور پر سٹی بینک میں کام کر رہا ہوں۔''

یہ واحد سوال و جواب تھا۔ جو پندرہ منٹ کے اس سفر میں دونوں کے درمیان ہوا تھا۔ پندرہ منٹ بعد گاڑی ایک پرانی لیکن وسیع عمارت کے باہر رک گئی تھی۔

''اندر جا کر دائیں طرف جو گھر ہے، وہیں پر میری دونوں پھوپھیاں رہتی ہیں۔''

حیدر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بتایا تھا۔ وہ اس اطلاع پر کچھ حیران ہوئی تھی۔

''دونوں پھوپھیاں؟''

''اصل میں یہ گھر میرے دادا کا ہے۔ بڑی پھوپھی کافی سال پہلے بیوہ ہو گئی تھیں اور چھوٹی پھوپھو کو ڈرائیورس ہو گئی تھی تب سے وہ دونوں اپنے بچوں کے ساتھ یہیں رہتی ہیں۔'' حیدر نے وضاحت کی تھی۔ ''لیکن اب میں اکیلے اندر کیسے جاؤں؟'' وہ کچھ نروس ہو رہی تھی۔

حیدر نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔ ''کیوں اکیلے جانے سے کیا ہو گا۔ خیر میں آپ کو اندر چھوڑ آتا ہوں۔''

اس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔ سارہ بھی گاڑی سے باہر نکل آئی۔ حیدر گیٹ کی طرف بڑھا تھا اور اسے کھول دیا تھا۔ ایک بار پھر پہلے کی طرح اس نے سارہ سے آگے بڑھنے کے لیے کہا تھا۔ سارہ نے دلچسپی سے ان ایک جیسی عمارتوں کو دیکھا تھا جو اس احاطے کے چار کونوں میں ایستادہ تھیں۔ طویل لان عبور کر کے وہ داہنی جانب والی عمارت کی طرف مڑ گئے۔ اندر جاتے ہی اسے خوشگوار حیرت ہوئی تھی جب اس نے عارفین کی سب سے بڑی بہن کو اپنا منتظر پایا تھا۔

''عارفین نے مجھے رات کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ تم حیدر کے ساتھ صبح آؤ گی۔ میں تب سے تمھارے انتظار میں بیٹھی ہوں۔'' انھوں نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

''میں آپ کو لینے کے لیے ڈیڑھ بجے کے قریب آؤں گا۔'' حیدر نے سارہ سے کہا تھا۔

''نہیں۔ سارہ آج نہیں جائے گی۔ وہ آج یہیں رہے گی، تم کل شام کو اسے لے جانا۔'' بڑی پھوپھو نے فوراً فیصلہ سنا دیا تھا۔

''کیوں سارہ؟'' حیدر نے اس سے پوچھا تھا سارہ تذبذب میں پڑ گئی۔

''نہیں آنٹی میں رات تو نہیں رہ سکتی۔'' اس نے کہا تھا۔

''کیوں سارہ رات کیوں نہیں؟ تم جانتی ہو۔ میں آج تمھیں صبا کا گھر بھی دکھاؤں گی۔''

''امی کا گھر۔'' سارہ کو یقین نہیں آیا تھا۔

''ہاں تمہاری امی کا گھر۔ یہ ساتھ ہی تو ہے۔'' انھوں نے سارہ کا اشتیاق بڑھا دیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ آج مجھے لینے نہ آئیں۔ میں آج یہیں رہوں گی۔'' اس نے فوراً حیدر کو اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

''اچھا پھوپھو! میں اب چلتا ہوں۔'' حیدر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''ارے اتنی جلدی۔ بیٹھو، چائے تو پی کر جاؤ۔'' انھوں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔

''نہیں پھوپھو! مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔کل شام کو آؤں گا، تب چائے پی کر جاؤں گا۔اس وقت نہیں۔''

وہ خدا حافظ کہہ کر چلا گیا تھا۔وہ اس وقت چائے پی رہی تھی جب عارفین کی دوسری بہن اوپر سے آ گئی تھیں۔وہ بھی اس سے بڑی محبت سے ملی تھیں۔چائے پلانے کے بعد بڑی پھوپھو اسے لے کر باقی دونوں گھروں میں گئی تھیں اور کہیں بھی سارہ کو یہ نہیں لگا کہ کوئی اس کی امی سے ناراض تھا۔ہر جگہ اس کی امی کا ذکر بڑی محبت سے کیا گیا تھا۔

''پتا نہیں امی! آپ کو یہ غلط فہمی کیوں ہوگئی تھی کہ واپس آنے پر آپ کو قبول نہیں کیا جائے گا یہاں پر تو سب آپ کی غلطی بھول چکے ہیں۔آپ اپنی زندگی میں ایک بار یہاں آ جاتیں۔'' وہ بار بار یہی سوچ رہی تھی۔

''یہ مجھ سے اتنی محبت کا اظہار کر رہے ہیں تو کیا یہ امی سے محبت نہیں کرتے ہوں گے لیکن پتا نہیں کیوں انھوں نے ایک غلط فہمی میں اپنی زندگی برباد کر لی۔'' وہ اب ماں سے بدگمان ہو رہی تھی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد بڑی پھوپھو اسے اس کی امی کے گھر لے کر گئی تھیں۔

''تمہاری نانی اور خالہ امریکہ جاتے ہوئے اس گھر کو بیچ دینا چاہتے تھے، تب ابا نے ان کو منع کر دیا۔بعد میں...... بعد میں۔''

بات کرتے کرتے پتہ نہیں کیوں پھوپھو کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔''بعد میں تمھارے نانا نے اس گھر کو بیچنے پر اصرار کیا تو عارفین نے یہ گھر خرید لیا۔تب سے اب تک یہ بند ہے۔وہ یہاں کسی کو رہنے دیتا ہے نہ ہی خود کبھی یہاں آتا ہے۔اس کی چابیاں میرے پاس ہیں۔میں ہر ہفتے اسے کھلوا کر صاف کرواتی رہتی ہوں۔''

پھوپھو نے دروازے کا تالا کھولتے ہوئے کہا تھا۔سارہ کو گھر کے اندر داخل ہو کر عجیب سی اپنائیت اور مرعوبیت کا احساس ہوا تھا۔

''تو امی یہاں رہتی تھیں اور یہ سب کچھ چھوڑ کر انھوں نے اس جھونپڑی کا انتخاب کیسے کر لیا تھا۔کیا ان کو کبھی ان آسائشوں کا خیال نہیں آیا۔''

اس نے دیواروں پر لگی پینٹنگز پر نظر دوڑاتے ہوئے سوچا تھا پھوپھو ایک اور کمرے کا دروازہ کھول رہی تھیں۔

''یہ تمہاری امی کا کمرہ ہے۔'' انھوں نے دروازہ کھول کر اسے بتایا تھا۔وہ ایک عجیب سے اشتیاق میں تیزی سے اس کمرے کی طرف آئی تھی۔کمرے میں تاریکی تھی۔پھوپھو نے اندر داخل ہو کر پردے ہٹا دیے۔کمرہ یکدم روشن ہو گیا تھا۔اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی تھی۔جو پہلی چیز اس کی نظر میں آئی تھی وہ ایک بہت بڑی وزنی سی اسٹڈی ٹیبل اور اس کے پاس دیوار پر لگے ہوئے ریکس پر کتابوں کی لمبی لمبی قطاریں تھیں۔وہ کچھ بے اختیاری ہو کر کتابوں کی طرف گئی تھی اور کتابوں پر ایک نظر ڈالتے ہی اس نے مڑ کر پھوپھو سے پوچھا تھا۔

''امی نے کتنی تعلیم حاصل کی تھی؟''

''وہ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔انگلش میں ایم۔اے کر رہی تھی پھر بس......بس اس نے چھوڑ دیا۔''

پھوپھو یکدم کچھ افسردہ ہوگئی تھیں اور اس کے سر پر جیسے کوئی پہاڑ آن گرا تھا۔''ایم۔اے انگلش اور ساری عمر وہ ایک فیکٹری میں دو ہزار روپے کے عوض پیکنگ کا کام کرتی رہیں۔آخر کیوں؟''

اس کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ جب وہ اپنی امی کو فرنچ بولتے سنتی تھی تو اس کا خیال تھا کہ انھوں نے اپنے کسی رشتہ دار سے یہ زبان سیکھی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ پڑھی لکھی ہیں لیکن ان کے حلیے سے اسے کبھی بھی اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کبھی یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں گی۔ ریکس میں ہر طرح کی کتابیں تھیں۔ شیکسپیئر کے ڈراموں سے لے کر وارث شاہ کی ہیر تک، ہارڈی کے ٹیس سے لے کر موپاساں کی کہانیوں تک، وہاں ہر قسم کی کتاب تھی۔ وہ کچھ افسردگی سے کتابوں کو دیکھتی رہی۔

''امی نے یونیورسٹی کیوں چھوڑ دی؟'' ایک بار پھر اس نے مڑ کر پھوپھو سے سوال کیا تھا۔ انھوں نے اس سے نظریں چرا لیں۔

''پتا نہیں۔'' اسے اپنے سوال کا جواب خود ہی مل گیا تھا۔

''وہاں ان کی ملاقات میرے ابو سے ہو گئی ہو گی اور پھر انھوں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔'' اس نے سوچا تھا۔

وہ اسٹڈی ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تھی۔ اسٹڈی ٹیبل پر گرد کی ہلکی ہلکی تہہ تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اسے صاف کرنے کی کوشش کی۔ پھر اس نے اسٹڈی ٹیبل کے دراز کھولنا شروع کر دیے تھے۔ وہ لاکڈ نہیں تھے۔ ان کے اندر کارڈز اور خطوط کا ایک ڈھیر تھا۔

''پھوپھو! آپ اگر جانا چاہتی ہیں تو چلی جائیں میں یہاں ٹھہرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے ان سے کہا تھا۔

وہ کچھ ہچکچائی تھیں۔ ''تمھیں اکیلے یہاں ڈر نہیں لگے گا؟'' انھوں نے پوچھا تھا۔

''ڈر کس بات کا؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا تھا۔ پھوپھو کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ ''ہاں اب کس کا ڈر ہو گا۔''

وہ بڑبڑائی تھیں اور کمرے سے نکل گئی تھیں۔ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں انھیں جاتا دیکھتی رہی۔

پھر وہ دوبارہ خطوط اور کارڈز کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ زیادہ تر کارڈز اور خطوط فرنچ میں لکھے ہوئے تھے اور وہ لکھنے والے کا نام پڑھ کر چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔ وہ خطوط اور کارڈز عارفین عباس نے لکھے تھے۔ امی نے فرنچ کس سے اور کس کے لیے سیکھی ہو گی۔ عارفین عباس سے ملنے کے بعد یہ راز اس کے لیے راز نہیں رہا تھا مگر اسے یہ توقع نہیں تھی کہ ان دونوں کے درمیان باقاعدہ خط و کتابت بھی ہوتی ہو گی۔ اس نے ایک خط پڑھنا شروع کیا تھا۔ کاغذ انتہائی بوسیدہ ہو چکا تھا اور بعض جگہ پر سیاہی بھی غائب ہو چکی تھی، باری باری اس نے سارے خطوط پڑھنا شروع کر دیے۔ ایک خط کی کچھ لائنیں پڑھ کر وہ ساکت ہو گئی تھی۔

''تم نے اپنے خط میں جو لکھا ہے بالکل ٹھیک لکھا ہے۔ میں بھی رخصتی پر نکاح جیسا ہنگامہ نہیں چاہتا۔ پتہ نہیں ہمارے یہاں شادی جیسے ذاتی معاملہ کو اتنا بڑا ہنگامہ اور تماشا کیوں بنا دیا جاتا ہے۔ بہر حال تمھیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ دسمبر میں جب رخصتی کروانے کے لیے پاکستان آؤں گا تو گھر والوں کو مجبور کروں گا کہ وہ مایوں اور مہندی جیسی رسموں پر وقت ضائع نہ کریں۔ میں جانتا ہوں، تم بھی اپنے گھر والوں کو اس بات پر راضی کر لو گی۔''

''اوہ خدایا! یہ سب کیا ہے؟'' وہ بے اختیار سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

''کیا عارفین انکل کے ساتھ امی کا نکاح ہوا تھا پھر میرے ابو بیچ میں کہاں سے آ گئے؟'' اس نے خط پر تاریخ دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ

خط اس کی پیدائش سے ڈیڑھ سال پہلے لکھا گیا تھا۔

''کیا امی نے نکاح ہو جانے کے باوجود عارفین انکل کے ساتھ دھوکا کیا تھا؟''

وہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔ یک دم اس کا دل وہاں سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اس نے وہ خطوط اپنے بیگ میں بھر لیے۔ کارڈز کو دیکھتے ہوئے وہ پھر چونک گئی تھی۔ اب شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ کچھ کارڈز عارفین عباس نے اس کی امی کو نکاح کے دن کی مبارکباد دینے کے لیے بھیجے تھے۔ اس نے ان کارڈز کو بھی بیگ میں ڈال لیا۔ ماں سے اس کی بدگمانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے باقی کارڈز کو دراز میں رکھ دیا اور دراز بند کر کے باہر نکل آئی۔ پھوپھو وہاں نہیں تھیں۔ شاید وہ اپنے گھر چلی گئی تھیں۔ اس نے بیرونی دروازے کو احتیاط سے بند کر دیا اور پھوپھو کے گھر کی طرف چل پڑی۔

شام تک وہ الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ پھوپھو کے پاس بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہی۔ پانچ بجے خلاف توقع حیدر آ گیا۔ اس کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔

''پاپا ناراض ہو رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ میں سارہ کو فوراً لے کر آؤں۔'' اس نے آتے ہی پھوپھو سے کہا تھا۔

''لیکن وہ تو یہاں رات رکے گی۔''

''آپ رات کی بات کر رہی ہیں۔ وہ تو اس بات پر مجھ پر بگڑ رہے ہیں کہ میں لنچ اور میں ان کی ہدایت کے مطابق سارہ کو واپس کیوں نہیں لے کر آیا۔''

''تم نے انھیں بتانا تھا کہ سارہ خود یہاں رہنے پر تیار ہے۔''

پھوپھو! آپ کو پتا ہے پاپا کے غصے کا، جب وہ غصے میں ہوتے ہیں تو کسی کی بات کہاں سنتے ہیں۔ انھوں نے تو میری اتنی انسلٹ کی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے کس کی اجازت سے اسے وہاں رات رکنے کے لیے کہہ دیا ہے۔ مجھے یہ حق کس نے دیا ہے، میں نے ان سے کہا بھی کہ وہ محترمہ خود تیار ہوئی تھیں رات گزارنے کے لیے مگر ان کا پارہ نیچے نہیں آیا۔ اب براہ مہربانی مس سارہ! آپ چلیں۔''

وہ بڑی بے زاری سے اس سے کہہ رہا تھا۔ سارہ کچھ شرمندگی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''تم آتی جاتی رہنا۔ اب تو تمھیں گھر کا بھی پتہ چل گیا ہے۔''

پھوپھو نے اسے لپٹاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ بجھے دل سے حیدر کے ساتھ چل پڑی۔ حیدر کا موڈ بری طرح آف تھا۔ وہ گھر آتے ہی سیدھا اوپر چلا گیا اور دوبارہ کھانا کھانے بھی نیچے نہیں آیا۔

عارفین عباس نے اسے کچھ نہیں کہا تھا مگر ان کے چہرے کے تاثرات سے وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ اس سے بھی زیادہ خوش نہیں ہیں۔ بڑی بے دلی سے اس نے ان کے ساتھ کھانا کھایا تھا اور پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں آتے ہی اس نے اپنے بیگ میں سے وہ خطوط اور کارڈز نکال لیے اور ایک بار پھر سے انھیں پڑھنے لگی۔

صبا کو یقین تھا۔تائی کبھی قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر جھوٹ نہیں بولیں گی۔ عارفین اپنے ماں اور باپ کو لے آیا تھا۔ دوسرے دونوں تایا بھی آ گئے تھے۔ صبا کے کمرے میں کبھی اتنے لوگ نہیں آئے تھے۔ ہر چہرہ تناؤ سے دوچار تھا۔ وہ اٹھ کر وضو کرنے چلی گئی تھی۔ بہتے آنسوؤں کے ساتھ اس نے وضو کیا تھا۔ پھر چہرہ اور آنکھیں خشک کر کے وہ کمرے میں آ گئی تھی۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی، یوں جیسے سب لوگ قوت گویائی سے محروم ہو چکے تھے۔ اسے عارفین پر ترس آنے لگا تھا۔

''جب اس کی ماں قرآن پاک پر ہاتھ نہیں رکھے گی تو عارفین کا کیا حال ہوگا۔ وہ کیا کرے گا۔''

اس نے عارفین کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا پھر اس نے تائی کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا، وہ بس سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھیں۔ عارفین نے اقصیٰ کو قرآن پاک لانے کے لیے کہا تھا۔ صبا نے اپنی امی کو دیکھا وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ آنکھیں بند کیے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔ اقصیٰ قرآن پاک لے آئی تھی۔ عارفین نے قرآن پاک ہاتھ میں لے لیا تھا۔ وہ اپنی ماں کی طرف گیا تھا۔

''امی! آپ قرآن پاک ہاتھ میں لے کر کہیں کہ آپ نے صبا اور عادل کے خلاف کوئی منصوبہ نہیں بنایا اور نہ ہی کل رات ان دونوں کو میرے کمرے میں بھیجا تھا۔''

عارفین نے قرآن پاک ماں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ صبا کے دل کی حرکت تیز ہو گئی پھر اس کا سانس رک گیا تھا۔ تائی امی قرآن پاک ہاتھ میں لے رہی تھیں۔ اس نے بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھا پھر اس نے ان کو وہی کلمات دہراتے ہوئے سنا جو عارفین نے کہے تھے انھوں نے ایک بار نہیں تین بار جھکے ہوئے سر کے ساتھ وہی کلمات دہرائے تھے۔

''اللہ!'' صبا کو لگا تھا کسی نے اس کے دل میں نیزہ گاڑ دیا تھا۔ اسے یقین تھا وہ کبھی قرآن پاک ہاتھ میں لے کر جھوٹ نہیں بولیں گی۔ اس کا یقین باطل ثابت ہوا تھا۔ اسے ان پر یقین نہیں تھا اسے قرآن پر یقین تھا۔

''کیا کوئی قرآن پر ہاتھ رکھ کر جھوٹ بولنے کی ہمت کر سکتا ہے؟'' اس نے سوچا تھا۔ ''اور اب میں بھی قرآن پاک ہاتھ میں لے کر سچ بولوں گی اور اس کمرے میں موجود ہر شخص سوچے گا دونوں میں سے ایک جھوٹا ہے اور اس نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر بھی جھوٹ ہی بولا ہے۔''

عارفین نے تائی امی سے قرآن لے لیا تھا۔ اب وہ اس کی طرف آ رہا تھا۔ ہر نظر اب اس پر جمی تھی۔ وہ رکے ہوئے سانس کے ساتھ اپنی طرف آتے دیکھتی رہی۔ عارفین کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

صبا نے تائی امی کا چہرہ دیکھا۔ کوئی ملال، کوئی رنج، کوئی پچھتاوا، اس چہرے پر کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی ماں کے چہرے کو دیکھا۔ وہاں بے چینی تھی، آنسو تھے، امید تھی، اقصیٰ دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ عارفین اس کے پاس آ گیا۔

''صبا! اب تم قرآن پاک ہاتھ میں لے کر کہو کہ تم بے گناہ ہو۔ عادل کے ساتھ وہاں اپنی مرضی سے نہیں گئی تھیں۔''

اس نے قرآن پاک کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے عارفین کا چہرہ دیکھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ عارفین نے نظر چرالی۔

''یہ لو قرآن پاک۔'' اس نے کہا تھا۔ صبا نے سر جھکا دیا اس نے ہاتھ آگے نہیں بڑھائے عارفین کا سانس رک گیا۔

''صبا! قرآن پاک پکڑو۔'' اس نے ایک بار پھر بے تابی سے کہا تھا۔ صبا نے سر اٹھایا تھا، نہ ہاتھ بڑھائے تھے۔

''صبا!'' امی کے حلق سے چیخ نکلی تھی۔ اقصیٰ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تائی امی دم بخود اسے دیکھ رہی تھیں۔ عارفین تھکے قدموں کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس نے قرآن پاک اس کی اسٹڈی ٹیبل پر رکھ دیا۔ صبا کی امی اور اقصیٰ روتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھیں۔ دونوں تایا بھی اٹھ کر کمرے سے چلے گئے تھے۔ صبا نے سر اٹھایا تھا۔

''عارفین! مجھے تم سے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے نہ میں آئندہ تم سے کوئی مطالبہ کروں گی۔ بس مجھے اپنا نام دے دو، مجھے طلاق مت دینا۔ تم دوسری شادی کرلو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''تمھیں نام کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ غرایا تھا۔

''عارفین، مجھ پر رحم کرو۔''

''تم نے مجھ پر رحم کیا تھا؟ بتاؤ تم نے مجھ پر ترس کھایا؟ پھر میں رحم کیسے کرسکتا ہوں۔ صبا کریم! میں عارفین عباس علی بقائمی ہوش وحواس تمھیں تین بار طلاق دیتا ہوں۔''

وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ تائی امی اور تایا بھی اس کے پیچھے چلے گئے تھے۔ وہ ساکت اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔

''صبا کریم! میں عارفین عباس علی بقائمی ہوش وحواس تمھیں تین بار طلاق دیتا ہوں۔''

آواز ایک بار پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اسٹڈی ٹیبل کے پاس آگئی۔ بڑی احتیاط سے اس نے قرآن پاک اٹھایا تھا۔

''کسی نہ کسی کو تو قرآن کی حرمت کا پاس رکھنا تھا پھر اگر لوگ مجھے ترک کردیتے ہیں تو اس پر میرا اختیار نہیں۔'' وہ قرآن کو سینے سے لگائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

***

''انکل! مجھے آپ سے ایک بات کہنا ہے۔'' اس دن اس نے ناشتے کی میز پر عارفین سے کہا تھا۔ ''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں اپنی امی کے گھر میں رہوں۔ وہ گھر خالی ہے پھر اس طرح آپ کو بھی یہ اعتراض نہیں ہوگا کہ میں کہیں اکیلی رہ رہی ہوں کیونکہ پاس ہی پھوپھو اور دوسرے لوگوں کے گھر ہیں۔''

عارفین اس کی بات پر حیران رہ گئے تھے۔ ''سارہ! تم کس طرح کی باتیں سوچتی رہتی ہو۔ اگر تم وہاں سے ہو آئی ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم وہاں مستقل رہنے کے بارے میں سوچنے لگو۔ آخر تمھیں اس گھر میں کیا کمی ہے۔ تم یہاں خوش کیوں نہیں ہو؟'' انھوں نے ناشتہ چھوڑ دیا تھا۔

''بات خوشی یا ناخوشی کی ہے تو پھر مجھے امی کے گھر میں رہ کر زیادہ خوشی ہوگی۔ اور پھر وہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔ میں آپ کے ہی گھر میں رہوں گی، چاہے یہاں یا وہاں۔''

''لیکن مجھے تمہارا وہاں رہنا پسند نہیں ہے اور نہ ہی میں تمھیں اس کی اجازت دوں گا۔ اگر صبا زندہ ہوتی تو وہ بھی تمھیں کبھی اس گھر میں جانے نہ دیتی۔''

وہ ان کی بات پر جھنجلا گئی تھی۔ ''کیوں آخر وہ کیوں مجھے وہاں جانے نہ دیتیں۔ ایسی کیا بات ہوئی ہے وہاں۔ ایسا کون سا کام کر دیا ہے انھوں نے کہ وہ دوبارہ کبھی اپنے گھر واپس ہی نہیں آئیں۔ حالانکہ انھیں آنا چاہیے تھا۔ انھیں دیکھنا چاہیے تھا کہ سب لوگ ان کی غلطی کو بھلا چکے ہیں انھیں معاف کر چکے ہیں۔ خاندان کی مرضی کے خلاف شادی نامناسب بات سہی لیکن اتنا بڑا جرم نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اپنے خاندان سے کٹ کر رہ جاتیں۔ انھوں نے ساری عمر مجھے بھی تنہائی کے عذاب سے دوچار رکھا لیکن اب میں سب سے ملنا چاہتی ہوں، سب کے پاس جانا چاہتی ہوں۔''

وہ پہلی بار اس طرح جذباتی ہو کر بولی تھی۔ حیدر کو اس پر ترس آیا تھا۔

''پاپا! میرا خیال ہے کہ یہ اگر اپنی امی کے گھر جانا چاہتی ہیں تو یہ کوئی ایسی نامناسب بات نہیں بلکہ میرا خیال ہے، یہاں کے بجائے ان کا وہاں رہنا زیادہ بہتر ہے۔''

''وہ اس کی حمایت میں بولا تھا مگر عارفین عباس نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

You must keep your mouth shut. It is none of your business

(تم اپنا منہ بند رکھو، تمہارا اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

حیدر کو توقع نہیں تھی کہ وہ سارہ کے سامنے اس طرح اسے جھڑک دیں گے۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ ناشتہ چھوڑ کر چلا گیا۔

''آپ مجھے بتائیں۔ آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' سارہ ہنوز اپنی بات پر قائم تھی۔

''سارہ! صبا کبھی بھی اتنی معمولی سی بات پر اس طرح ضد نہیں کرتی تھی جس طرح تم کر رہی ہو۔'' عارفین نے اس سے کہا تھا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے ان کو دیکھا تھا۔

''مگر میں بہت سے ایسے کام نہیں کروں گی جو امی نے کیے۔'' وہ اس کی بات پر چونک گئے تھے۔ سارہ نے ان کے چہرے سے نظر ہٹالی۔

''نہیں سارہ! میں تمھیں اس گھر میں کبھی رہنے نہیں دوں گا۔'' انھوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''ٹھیک ہے پھر آپ میرے نانا سے بات کریں۔ میں ان کے پاس جانا چاہتی ہوں۔'' عارفین بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئے تھے۔ وہ پہلی دفعہ اسے یوں ضد کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

''ٹھیک ہے میں تمھارے نانا سے بات کروں گا۔''

''آپ مجھے بتائیں کہ آپ کب بات کریں گے؟''

''چند دن تک۔'' وہ بے دلی سے کہہ کر ناشتے کی میز سے اٹھ گئے تھے۔

تین دن بعد ایک رات انھوں نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔

''میں نے تمہاری خالہ سے بات کی ہے۔ تھوڑی دیر میں آپریٹر دوبارہ کال ملا دے گا۔ تم ان سے بات کر لینا۔''

اسے دیکھتے ہی انھوں نے کہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن یکدم تیز ہو گئی تھی۔ پھر فون کی بیل بجنے لگی تھی۔ عارفین نے فون اٹھایا تھا اور پھر اسے تھما دیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ ریسیور پکڑا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے کسی عورت کی آواز سنی۔

''ہیلو سارہ!''

''ہیلو۔'' اس نے ایک لفظ کہا تھا اور یکدم دوسری طرف سے ہچکیوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

''میں تمہاری اقصیٰ خالہ ہوں۔ تم کیسی ہو؟'' وہ عورت روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ سارہ کا دل بھر آیا۔

''میں ٹھیک ہوں۔''

''سارہ میرا دل چاہ رہا ہے، تم میرے پاس ہوتیں اور میں تمھیں گلے لگا کر اتنا پیار کرتی۔ اتنا پیار کرتی......'' کسی نے اقصیٰ خالہ کے ہاتھ سے فون لے لیا تھا اور کوئی انھیں چپ ہو جانے کی تلقین کر رہا تھا۔ پھر اس نے فون پر کسی مرد کی آواز سنی۔

''سارہ! میں تمہارا ماموں ہوں۔ دیکھو تم پریشان مت ہونا نہ ہی کوئی فکر کرنا۔ چند دنوں تک تمہاری اقصیٰ خالہ پاکستان آئیں گی۔ تمھارے کاغذات وغیرہ تیار کروا کر وہ تمھیں اپنے ساتھ امریکہ لے آئیں گی۔''

بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں انھوں نے اس سے کہا تھا۔ کسی نے اس کی امی کا ذکر کیا تھا نہ اس کی کسی غلطی کا۔ وہ شاید سب کچھ بھلا چکے تھے۔ چند منٹ وہ اس سے گفتگو کرتے رہے تھے پھر انھوں نے اسے خدا حافظ کہا تھا۔ اقصیٰ خالہ ابھی بھی رو رہی تھیں۔ عظیم ماموں نے فون ان کے ہاتھ میں تھما دیا تھا اور انھوں نے اسی طرح روتے ہوئے اسے اپنا خیال رکھنے کی ہدایت کر کے فون بند کر دیا تھا۔

''اقصیٰ کچھ دنوں بعد پاکستان آئیں گی اور پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گی۔''

اس نے فون کا ریسیور رکھتے ہوئے عارفین عباس کو بتایا تھا۔ ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔

''سارہ کیا تم چلی جاؤ گی؟'' انھوں نے بے چینی سے اس سے پوچھا تھا۔

''انکل! میں یہاں نہیں رہ سکتی ہوں۔ مجھے اپنی Roots (بنیاد) کی طرف جانا ہے۔ وہ سب میرے اپنے ہیں، مجھے ان کی ضرورت ہے۔'' اس نے دھیمی آواز میں ان سے کہا تھا۔

''تم جانتی ہو، صبا تمھیں میرے پاس رکھنا چاہتی تھی۔''

''میں جانتی ہوں لیکن امی کو یہ اندازہ نہیں ہو گا کہ ان کے گھر والے مجھے قبول کر لیں گے۔ وہ امی کی ہر غلطی کو معاف......''

''سارہ اتنی جلدی نتائج اخذ مت کرو۔ تم جو کچھ سمجھ رہی ہو، وہ سب غلط ہے۔'' عارفین عباس نے اس کی بات کاٹ دی۔

''پھر آپ مجھے بتائیں۔ حقیقت کیا ہے؟'' اس نے ان سے پوچھا تھا۔

وہ بے قراری سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اسے ان پر بے تحاشا ترس آیا۔

''میں جانتی ہوں۔ آپ کیا چھپانا چاہتے ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کا دل کتنا بڑا ہے لیکن میں دائمی گھاؤ کی طرح آپ کے پاس رہنا نہیں چاہتی۔ میں چلی جاؤں گی تو آپ آہستہ آہستہ نارمل ہو جائیں گے۔ باقی زندگی آپ کے اور میرے لیے آسان ہو جائے گی۔ میں یہاں رہوں گی تو نہ آپ ماضی بھول سکیں گے نہ میں اپنی حیثیت۔ مجھے آپ سے محبت ہے عارفین انکل! اسی لیے میں آپ کو ہر اس ذمہ داری سے آزاد کر دینا چاہتی ہوں جو آئندہ کبھی آپ کو حیدر اور اس کے بیوی بچوں کی نظر میں شرمندہ کرے۔''

سارہ نے دل میں سوچا تھا پھر وہ نم آنکھوں کے سامنے کمرے سے چلی گئی تھی۔

عادل اس رات کے بعد دوبارہ لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ اس کے ماں باپ نے ہر جگہ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی مگر اس کا کوئی پتا نہیں چلا تھا۔ سرمد کی شادی بڑی سادگی اور افسردگی کے ماحول میں ہوئی تھی۔ سرمد کی شادی کے دوسرے دن تایا نے صبا کی امی کو ایک جگہ اس کا رشتہ طے کرنے کے بارے میں بتایا تھا۔ اس کی امی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

''اس شخص کی عمر پینتالیس پچاس کے لگ بھگ ہے اور اس کی پہلی بیوی چند ماہ پہلے فوت ہوئی ہے۔ اس کے چھ بچے ہیں۔ ایک فیکٹری میں مزدوری کرتا ہے، میں جانتا ہوں یہ کوئی اچھا رشتہ نہیں ہے۔ مگر جو کچھ تمہاری بیٹی کر چکی ہے اب وہ کسی اچھے گھرانے میں بیاہے جانے کے قابل رہی بھی نہیں۔ میں نے اس شخص کو صبا کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم جانتی ہو مجھے کسی کو دھوکے میں رکھنا نہیں آتا، وہ شخص تمہاری بیٹی کو پھر بھی قبول کرنے پر تیار ہے۔ تم دعا کرو کہ تمہاری بیٹی اس کے گھر بس جائے۔''

تایا ابا نے صبا کی امی سے کہا تھا۔ وہ منہ پر دوپٹہ رکھ کر رونے لگی تھیں۔

تیسرے روز شام کو تایا اپنے ساتھ اس شخص اور قاضی اور گواہوں کو لائے تھے۔ صبا چیخی چلائی تھی نہ اس نے مزاحمت کی تھی۔ طوفان گزر جانے کے بعد والی خاموشی اور سکون کے ساتھ اس نے نکاح نامے پر دستخط کر دیے تھے۔ پھر اسی خاموشی کے ساتھ اس نے وہ لباس پہن لیا تھا جو امی اس کے کمرے میں چھوڑ کر گئی تھیں۔

امی نے اس سے کہا تھا ''تم آج آخری دن اس گھر میں ہو، یہاں سے جو کچھ لینا چاہتی ہو لے لو، دوبارہ کبھی تمہیں یہاں نہیں آنا ہے تم ہمارے لیے مر گئیں اور ہم تمہارے لیے مر گئے۔''

''میں واقعی آج مر گئی ہوں اور مرنے والے اپنے ساتھ کچھ لے کر نہیں جایا کرتے۔ ان کی چیزیں خیرات کر دی جاتی ہیں۔ آپ بھی میرا سب کچھ اللہ کے نام پر خیرات کر دیجئے گا جیسے آپ نے مجھے کیا ہے۔''

اس نے اسی سکون سے اپنی ماں سے کہا تھا اور پھر واقعی وہ کچھ لے کر نہیں گئی تھی سوائے ان تین کپڑوں کے جو اس کے جسم پر تھے۔ وہ اپنے کمرے کی ہر چیز اسی طرح کھلی چھوڑ گئی تھی جیسے وہ پہلے پڑی ہوئی تھی۔

عارفین کو اس کی شادی کی خبر ہو گئی تھی مگر اس نے کچھ نہیں کہا تھا کہنے کو اب باقی رہ بھی کیا گیا تھا۔

''تم فکر نہ کرو عارفین! تم دیکھنا، میں تمہارے لیے کیسی پری ڈھونڈتی ہوں۔'' تائی امی نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

''نہیں امی! مجھے اب پریوں کی ضرورت نہیں رہی آپ میرے لیے کوئی لڑکی ڈھونڈنے کی کوشش نہ کریں۔''

''تو تم اب اس کے لیے کیا جوگ لے کر بیٹھو گے، کیا تم شادی ہی نہیں کرو گے؟''

''میں نے کب کہا کہ میں جوگ لے کر بیٹھوں گا یا میں شادی نہیں کروں گا، میں شادی ضرور کروں گا لیکن اپنی مرضی سے۔ آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے رکھائی سے ماں سے کہا تھا۔

''کیا ابھی بھی مرضی کی شادی کا بھوت سر سے نہیں اترا، دیکھ تو لیا ہے ایسے رشتوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔''

تائی امی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ خاموش رہا تھا، وہ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا، جانتا تھا اس کے پاس کوئی دلیل نہیں جس کی بنا پر وہ بحث کر سکے۔

چند دنوں کے بعد وہ واپس فرانس چلا گیا۔ دو ماہ بعد اس نے تایا کو اپنی شادی کی تصویروں کے ساتھ شادی کی اطلاع دی تھی۔ پورا خاندان سکتے میں آ گیا تھا، ان کے خاندان میں پہلی بار کسی نے غیر ملکی عورت سے شادی کی تھی۔ ٹریسی اس کے ساتھ اسی پاکستانی بینک میں کام کرتی تھی۔ جس میں وہ کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتی ہے۔ اس نے کچھ عرصہ اس سے ملاقاتیں کرتے رہنے کے بعد اسے پروپوز کر دیا تھا۔ ٹریسی نے فوراً اس کا پروپوزل قبول کر لیا تھا۔ شادی سے پہلے اس نے اسلام قبول کر لیا تھا اور عارفین نے اس کا نام اسماء رکھا تھا۔ اس نے اسماء کو صبا کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ اسے اپنے ماضی کے بارے میں کسی دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اسماء اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ عارفین اپنے انتخاب سے مایوس نہیں ہوا تھا۔ حیدر کی پیدائش فرانس ہی میں ہوئی تھی اور حیدر کی پیدائش کے بعد اسماء نے جاب چھوڑ دی تھی۔

عارفین کی شادی کے بعد دوسرا دھچکا تائی اور تایا کو تب لگا تھا جب عارفین کی شادی کے ایک ماہ بعد ان کی سب سے بڑی بیٹی اپنے چاروں بچوں کے ساتھ بیوہ ہو کر ان کے در پر آ گئی تھیں۔

تائی امی بالکل گم صم ہو کر رہ گئی تھیں۔ اب انھیں بہت کچھ یاد آنے لگا تھا۔ ان کی راتوں کی نیند غائب ہو گئی تھی۔ وہ ساری ساری رات بیٹھی پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہتیں۔

بڑی بیٹی کے بیوہ ہونے کے چار ماہ بعد ان کی دوسری بیٹی بھی طلاق لے کر ان کے گھر آ گئی تھی۔ اس کے شوہر نے کسی طوائف سے شادی کر لی تھی اور اس کے کہنے پر اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔

تایا کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ ان کا غصہ یکدم ختم ہو گیا تھا اور تائی امی۔ تائی امی اب سارا دن عبادت میں مصروف رہتی تھیں وہ کیا پڑھتی تھیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ کیا مانگتی تھیں۔ اللہ خوب جانتا تھا۔

صبا کی شادی کے چھ ماہ بعد اس کی امی اور بہن بھائی امریکہ چلے گئے تھے ان کے لیے اس رسوائی کا سامنا کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا جو صبا کی وجہ سے ہوئی تھی۔ صبا کی امی کو اب اقصیٰ کی شادی کرنا تھی اور وہ جانتی تھیں خاندان میں کوئی اس کا رشتہ نہیں لے گا۔ صبا کے ابو نے ان سب کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔

''پاپا آپ ڈاکٹر کے پاس گئے تھے؟'' حیدر شام کو گھر آتے ہی سیدھا باپ کے کمرے میں گیا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے عارفین کی طبیعت خراب تھی۔

''ہاں۔ میں ڈاکٹر کے پاس گیا تھا، بس بلڈ پریشر کچھ ہائی تھا۔ باقی سب کچھ ٹھیک ہے۔'' حیدر کو وہ بہت تھکے ہوئے لگے۔ وہ ان کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔

''پاپا! اگر سارہ اپنے گھر والوں کے پاس چلی جائے گی تو اس میں اتنی پریشانی والی کون سی بات ہے۔ اسے آج نہیں تو کل یہاں سے جانا ہی تھا اور جس طرح اس کی خالہ یا ماموں اس کا خیال رکھ سکتے ہیں۔ اس طرح میں یا آپ نہیں رکھ سکتے۔ پھر اتنی سی بات پر آپ نے اتنی ٹینشن کیوں لے لی ہے؟''

وہ ان کی طبیعت کی خرابی کی وجہ جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ سارہ کے جانے کی وجہ سے ٹینشن کا شکار ہیں۔ عارفین نے نیوز پیپر تہہ کر کے میز پر رکھ دیا۔

''حیدر! وہ سارہ کو دوبارہ مجھ سے ملنے نہیں دیں گے۔'' انھوں نے پہلی بار اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا۔

''کیوں ملنے نہیں دیں گے؟'' وہ حیران ہوا تھا۔

''میں جانتا ہوں۔ وہ اسے دوبارہ پاکستان میرے پاس نہیں آنے دیں گے۔ پہلے صبا چلی گئی تھی۔ اب سارہ چلی جائے گی۔ میں ساری زندگی ضمیر کی آگ میں جلتا رہوں گا۔'' عارفین عباس نے جیسے خود کلامی کی تھی۔

''پاپا! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ ان کی بات نہیں سمجھا تھا۔

''کچھ نہیں۔'' انھوں نے ایک گہری سانس لے کر چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

''پاپا! اگر سارہ دوبارہ ہم سے نہیں ملتی تو بھی کیا ہے۔ اسے ہمارے پاس رہتے تین ماہ تو ہوئے ہیں ہم دونوں پہلے بھی اکیلے رہتے تھے۔ اب بھی رہیں گے۔ اس میں پرابلم کیا ہے؟''

''پہلے کی بات اور تھی حیدر! اب مجھے اس کے جانے سے وحشت ہو رہی ہے۔ میں اس کے وجود کے بغیر اس گھر کا تصور نہیں کر سکتا میں اسے ہمیشہ کے لیے یہاں رکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ بے حد بے چین تھے۔

''پاپا! آپ اسے کبھی بھی ہمیشہ کے لیے نہیں رکھ سکتے۔ اگر آپ اسے کسی نہ کسی طرح یہاں رہنے پر مجبور کر بھی لیں تو بھی ایک نہ ایک دن تو آپ کو اس کی شادی کرنا ہی ہوگی پھر آپ کیا کریں گے۔ میں آپ کے اور صبا کے بارے میں سب نہیں جانتا ہوں جو کچھ آپ نے مجھے بتایا تھا اس کے حوالے سے میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آپ ماضی کو بھول جائیں۔ صبا مر چکی ہیں اور سارہ یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ ہمیں اس کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔'' وہ باپ کو کسی بڑے کی طرح سمجھا رہا تھا۔

''حیدر! صبا، سارہ کو میرے سپرد کر کے.....''

''ہاں وہ آپ کے سپرد کر کے گئی تھیں مگر وہ یہ بھول گئی تھیں کہ سارہ کوئی چھوٹی بچی نہیں ہے جسے ایک گارجین کی ضرورت ہوگی۔ وہ بالغ ہے۔ اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے اور ہم اسے روک نہیں سکتے۔''

عارفین نے یکدم اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ ''حیدر! ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اس سے شادی کر لو۔'' انھوں نے بڑی لجاجت سے کہا تھا وہ ان کی بات پر دم بخود رہ گیا۔

''پاپا؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں حیدر! تم اس سے شادی کر لو۔ اس طرح تو وہ یہاں رہ سکتی ہے۔''

''پاپا! میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔''

''کیوں کیا تم کسی اور لڑکی کو پسند کرتے ہو؟'' عارفین نے بے چینی سے پوچھا تھا۔

''نہیں پاپا! آپ جانتے ہیں میرا Passion (عشق) صرف میرا پروفیشن ہے۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا۔ آج بھی کہتا ہوں کہ شادی میں آپ کی پسند سے کروں گا۔ لیکن میں اس وقت شادی نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنا کیریئر بنانا ہے، ایک ٹاپ بینکر بننا ہے۔ اس اسٹیج پر شادی کر کے میں اپنا فیوچر تباہ نہیں کر سکتا۔'' اس نے بڑی رسانیت سے باپ کو سمجھایا تھا۔

''تمہارا فیوچر برباد ہوگا نہ کیریئر۔ سارہ سے شادی سے تمھیں کوئی نقصان نہیں ہوگا پھر میرا سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ تمھیں کس چیز کی فکر ہے۔ میں ہوں نا تم دونوں کو سپورٹ کرنے کے لیے۔''

''پاپا! شادی صرف میری رضامندی سے نہیں ہو سکتی۔ سارہ کا راضی ہونا بھی ضروری ہے۔ میں اگر شادی پر مان بھی جاؤں تو کیا وہ راضی ہوگی؟'' حیدر الجھن میں پڑ گیا تھا۔

''تم سارہ کی فکر مت کرو۔ میں اس سے بات کر لوں گا۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ تمھیں تو اس رشتہ پر کوئی اعتراض نہیں۔''

''حیدر ایک طویل سانس لے کر رہ گیا تھا۔''

''پاپا میں شادی ابھی نہیں کر سکتا۔ شادی تین چار سال بعد ہی کروں گا ہاں آپ انگیجمنٹ کرنا چاہتے ہیں تو وہ کر دیں مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔''

عارفین عباس کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ ''تھینک یو حیدر! تم دیکھنا سارہ بہت اچھی بیوی ثابت ہوگی۔''

حیدر کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

❁

''کوئی صبا کو بلا دو۔ خدا کے لیے کوئی ایک بار صبا کو بلا دے۔ میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لوں تاکہ میں سکون سے مر سکوں عارفین! تم ہی جاؤ۔ تم ہی اسے بلا لاؤ۔ اس سے کہو۔ مجھے آ کر جوتے مارے۔ اس سے کہو آ کر میرے منہ پر تھوکے۔ مجھے گالیاں دے کچھ تو کرے

مگر ایک بار آ جائے۔ مجھے اس عذاب سے نجات دلا دے۔ اس سے کہو اللہ کے نام پر مجھے معاف کردے۔ ایک بار کہہ دے کہ اس نے مجھے معاف کیا۔ عارفین! ایک دفعہ اسے لے آؤ۔ خدا کے لیے ایک بار......''

تائی امی تکلیف کی شدت سے اپنی بات مکمل نہیں کر پائی تھیں۔ وہ کراہنے لگی تھیں پھر وہ پہلے کی طرح غشی میں چلی گئیں۔ وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

''عارفین! تم صبا کو لینے جاؤ۔ وہ کسی کے جانے پر نہیں آ رہی۔ وہ دروازہ بند کر لیتی ہے۔ وہ نہیں آئے گی تو تمہاری یماں اسی جاں کنی کے عالم میں رہے گی۔ اسے اب صحت یاب نہیں ہونا ہے۔ بہتر ہے وہ مر جائے تاکہ اس تکلیف سے اس کی جان چھوٹ جائے لیکن صبا نہیں آئے گی تو وہ اسی عذاب میں رہے گی۔ تم جاؤ تمہارے...... تمہارے کہنے پر وہ آ جائے گی۔''

اسے اپنی پشت پر باپ کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر خالی نظروں سے صحن کو دیکھا باہر سکوت تھا۔ اندر سے ایک بار پھر اس کی ماں کے کراہنے کی آواز آنے لگی تھی۔ وہ ایک دن پہلے تین سال بعد پاکستان آیا تھا۔ تایا نے اسے اس کی ماں کی بیماری کی اطلاع دی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ اس کا کینسر آخری اسٹیج پر ہے اور اب بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ پچھلے دو سال سے بیمار تھیں اور وہ اس بات سے لاعلم نہیں تھا لیکن وہ خود آنے کے بجائے ایک لمبی چوڑی رقم بھیج دیتا تھا مگر اب اسے آنا ہی پڑا تھا، وہ اسماء اور حیدر کو بھی ساتھ لایا تھا تاکہ امی مرنے سے پہلے انھیں دیکھ سکیں اور یہاں پر اس کے لیے شاک موجود تھا۔

تین ماہ پہلے تائی امی نے اس بات کا اقرار کر لیا تھا کہ انھوں نے قرآن پر جھوٹا حلف اٹھایا تھا اور انھوں نے صبا کو جان بوجھ کر اس منصوبے کا شکار بنایا تھا۔

عادل ڈیڑھ سال پہلے گھر آ گیا تھا اور تین سال مجرموں کی طرح گزارنے کے بعد تائی نے اس سے اور اس کے ماں باپ سے معافی مانگ لی تھی۔ شاید وہ معاف نہ کرتے مگر تائی کی حالت اب بیماری کی وجہ سے اتنی خراب ہو چکی تھی کہ انھوں نے دل پر پتھر رکھتے ہوئے انھیں معاف کر دیا تھا اور پھر صبا کی تلاش شروع ہوئی تھی اور تب تایا کو پتا چلا تھا کہ اس کا شوہر صبا کی بیٹی کو اپنی اولاد ماننے پر تیار نہیں تھا اور اس نے سارہ کی پیدائش سے چھ ماہ پہلے ہی اسے طلاق دے دی تھی۔

''میں نے صبا کے بارے میں تمھیں سب کچھ اس لیے بتایا ہے تاکہ تم کل کو یہ نہ کہہ سکو کہ ہم نے تمھیں کوئی دھوکا دیا۔'' تایا کو یاد آیا تھا انھوں نے شادی سے پہلے صبا کے شوہر سے یہ سب کہا تھا۔ انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے گھر کی بنیاد پانی پر رکھی تھی۔

''ایک تہمت میری بیوی نے لگائی۔ دوسری تہمت کا حصہ دار میں بن گیا؟'' وہ لرز کر رہ گئے تھے۔

چند ہفتوں کی تلاش کے بعد وہ صبا تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ کسی ہاسپٹل کے رہائشی علاقے میں کسی ڈاکٹر کے ہاں کام کرتی تھی مگر صبا نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر وہ اس علاقے میں گئے تھے جہاں وہ رہتی تھی مگر اس نے ان کی آواز پہچان کر دروازہ نہیں کھولا تھا۔ وہ دیر تک دروازہ بجاتے، اسے آوازیں دیتے رہے مگر گھر کے اندر مکمل خاموشی رہی تھی۔ وہ تھک ہار کر لوٹ آئے تھے۔ اس نے یہ سلوک صرف

ان ہی کے ساتھ نہیں کیا تھا بلکہ جو بھی اس کے پاس گیا تھا اس نے اس کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا۔ عارفین سب کچھ جان کر سکتے میں رہ گیا تھا۔

''میں بے قصور ہوں۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا مگر میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔''

''میں سچ بولتی ہوں۔ تمہیں اعتبار نہیں آتا۔ میں جھوٹ بولوں گی تم یقین کر لو گے۔ تم پہلے ہی دوسروں کی باتوں پر یقین کر چکے ہو۔ مجھ سے تو تم صرف تصدیق چاہتے ہو۔''

''اللہ دلوں میں بستا ہے تم اپنے دل سے پوچھو، میں بے گناہ ہوں یا نہیں۔''

ایک آواز اس کی سماعتوں میں رقص کرنے لگی تھی۔ وہ آواز کا گلا نہیں گھونٹ سکتا تھا، وہ بستر مرگ پر پڑی ہوئی ماں کو کھلے عام ملامت بھی نہیں کر سکتا تھا اور اسے صبا کے سامنے بھی جانا تھا۔

ہم دیکھیں گے۔

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے۔

ہم دیکھیں گے۔

وہ دن کہ جس کا وعدہ تھا۔

ہم دیکھیں گے۔

چچا کے گھر ریڈیو پر مغنیہ بلند آواز میں گا رہی تھی۔

''عارفین! تم جاؤ گے نا؟'' اسے باپ کی آواز سنائی دی تھی، اس نے بے بسی سے ہونٹ بھینچ لیے۔

''حیدر سے شادی!'' وہ عارفین عباس کی بات پر دم بخود رہ گئی تھی۔

''ہاں، وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' عارفین عباس نے اپنی بات دہرائی تھی۔ اسے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے ٹھیک سنا تھا۔

''انکل! مجھ سے کیوں؟'' اس نے اپنی حیرت پر قابو پا کر کہا تھا۔

''تم سے کیوں نہیں؟'' انھوں نے جواباً سوال کیا تھا۔

''انکل! میرا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ یہ رشتہ مناسب نہیں ہے۔'' اس نے دیانت داری سے اپنی رائے دی تھی۔

''اس میں کیا کمی ہے؟'' انھوں نے بے چینی سے پوچھا تھا۔

''اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔ مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں۔''

''سارہ! تم میں کوئی کمی نہیں ہے۔ تم خوبصورت ہو تعلیم یافتہ ہو۔ سمجھدار ہو۔ کسی بھی مرد کو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے۔'' انھوں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔

''لیکن وہ ان چیزوں میں مجھ سے بہتر ہے اور میں نے اس کے بارے میں کبھی اس انداز سے نہیں سوچا۔''

''تو اب سوچ لو۔''

سارہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا یہ پرپوزل اتنا اچانک اس کے سامنے آ گیا تھا کہ وہ کچھ سوچ ہی نہیں پا رہی تھی۔ عارفین اٹھ کر چلے گئے تھے۔ رات کے کھانے پر وہ بے حد نروس رہی۔ حیدر معمول کی طرح باپ سے باتیں کرتے ہوئے کھانا کھا رہا تھا لیکن اس کا دل کھانے سے بری طرح اچاٹ ہو گیا تھا۔ تین ماہ میں پہلی بار وہ اس پر نظر ڈالنے سے گریزاں تھی۔ عارفین عباس جب کھانے کی میز سے اٹھ گئے تو اس نے سارہ کو مخاطب کیا تھا۔

''سارہ! اگر مائنڈ نہ کریں تو کل شام میں آپ کو ڈنر پر لے جانا چاہتا ہوں۔ مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' وہ کوئی جواب دیے بغیر سر جھکائے نروس سی بیٹھی رہی۔ وہ کچھ دیر اس کے جواب کا منتظر رہا۔

''آپ پانچ بجے تیار رہیے گا۔'' اس نے خود ہی کہا تھا اور پھر اوپر چلا گیا تھا۔

اگلی شام پانچ بجے ملازم نے اس کے دروازے پر دستک دی تھی۔

''حیدر صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔'' اس نے سارہ کو اطلاع دی تھی۔

''میں ابھی آتی ہوں۔'' اس نے جوتے کے اسٹریپس بند کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ جوتا پہننے کے بعد لاؤنج میں آ گئی۔ حیدر صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

''چلیں؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''آپ نے انکل کو بتا دیا؟''

وہ اس کے سوال پر مسکرایا تھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے کیا میں پاپا کی اجازت کے بغیر آپ کو کہیں لے جا سکتا ہوں، آپ پریشان نہ ہوں میں نے ان سے اجازت لے کر آپ کو ڈنر کی دعوت دی تھی۔'' وہ پورچ کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''میرے بارے میں آپ زیادہ نہیں جانتی ہوں گی۔ اس لیے بہتر ہے میں اپنے بارے میں آپ کی کچھ بنیادی معلومات دے دوں۔'' مین روڈ پر گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے بات شروع کی تھی۔

''یہ تو آپ کے علم میں ہوگا کہ میری مدر فرنچ تھیں۔ میری پیدائش بھی وہیں ہوئی۔ بارہ سال تک میں وہیں رہا تھا پھر پاپا نے پاکستان میں پوسٹنگ کروالی تو ہم لوگ یہاں آ گئے۔ میں نے اے لیول یہاں سے کیا اس کے بعد میں لندن چلا گیا، وہاں میں نے بزنس مینجمنٹ میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ انٹرن شپ کے تحت ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتا رہا پھر پاکستان آ کر سٹی بینک جوائن کر لیا۔ پاکستان آئے مجھے صرف چھ ماہ ہوئے ہیں یعنی آپ کے آنے سے تقریباً تین ماہ پہلے میں واپس آیا تھا۔ میری ممی صرف نام کی فرنچ تھیں۔ پاپا سے شادی کے بعد اور اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے انھوں نے ایسٹرن طور طریقے اپنا لیے تھے۔ اصل میں میری ممی کا تعلق جس خاندان سے تھا وہ کافی کنزرویٹو تھا۔ اس وجہ سے بھی ممی کو پاکستانی ماحول میں ایڈجسٹ کرنے میں کوئی پرابلم نہیں ہوا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا انھیں کبھی مغربی لباس میں نہیں دیکھا۔ وہ یا تو شلوار قمیص پہنتی تھیں یا پھر ساڑھی، میں آپ کو یہ سب اس لیے بتا رہا ہوں تا کہ آپ پر یہ واضح ہو جائے کہ میں صرف شکل وصورت سے یورپین لگتا ہوں ورنہ میں سوچ کے لحاظ سے بالکل ایسٹرن ہوں۔ باہر رہنے کے باوجود بعض چیزوں کے بارے میں میں بہت لبرل نہیں ہوں۔ میری اپنی ویلیوز ہیں اور میں ان کو تسلیم کرتا ہوں۔ میں بہت سوشل بھی نہیں ہوں۔ میری کمپنی بہت محدود ہے۔ آپ کہہ سکتی ہیں کہ میں سوسائٹی میں موو کرنے کے اعتبار سے خاصا ریزرو ہوں۔ کوایجوکیشن میں پڑھنے کے باوجود مجھے لڑکیوں کی کمپنی کچھ زیادہ پسند نہیں ہے نہ ہی کبھی میری کسی لڑکی سے زیادہ دوستی رہی ہے میری واحد دلچسپی بینکنگ ہے بلکہ آپ کہہ سکتی ہیں یہ میرا واحد شوق ہے۔ ہاں اسپورٹس کا بھی میں شوقین ہوں نہ صرف کھیلنے بلکہ دیکھنے کا بھی۔ آپ کے بارے میں کچھ عرصہ پہلے تک میری کوئی رائے نہیں تھی۔ میرے لیے آپ بس ایک مہمان تھیں اور میں نے آپ کے بارے میں کبھی بھی اس سے زیادہ نہیں سوچا، میں ایسا سوچنا کبھی پسند کرتا بھی نہیں کیونکہ آپ ایک لڑکی تھیں۔ میرے گھر میں تھیں اور مجھ پر یہ فرض تھا کہ میں آپ کی عزت کروں۔ آپ کو اپنے گھر میں حفاظت سے رکھوں۔ پھر اس کے بعد پاپا سے آپ کی گفتگو سے آپ کے خیالات کا پتا چلا۔ میرے دل میں آپ کی عزت کچھ اور بڑھ گئی چند دن پہلے پاپا نے مجھ سے آپ کے پرپوزل کے حوالے سے بات کی، میں نے اس پر غور کیا اور مجھے لگا کہ آپ ایک بہت اچھی بیوی ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس لیے میں نے پاپا سے کہا کہ مجھے آپ سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔ پاپا نے اس سلسلے میں آپ سے بات کی۔ آپ نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے یہ ضروری سمجھا کہ آپ کو کسی بھی فیصلے سے پہلے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں تا کہ آپ کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ مجھے آپ کے بارے میں تقریباً سب کچھ پتا ہے یا کم از کم اندازہ ضرور ہے یہ بھی پتا ہے کہ آپ عمر میں مجھ سے کچھ ماہ بڑی ہیں۔ مجھے آپ کی کسی بات یا ماضی کے کسی حوالے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ جانتی ہیں۔ پاپا آپ کی امی کو پسند کرتے تھے۔ ان دونوں کی شادی نہیں ہو پائی۔ اب ان کی بھی یہ خواہش ہے کہ آپ کی شادی مجھ سے ہو جائے۔ وہ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ اسی

گھر میں رہیں لیکن آپ کو کچھ اعتراضات تھے جو بڑی حد تک ٹھیک تھے اس پرپوزل کو قبول کرنے کے بعد کم از کم آپ یہ نہیں کہہ سکیں گی کہ آپ کو میرے گھر میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں بہت زیادہ امیر نہیں ہوں ابھی میں نے اپنا کیریئر شروع کیا ہے لیکن میرا خیال ہے میرے پاس اتنے روپے ضرور ہیں کہ میں آسانی سے آپ کو سپورٹ کر سکوں۔ ہاں جب میں کچھ عرصہ کے بعد اپنا کیریئر اسٹیبلش کر لوں گا تو پھر ایک اچھے شوہر کی طرح کوشش کروں گا کہ آپ کو سب کچھ دے سکوں۔ فی الحال میں خود بھی پاپا کے گھر میں رہتا ہوں۔ یہ گاڑی بھی انھوں نے خرید کر دی ہے۔ اس لحاظ سے مالی طور پر میرے حالات بھی آپ جیسے ہی ہیں۔ اگر آپ میرا پرپوزل قبول کر لیتی ہیں تو فی الحال ہماری انگیجمنٹ ہو جائے گی پھر چند سال بعد میں آپ سے شادی کر لوں گا۔ اس وقت جب کم از کم میرے پاس اپنے روپے سے خریدی ہوئی گاڑی ہو گی۔‘‘

وہ اس کے چہرے پر نظر ڈالے بغیر دھیمے لہجے میں سارہ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتاتا گیا تھا۔ اس کے انداز میں کوئی تفاخر، کوئی احساس برتری نہیں تھا۔ سارہ کو اس سے ایک عجیب سی مانوسیت کا احساس ہوا۔ وہ چند گھنٹے پہلے ایک پیڈسٹل پر بیٹھا نظر آتا تھا اور اب وہ یکدم جیسے زمین پر اتر آیا تھا۔ اس نے اس کے سیاہ بالوں میں کہیں کہیں نظر آنے والے کافی کلرڈ بالوں کے Patches کو ایک بار پھر اسی انہماک سے دیکھا تھا جیسے وہ اکثر دیکھا کرتی تھی۔ اس کے بالوں کی طرح اس کی شخصیت بھی عجیب تھی۔

’’اب اگر میں آپ سے کہوں کہ کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی تو آپ کیا کہیں گی؟‘‘

سارہ نے گردن گھما کر اس کے چہرے کو دیکھا تھا، وہ بے حد پرسکون نظر آ رہا تھا۔

’’ہاں!‘‘ وہ سمجھ نہیں پائی۔ اس کی زبان سے یہ لفظ کیسے پھسل پڑا تھا۔

حیدر کے چہرے پر ایک خوبصورت مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ ’’تھینک یو۔‘‘

اس نے کہا تھا پھر وہ اسے ایک ریسٹورنٹ میں لے گیا تھا۔ سارہ نہیں جانتی اس کی باتوں میں کیا جادو تھا۔ کیا خاص بات تھی مگر اسے اس سے کوئی گھبراہٹ، کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس سے مختلف موضوعات پر اس طرح باتیں کرتا رہا تھا جیسے وہ اکثر اسے باہر لے جاتا رہا ہو، اکثر اس سے گفتگو کرتا رہا ہو۔ اس کے انداز میں وہ بے تکلفی تھی جو اپنے باپ سے بات کرتے وقت ہوتی تھی۔ وہ شام سارہ کی زندگی کی بہترین شام تھی۔ اس رات واپس پر سونے سے پہلے جو واحد تصور اس کے ذہن میں تھا وہ حیدر کا تھا۔

تیسرے روز شام کو ایک سادہ سی تقریب میں عارفین عباس نے باقاعدہ طور پر ان دونوں کی منگنی کر دی تھی۔ منگنی میں صرف عارفین کی بہنیں اور خاندان کے چند بزرگ شریک ہوئے تھے۔ سارہ چاہتی تھی کہ منگنی اقصیٰ خالہ کے پاکستان آنے کے بعد ہو مگر عارفین کا اصرار تھا کہ یہ کام جلد از جلد ہو جانا چاہیے اور اقصیٰ نے ابھی اپنے آنے کی تاریخ نہیں بتائی، اس لیے بہتر ہے یہ چھوٹی سی رسم ان کی غیر موجودگی میں ہی سرانجام پا جائے۔ سارہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی بات مان گئی تھی۔ عارفین نے اسے فون پر اقصیٰ کو یہ بات بتانے سے منع کر دیا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ اس بات سے ہرٹ ہوں گی کہ ان کی مرضی پوچھے بغیر سارہ کی منگنی کر دی گئی ہے اور ان کی آمد کا انتظار بھی نہیں کیا گیا۔

’’جب وہ یہاں آئے گی تو میں خود اسے سمجھا دوں گا لیکن فی الحال تم اس سے اس منگنی کا ذکر نہ کرنا۔‘‘

انھوں نے سارہ کو ہدایت دی تھی۔ سارہ نے ان کی بات بخوشی مان لی تھی۔ منگنی کے تین چار دن بعد ایک دن اقصیٰ نے اسے اپنے آنے کی اطلاع دی تھی۔ وہ تین دن بعد پاکستان آ رہی تھیں۔

وہ اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ زرد رنگت، سیاہ حلقوں میں دھنسی ہوئی آنکھوں اور ابھری ہڈیوں والا وہ چہرہ صبا کا چہرہ نہیں ہو سکتا تھا مگر وہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ چمک نہیں تھی جو اسے مسحور کر دیتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے لگا تھا اس کا پورا وجود پانی بن کر بہنے لگا ہو۔ وہ گھر پر نہیں تھی اور وہ شام تک اس کے دروازے پر کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا تھا پھر وہ آ گئی تھی۔ گود میں ایک چھوٹی بچی کو اٹھائے جسم کو ایک کالی چادر میں چھپائے اس نے دروازے پر اسے دیکھ لیا تھا۔ ایک نظر ڈالنے کے بعد اس نے دوبارہ اس پر نظر نہیں ڈالی تھی۔

''صبا! میں تمھیں لینے آیا ہوں۔''

اسے لگا تھا یہ جملہ بولتے ہوئے اس کے حلق میں کتنے ہی کانٹے چبھ گئے تھے۔ وہ خاموش رہی تھی اپنی بچی کو اس نے دہلیز پر بٹھا دیا اور ایک چابی سے تالا کھولنے لگی۔

''صبا! کیا مجھے معاف کر دو گی؟''

تالا کھل گیا تھا۔ اس نے اپنی بچی کو اٹھایا اور دروازہ کھول کر اندر جانے لگی۔

''صبا! میری بات کا جواب دو۔'' عارفین نے دروازہ پکڑ لیا تھا۔

''اندر آ جاؤ یہاں تماشا نہ بناؤ۔'' وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر چلی گئی تھی۔ وہ اس کے پیچھے اندر آ گیا تھا۔ اس نے اندر جا کر لائٹ آن کی تھی اور اپنی بچی کو ایک چارپائی پر بٹھا دیا۔

''کہو کیا چاہتے ہو اب مجھ سے؟'' وہ خود کھڑی رہی تھی۔

''صبا! مجھے معاف......''

''میں نے معاف کیا اور؟'' صبا نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''کیا تم ایک بار میری ماں سے مل سکتی ہو؟ وہ بہت بیمار ہیں، تم سے معافی مانگنا چاہتی ہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ وہ اب زیادہ دن زندہ نہیں رہیں گی۔''

اسے بات کرتے کرتے احساس ہوا، وہ اس پر نظر جمائے کھڑی تھی، اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ وہ بات کرتے کرتے چپ ہو گیا۔ اسے یاد آ گیا تھا۔ طلاق دیتے وقت بھی وہ اسے اسی طرح دیکھ رہی تھی۔

''صبا! جو میں نے تمھارے ساتھ کیا، وہ تم میرے ساتھ مت کرنا۔'' وہ آہستہ سے گڑگڑایا تھا۔

''میں آ جاؤں گی، اب تم جاؤ۔'' وہ اپنی بچی کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔

عارفین کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے حلق پر پاؤں رکھ کر زور زور سے پیر دبانا شروع کر دیا تھا۔

''صبا تم چیخو چلاؤ۔ مجھے گالیاں دو۔ کہو میں نہیں آؤں گی۔ تمہاری ماں مرتی ہے تو مر جائے۔ میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔ مجھے کچھ تو کہو مگر یوں میری بات نہ مانو۔''

وہ نہیں جانتا۔ اسے کیا ہوا تھا۔ بس وہ بلک بلک کر رونے لگا تھا۔ وہ چپ رہی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کو گود میں بٹھا لیا تھا۔ عارفین کو یاد تھا وہ چھوٹی چھوٹی بات پر رو پڑتی تھی۔ ذرا سی بات پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ آج اسے کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس طرح اسے دیکھ رہی تھی جیسے اسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ وہ کتنی ہی دیر روتا رہا تھا پھر آستینوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے وہاں سے آ گیا تھا۔

وہ دوسرے دن سہ پہر کو آئی تھی۔ عارفین ماں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ تائی امی کراہ رہی تھی۔ اس نے اسے دروازے پر کھڑے دیکھ لیا تھا۔ وہ کل کی طرح آج بھی اپنی بیٹی کو اٹھائے ہوئے تھی۔

تایا ابا نے اسے دیکھا تو بے اختیار اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ''صبا! آؤ اندر آؤ۔''

وہ اندر آ گئی تھی۔ تایا نے اسے گلے لگانا چاہا تھا۔ اس نے بڑے سکون سے انہیں ہاتھ سے روک دیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

عارفین نے اسے کہتے سنا تھا۔ پتا نہیں کس طرح سب گھروں میں اس کے آنے کی خبر ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کے پیچھے لوگ آنے لگے تھے۔ کمرہ لوگوں سے بھرنے لگا تھا۔

''امی! صبا آئی ہے۔'' عارفین نے ماں کو اطلاع دی تھی۔ وہ ماں کے پاس اٹھ گیا۔

''کہاں ہے صبا؟ کہاں ہے وہ؟ اسے میرے سامنے لاؤ۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں اسے۔'' تائی نے اٹھنے کی جدوجہد شروع کر دی تھی لیکن ان سے اٹھا نہیں گیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی تھی تائی نے اسے دیکھ لیا تھا۔ یکدم وہ خاموش ہو گئی تھیں لیکن ان کا جسم لرز رہا تھا، ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر سب نے دیکھا تھا انھوں نے آہستہ آہستہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ میں اس کے آگے جوڑ دیے تھے۔ صبا نے بڑے سکون سے ان کے جڑے ہوئے ہاتھ کھول دیے تھے۔

''میں نے آپ کو معاف کیا۔ میرے دل میں آپ کے خلاف کچھ نہیں ہے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ تائی امی نے یکدم بچوں کی طرح بلک بلک کر رونا شروع کر دیا تھا۔

''میں نے تم پر بہت ظلم......'' تایا آگے آ گئے تھے۔ صبا نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

''میں نے آپ کو بھی معاف کیا۔ میں نے سب کو معاف کیا۔'' اس نے کہا تھا اور پھر وہ اپنی بچی کو اٹھائے دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''صبا! تم کہیں مت جاؤ۔ تم ہمارے پاس رہو۔ اپنے گھر آ جاؤ۔'' چھوٹے تایا نے اسے روکنا چاہا تھا۔

''تایا! مجھے رہنے کے لیے گھر نہیں جگہ چاہیے، وہ میرے پاس ہے۔'' وہ رکی نہیں تھی پھر ہر ایک نے اسے روکنا چاہا تھا۔ تایا اب روتے ہوئے اس کے پیچھے دروازے تک گئے تھے مگر وہ نہیں ٹھہری تھی۔ جس خاموشی سے اور سکون کے ساتھ وہ آئی تھی۔ اسی خاموشی اور سکون کے ساتھ چلی گئی تھی۔

٭

''عارفین! یہ سب نہیں ہوگا۔ کم از کم میری زندگی میں نہیں ہوگا۔ میں تاریخ کو اپنے آپ کو دہرانے نہیں دوں گی۔ تم ہوتے کون ہو اپنے بیٹے کے ساتھ سارہ کی منگنی کرنے والے؟''

اقصیٰ، عارفین سے یہ سنتے ہی غضب ناک ہوگئی تھیں کہ اس نے سارہ کی منگنی حیدر سے کردی ہے۔ وہ آج ہی پاکستان آئی تھیں اور آتے ہی سارہ سے ملنے کے لیے عارفین کے ہاں گئی تھیں اگر سارہ وہاں نہ ہوتی تو وہ کبھی عارفین کے ہاں نہ جاتیں۔ دل میں کچھ ایسی ہی دراڑیں پڑ چکی تھیں۔ سارہ سے ملانے کے بعد عارفین ان سے کوئی ضروری بات کرنے کے لیے اپنے کمرے میں لے آئے تھے اور وہاں انھوں نے سارہ کی منگنی کا انکشاف کردیا تھا۔

''اقصیٰ! جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ۔ جو غلطی مجھ سے ہوئی ہے میں اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں پھر صبا خود سارہ کو میرے حوالے کر کے گئی ہے۔''

عارفین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''ہر غلطی کا ازالہ نہیں کیا جاسکتا اور تم لوگوں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ تم لوگوں نے گناہ کیا تھا۔ مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ صبا اسے تمھارے سپرد کر کے گئی تھی۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ اس کی سادگی کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ اسے بار بار اعتبار کرنے کی عادت تھی۔ اسے بار بار معاف کرنے کی عادت تھی اور اسی عادت نے اسے اس عمر میں قبر میں پہنچا دیا۔ مجھ میں یہ دونوں عادتیں نہیں ہیں اور میں سارہ کے ساتھ وہ سب نہیں ہونے دوں گی جو آپی کے ساتھ ہوا۔''

''اقصیٰ! تم جانتی ہو، جو کچھ ہوا۔ اس میں میرا قصور بہت کم تھا پھر بھی......''

''کم تھا یا زیادہ تھا۔ تمہارا قصور تھا مگر صبا کا تو کوئی قصور نہیں تھا پھر اس نے کس جرم کی سزا کاٹی۔ نہیں عارفین! میں سارہ کو تمھارے خاندان میں نہیں آنے دوں گی۔''

''اقصیٰ! یہ منگنی صرف حیدر کی مرضی سے نہیں ہو رہی، اس میں سارہ کی پسند بھی شامل ہے۔ تم یہ رشتہ توڑ کر اسے تکلیف پہنچاؤ گی۔''

عارفین اقصیٰ کے سامنے بے بس نظر آ رہے تھے۔

''سارہ کی پسند...... سارہ کو ماضی کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہوگا ورنہ وہ تمھارے بیٹے پر تھوکنا بھی پسند نہ کرتی۔'' اقصیٰ کے لہجے کا زہر بڑھتا ہی گیا تھا۔

عارفین نے سر جھکا لیا۔ ''میں اسے سب کچھ بتا دوں گی پھر وہ خود یہ رشتہ توڑ کر جائے گی۔''

''اقصیٰ! یہ مت کرنا۔ صبا نے اس سے سب کچھ چھپا کر رکھا ہے پھر تمھیں کیا حق پہنچتا ہے اس سے کچھ کہنے کا۔ تم فرنچ نہیں جانتی ہو لیکن یہ خط کسی سے پڑھوا لو، دیکھو اس میں کیا لکھا ہے۔ سارہ کو اپنے پاس رکھ لینا۔ اسے میرے خاندان کے پاس مت بھیجنا۔ ماضی دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اس کا خیال رکھنا۔'' یہ سب میں نے نہیں لکھا۔ اس نے لکھا ہے اقصیٰ! یہ یاد رکھو، وہ مجھے اور میرے گھر والوں کو معاف کر چکی تھی لیکن اس نے تم لوگوں کو معاف نہیں کیا تھا جو کچھ میرے خاندان نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ تم سب نے بھی وہی کیا تھا۔ تم لوگوں نے بھی اس پر یقین نہیں کیا تھا۔ اگر اس کی زندگی برباد ہوئی تو اس میں تم لوگوں کا بھی حصہ ہے۔ کیوں اس کی شادی ہونے دی؟ کیوں نہیں اسے بچایا؟ کیوں اسے تباہ ہونے دیا۔'' عارفین بھی بگڑ گئے تھے۔

''اقصیٰ! اب ماضی کو ماضی ہی رہنے دو۔ سارہ کو پچھلے چوبیس سال سے کچھ نہیں ملا۔ اب اگر اسے کچھ مل رہا ہے تو اسے اس سے مت چھینو۔ اسے صبا کا ماضی بتا کر تم باقی زندگی کے لیے رلاتی رہو گی یہ سب مت کرو۔'' اقصیٰ اس کی بات پر خاموش ہو گئی تھیں۔

''سارہ! تم نے مجھے فون پر نہیں بتایا کہ تمھاری منگنی ہو گئی ہے؟'' عارفین کے کمرے سے نکل کر واپس جاتے ہوئے اقصیٰ نے سارہ سے پوچھا تھا وہ اس سوال پر اس کے چہرے پر پھیلتی ہوئی دھنک دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔

''میں بتانا چاہتی تھی لیکن عارفین انکل نے منع کر دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ وہ خود آپ کو یہ سب بتائیں گے۔ میں تو منگنی بھی آپ کے پاکستان آنے کے بعد ہی کرنا چاہتی تھی لیکن عارفین انکل کو جلدی تھی۔'' اس نے کچھ جھینپتے ہوئے کہا۔

اقصیٰ نے عارفین کو دیکھا تھا۔ وہ نظر چرا گئے تھے۔

''تم حیدر کو پسند کرتی ہو؟'' انھوں نے اس سے پوچھا تھا۔ وہ مزید جھینپ گئی تھی اس کے چہرے پر پھیلتی شفق نے اقصیٰ کا چہرہ تاریک کر دیا تھا۔

''انھیں یاد آیا تھا، عارفین کے ذکر پر صبا بھی اسی طرح گلابی پڑ جاتی تھی۔ اس کی جھینپی ہوئی مسکراہٹ نے اقصیٰ کو بے اختیار صبا کی یاد دلائی تھی۔

''شادی کب کرو گے؟'' اقصیٰ نے عارفین سے پوچھا تھا۔

''چند سال بعد۔''

''ٹھیک ہے اتنے سال سارہ میرے پاس رہے گی۔''

''نہیں اقصیٰ! سارہ یہیں رہے گی۔'' عارفین اس کی بات پر کچھ پریشان ہو گئے تھے۔

''شادی سے پہلے یہاں کس حیثیت سے رہے گی؟''

''جیسے پہلے رہ رہی تھی۔''

''پہلے کی بات اور تھی۔اب حیدر سے منگنی کے بعد تو اس کے یہاں رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔تم یا تو اسے میرے ساتھ جانے دو یا پھر باقاعدہ اس کی شادی کروا کر اسے اپنے گھر لاؤ۔''

اقصیٰ نے وہیں پورچ میں کھڑے کھڑے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔سارہ اقصیٰ کی ضد پر دم بخود ہو گئی تھی۔عارفین بھی خاموش تھے۔

''ٹھیک ہے۔میں حیدر سے بات کرتا ہوں اور پھر کل تمھیں بتا دوں گا۔'' انھوں نے اقصیٰ سے کہا تھا۔

''سارہ تم اپنا سامان پیک کر لینا۔کل میں تمھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔'' اقصیٰ نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

''اقصیٰ! تم ہوٹل میں رہنے کے بجائے یہاں آسکتی ہو یا پھر اپنے گھر جا سکتی ہو۔وہ ابھی بھی خالی ہے۔'' عارفین نے اقصیٰ کو آفر کی تھی انھوں نے چند لمحے اس پر سوچا تھا۔

''ٹھیک ہے۔میں اپنے گھر میں رہوں گی۔'' انھوں نے تھکے ہوئے لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا تھا۔

''میں آپا کو اطلاع دے دوں گا۔تم جب چاہے وہاں چلی جانا۔'' عارفین اسے گاڑی تک چھوڑنے آئے تھے۔

........✿........

''صبا! اس طرح اپنی زندگی برباد نہ کرو۔یہاں سے چلو، تم اس طرح ٹھوکریں کھانے کے لیے نہیں بنائی گئی ہو، میں نے فون پر چچا سے بات کی ہے انھیں سب کچھ بتا دیا ہے وہ اگلے ہفتے پاکستان آرہے ہیں اگر ہمارے ساتھ نہیں تو ان کے ساتھ چلی جاؤ مگر اس طرح دھکے نہیں کھاؤ۔''

وہ اپنی ماں کے مرنے کے چھ دن بعد ایک بار پھر اس کے پاس گیا تھا۔

''یہ میری زندگی ہے۔میں جیسے چاہوں گی، اسے گزاروں گی۔'' وہ آج بھی اسی طرح سرد تھی۔

''تم اس طرح زندگی گزارو گی تو ہم میں سے کوئی بھی سکون سے نہیں رہ سکے گا۔''

''سب سکون سے ہیں۔سب خوش ہیں۔کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔بس ایک مجھے برباد کرنا تھا۔سو سب نے مل کر کر لیا۔'' عارفین نے اس کی زبان پر شکوہ سن لیا تھا۔

''تم برباد نہیں ہوگی صبا! میں تم سے شادی کروں گا۔سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' عارفین نے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی۔

''اور اسماء اور حیدر، ان کا کیا ہوگا؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا تھا۔

''اسماء مان جائے گی۔وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور جانتی ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' عارفین نے بڑے یقین سے کہا تھا۔

''مجھے لوگوں کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچنا نہیں آتا۔ایسا کر بھی لوں تو مجھے اس پر پیر جمانا نہیں آئے گا۔تم نے تین سال پہلے مجھے گندگی سمجھ کر جھٹک دیا تھا۔مجھے آج بھی اپنا وجود گندگی ہی لگتا ہے۔تم ایک اچھی زندگی گزار رہے ہو۔گزارو۔مجھے دوسروں کی چادر کھینچ کر اپنا وجود ڈھانپنا نہیں آتا۔''

وہ ابھی بھی وہی صبا تھی۔تین سال پہلے والی۔ظاہر بدل گیا تھا۔باطن کیسے بدل جاتا۔

''ٹھیک ہے...... مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں نہ کرو، اپنے ماں باپ کے پاس چلی جاؤ، اپنا نہیں تو سارہ کا ہی سوچو۔'' عارفین نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''اسی کا تو خیال ہے مجھے اب۔ میرا دل اپنے گھر والوں کے پاس جانے کو نہیں چاہتا۔ وہ مجھے قبول کر لیں گے۔ سارہ کو نہیں۔ یہ انہیں بوجھ ہی لگے گی۔ وہ اس سے نفرت کریں گے تم جانتے ہو، سارہ کے باپ نے اسے اپنی بیٹی تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس نے مجھے اسی وجہ سے طلاق دی تھی۔ مرد طوائف کو بسا لیتا ہے تہمت لگی ہوئی عورت کو نہیں۔ کل کو سارہ بڑی ہو گی اگر کسی نے اسے یہ سب بتا دیا تو وہ کیا کرے گی۔ جو کچھ ہوا تھا۔ اس میں میرا قصور نہیں تھا لیکن مجھے سزا ملی جو کچھ ہوا تھا۔ اس میں سارہ کی بھی غلطی نہیں ہے لیکن میں چاہتی ہوں میری طرح اسے سزا نہ ملے۔''

''سب کا خیال ہے تمہیں بس اپنا خیال نہیں ہے؟''

''میرا خیال اللہ نے نہیں کیا تو میں کیوں کروں۔ مجھے لگتا ہے عارفین! میں نے ضرور کوئی گناہ کیا ہے۔ خدا کسی کو گناہ کے بغیر اتنی رسوائی نہیں دیتا جتنی اس نے مجھے دی ہے۔ تین سال پہلے میرا جب جی چاہتا تھا میں اس سے باتیں کرتی تھی۔ تین سال سے اس نے مجھ سے بات کرنا بند کر دیا ہے۔ میں تین سال سے اسے آوازیں دے رہی ہوں مگر وہ جواب نہیں دیتا۔ میں تین سال سے ہر وہ کام کر رہی ہوں جو اسے خوش کر دے۔ اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے دیکھ لو۔ میں نے صبر کیا ہے۔ میں کسی سے شکوہ نہیں کرتی۔ میں نے تین سال میں ایک بار بھی کسی کو یہ سب کچھ نہیں بتایا مگر وہ پھر بھی راضی نہیں ہوا۔ اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ میں نے سب کو معاف کر دیا۔ تم کو، تائی امی کو، تایا ابا کو، امین کو، سب کو مگر وہ پھر بھی مجھ سے خفا ہے۔ اللہ کو عاجزی پسند ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں مٹی بن جاؤں۔ لوگوں کے پیروں کے نیچے آؤں۔ مسلی جاؤں پھر وہ مجھ پر اپنی نظر کر دے مگر پھر بھی مجھے لگتا ہے عارفین! میں نے کوئی گناہ کیا ہے۔ کوئی گناہ تو ضرور کیا ہے۔''

وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ عارفین اس کے آنسو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے شکوہ سننا چاہتا تھا مگر اب اس کی ہر بات اس کے وجود کو موم کی طرح پگھلا رہی تھی۔

''تم ایسی باتیں نہ کرو صبا! تم ایسی باتیں نہ کرو۔ تمہاری ایسی باتوں نے کتنوں کی زندگیاں اجاڑ دی ہیں۔ تمہارے ان آنسوؤں کی وجہ سے اللہ نے کتنوں کو خون کے آنسو رلایا ہے۔ تم صبر نہ کرو، شکوہ کرو، معاف نہ کرو، بدلہ لو۔ تم ایسا کرو گی تو بہت سی زندگیاں تباہ ہونے سے بچ جائیں گی۔'' کوئی اس کے وجود کے اندر چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

''صبا! مجھے بتاؤ۔ میں تمہارے لیے کیا کروں؟'' عارفین اس کے قریب آ گیا تھا۔

''تم۔ تم بس ایک کام کرنا۔ دوبارہ کبھی میرے پاس مت آنا نہ مجھ سے رابطہ کرنا نہ مجھے ڈھونڈنا۔ بس میرے لیے کچھ کرنا ہے تو یہی کرنا۔''

وہ اب بھی اسی طرح زار و قطار رو رہی تھی۔ اس روز وہ چپ نہیں ہوئی تھی، وہ روتی رہی تھی بچوں کی طرح یوں جیسے کسی نے اس سے سب کچھ چھین لیا ہو۔ یوں جیسے کسی نے اسے کچھ نہ دیا ہو۔ عارفین بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا تھا جب اس کے آنسو اس کی برداشت سے باہر ہو گئے تھے تو وہ وہاں سے چلا آیا تھا۔

اگلی شام وہ اس کی ڈگری اور دوسرے کاغذات اس کے گھر سے نکال لایا تھا اور اسے دینے کے لیے گیا تھا۔ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ وہ اس کا انتظار کرتا رہا۔ بہت دیر ہوگئی وہ گھر نہیں آئی۔ وہ بے چین ہو گیا تھا۔ اس نے اس کے ہمسایوں کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

''وہ تو جی صبح اپنا سامان لے کر گھر چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ چابی ہمیں دے گئی ہیں کہ مالک مکان کو دے دیں۔'' ایک عورت نے اس کے استفسار پر اندر سے اسے بتایا تھا۔ کسی نے برچھی سے ایک بار پھر عارفین کے پورے وجود کو چھیدنا شروع کر دیا تھا۔

اس نے دوبارہ صبا کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جانتا تھا، اس بار وہ نہیں ملے گی، صبا کے گھر والے پاکستان آ گئے تھے۔ اور انھوں نے عارفین کے گھر والوں سے سارے تعلقات توڑ لیے تھے۔ لیکن عارفین سے صبا کے والد ناراض نہیں رہ سکے۔ اس نے ان کے پیروں پر گر کر ان سے معافی مانگی تھی۔ واپس امریکہ جاتے ہوئے اس نے ان سے صبا کا گھر خرید لیا تھا۔ پھر وہ خود بھی اسماء اور حیدر کے ساتھ واپس فرانس آ گیا تھا۔ یہاں آ کر اسے شدید قسم کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا اور دو تین ماہ تک وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس پر ڈپریشن کے دورے پڑتے اور وہ کئی کئی دن تک خاموش رہتا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اسماء اور حیدر کی وجہ سے نارمل ہونے لگا تھا۔ اسماء نے ان دنوں اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ گھنٹوں اس سے صبا کے بارے میں باتیں کرتا رہتا اور وہ بڑے صبر اور ہمدردی سے سنتی رہتی اور جب اس پر خاموشی کے دورے پڑتے تو وہ صبا کا ذکر کر کے اسے بولنے پر مجبور کرتی۔ کئی سال وہ پاکستان نہیں گیا تھا پھر باپ کی وفات پر اس نے پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔

* * *

''اس میں اعتراض والی بات کون سی ہے۔ ہر ایک اپنی بچی کا تحفظ چاہتا ہے۔ سارہ کے ماں باپ نہیں ہیں۔ رشتے کے لحاظ سے میں ہی اس کی سرپرست ہوں پھر اگر میں اس کے تحفظ کے لیے ایسی ضمانت چاہتی ہوں تو اس میں کیا برائی ہے؟''

اقصیٰ نے اس کے نکاح سے کچھ دیر پہلے حق مہر میں عارفین کے گھر کا مطالبہ کیا تھا۔ عارفین نے اس کے مطالبے پر صبا کا گھر سارہ کے نام کر دینے کی پیشکش کی تھی لیکن اقصیٰ صبا کے گھر کے ساتھ ساتھ عارفین کا گھر بھی سارہ کے نام لکھوانا چاہتی تھیں۔ عارفین کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن حیدر اس پر بگڑ گیا تھا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے پاپا؟ یہ ہوتی کون ہیں اس طرح کی ڈیمانڈز کرنے والی؟ پہلے انھوں نے فوری شادی کا ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ میں نے آپ کے مجبور کرنے پر اس پر رضامندی ظاہر کر دی اور اب یہ حق مہر میں بے جا مطالبات پیش کر رہی ہیں۔ سارہ کے لیے کیا پانچ لاکھ، زیورات اور اس کی امی کا گھر حق مہر میں کافی نہیں ہے جو یہ آپ کے گھر کے لیے کہہ رہی ہیں۔ میں ان کا یہ مطالبہ ہرگز نہیں مانوں گا۔ چاہے جو مرضی ہو جائے۔ وہ گھر آپ کا ہے اور میں کسی صورت میں کسی اور کا ہونے نہیں دوں گا۔ ان کو اگر اتنی چیزیں قبول نہیں ہیں تو یہ اپنی بھانجی کی شادی کہیں اور کر لیں۔''

وہ بے حد برہم تھا اور کسی طور پر عارفین کی بات ماننے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔

''حیدر! تم جذباتی مت بنو۔ یہ گھر سارہ کے نام کر دینے سے کیا فرق پڑے گا۔ یہ گھر میرے نام ہو۔ تمھارے نام ہو یا سارہ کے نام۔ ایک ہی بات ہے۔ رہنا تو ہم تینوں کو ہی ہے یہاں؟'' عارفین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''آپ کو فرق پڑتا ہے یا نہیں مجھے پڑتا ہے۔ جو چیز آپ کی محنت کی ہے وہ میں یا میری بیوی کیسے ہتھیا سکتے ہیں۔ انھیں مطالبات میری حیثیت دیکھ کر کرنا چاہئیں آپ کی حیثیت دیکھ کر نہیں۔'' وہ ابھی بھی اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

''حیدر! یہاں مسئلہ سارہ کی ذات کا ہے۔ میں ایک مکان کی خاطر اس کے نکاح پر کوئی جھگڑا کرنا نہیں چاہتا۔ اس طرح شادی سے انکار کرنے سے تمھیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مگر سارہ کو پڑے گا اور میں ایسا کوئی کام نہیں ہونے دوں گا جس سے اس کی فیلنگز ہرٹ ہوں۔''

انھوں نے کسی نہ کسی طرح اسے سمجھا بجھا لیا تھا لیکن حیدر کا دل بری طرح کھٹا ہو چکا تھا۔ وہ پہلے ہی اتنی جلدی شادی کی وجہ سے بہت خوش نہیں تھا اور اب اقصیٰ کے ایسے مطالبات نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ عارفین اس صورت حال سے نہ تو پریشان تھے اور نہ ہی ناخوش۔

اقصیٰ نے واقعی شادی جلدی کرنے کے لیے شور مچایا تھا۔ وہ واپس جانے سے پہلے سارہ کی شادی کر دینا چاہتی تھیں۔ عارفین کی رضامندی کے بعد انھوں نے اپنے بھائی اور باپ کو بھی امریکہ سے اپنی فیملی کے ساتھ بلوا لیا تھا۔ عارفین کے انکار کے باوجود ان لوگوں نے سارہ کے لیے جہیز خریدنا شروع کر دیا تھا اور انھوں نے سارہ کے لیے ہر وہ چیز خریدی تھی جس کی اسے ضرورت ہو سکتی تھی۔ نکاح، مہندی سے کچھ دیر پہلے کیا گیا تھا اور دوسری شام سارہ کی رخصتی تھی۔ عارفین کی بڑی بہن نے حق مہر کے سلسلے میں اقصیٰ کے مطالبات سے سارہ کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ وہ جہاں پریشان ہوئی تھی وہیں بے حد شرمندہ بھی تھی۔ نکاح کے بعد جب سب لوگ کمرے سے چلے گئے تو اس نے اقصیٰ سے اس بات کی شکایت کی مگر انھوں نے اس کی بات یہ کہتے ہوئے سنی ان سنی کر دی۔

''تم ابھی چھوٹی ہو، دنیا کو سمجھ نہیں سکتی ہو۔ میں نے جو کچھ کیا تمھارے محفوظ مستقبل کے لیے کیا اور ٹھیک کیا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر تم یا کوئی اور اعتراض کرے۔''

وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل کر گھر کے برآمدے میں آ گئی تھیں۔ سامنے صحن روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ مہندی کی رسم مشترکہ طور پر ایک ہی جگہ انجام دی جانی تھی، مہندی عارفین کے گھر کے بجائے تایا کے گھر سے صحن میں آنی تھی اور وہیں پر تمام رسومات سرانجام دی جانی تھیں۔ اس کے بعد صبا کے گھر سے ان سب نے حیدر کی مہندی لے کر تایا کے گھر جانا تھا، سارا انتظام صحن میں کیا گیا تھا اور اسے خوب سجایا گیا تھا ہمیشہ شادی کی تقریبات کے لیے صحن کو ہی استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ وہ بڑا تھا اور اس میں بہت زیادہ مہمان بٹھائے جا سکتے تھے، ایک تھکاوٹ سی ان کے وجود پر چھائی جا رہی تھی، وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئیں۔

''کیا بات ہے اقصیٰ! تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ تیار کیوں نہیں ہو رہیں؟'' عظیم نے اندر سے باہر آتے ہوئے ان سے پوچھا تھا۔

''عظیم میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ پتا نہیں ہم یہ سب ٹھیک کر رہے ہیں یا نہیں پتا نہیں ہمیں سارہ کا رشتہ حیدر کے ساتھ کرنا چاہیے تھا یا نہیں؟'' وہ بے حد بے چین تھیں۔

''اقصیٰ! اب ایسی باتیں سوچنے کا وقت ہے نہ موقع، سارہ کا نکاح ہو چکا ہے۔ کچھ دیر بعد مہندی کی رسم ادا کی جائے گی اور کل شام اس کی

رخصتی ہے پھر اب ایسی باتوں پر ملال کا فائدہ۔'' انھوں نے نرمی سے بہن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے سمجھایا تھا۔

''ہاں، بس ملال ہی تو نہیں جاتا۔ ملال ہی تو نہیں جاتا۔'' اقصیٰ کی بے چینی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

''تم پریشان مت ہو۔ حیدر اچھا لڑکا ہے۔ سارہ کا خیال رکھے گا پھر سارہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔''

''صرف اسی ایک وجہ سے، صرف اسی ایک وجہ سے میں نے یہ رشتہ قبول کر لیا تھا، ورنہ عظیم، میں کبھی سارہ کو اس ذلیل خاندان میں جانے نہ دیتی۔ یہ لوگ اس قابل نہیں ہے کہ صبا کی بیٹی ان کے پاس جائے۔''

اقصیٰ خود پر ضبط نہیں کر سکی تھیں اور رونے لگی تھیں، عظیم کچھ افسردگی سے خود بھی اقصیٰ کے پاس بیٹھ گئے۔

''اقصیٰ! جو کچھ ہو چکا، اسے بھولنے کی کوشش کرو۔'' انھوں نے بہن کا ہاتھ تھام کر اسے چپ کروانے کی کوشش کی۔

''میں کیا کروں عظیم! مجھے کچھ بھولتا نہیں مجھے۔ کچھ بھولتا ہی تو نہیں۔ مجھے آج بھی ایک ایک بات یاد ہے۔ ایک ایک منظر نقش ہے میرے دل پر، یہی گھر تھا۔ یہی لوگ تھے۔ اسی طرح سب کچھ سجا ہوا تھا۔ اسی طرح سب لوگ ہنس بول رہے تھے جب تائی امی نے نیچے آ کر چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں بھی امی کے ساتھ حواس باختہ اوپر گئی تھی اور وہاں تائی نے اسے عادل کے ساتھ کمرے سے نکالا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا، میری بہن نے کچھ نہیں کیا مگر وہ اس قدر خوفزدہ تھی کہ کچھ بول ہی نہیں پا رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آیا ہوگا کہ تائی اس کی ساس اس کے ساتھ یہ دھوکا کر سکتی ہیں۔ آج عارفین کی بڑی بہن کو ایک معمولی گھر حق مہر میں لکھواتے ہوئے اتنا اعتراض ہوا کہ وہ یہ بات بتانے کے لیے سارہ کے پاس جا پہنچی اور اس شام وہی دوپٹے کے بغیر صبا کو دھکے دیتے ہوئے نیچے لائی اور اسے ننگے سر اور ننگے پاؤں صحن میں دھکیل دیا تھا۔ میں یہیں بیٹھی ہوئی تھی جہاں آج بیٹھی ہوں اور مجھے لگ رہا تھا۔ کوئی میرے وجود کو چھری سے کاٹ رہا ہے۔ تم بھی تو کھڑے تھے نا یہیں پاس ہی تو کھڑے تھے جب تایا نے اسے صحن کے بیچوں بیچ جوتوں سے مارنا شروع کیا تھا۔ تمھیں یاد ہے نا۔ امی، ابو نے اسے کبھی سخت ہاتھ تک نہیں لگایا تھا اور اس شخص نے سب کے سامنے اس کے سر پر جوتے مارے تھے اور میں عظیم! میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ میں بس یہیں بیٹھی روتی چیختی رہی تھی اور سب لوگ برآمدوں میں تماشا دیکھتے رہے تھے۔ کسی نے آگے بڑھ کر تایا کا ہاتھ روکنے کی کوشش نہیں کی، تمھیں یاد ہے۔ وہ ایک بار بھی نہیں چیخی تھی۔ اس نے کتنی خاموشی کے ساتھ سر جھکا کر مار کھائی تھی۔ اس کے ساتھ کسی نے اچھا سلوک نہیں کیا نہ ہم نے نہ کسی اور نے تم اسے جان سے مار ڈالنا چاہتے تھے جب تائی نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر جھوٹی قسم کھائی تھی کہ اسے اور عادل کو انھوں نے عارفین کے کمرے میں نہیں بھیجا تھا اور صبا نے قرآن پر ہاتھ رکھنے سے انکار کر دیا تھا، پھر عارفین نے اسی کمرے میں اسے کھڑے کھڑے طلاق دے دی تھی تب میرا دل چاہا تھا میں صبا کو مار دوں۔ مجھے بھی باقی سب کی طرح یقین آ گیا تھا کہ وہی مجرم ہے مگر وہ مجرم نہیں تھی۔ مجرم تو ہم تھے گناہ تو ہم سے ہوئے تھے اور یہ خاندان تو سات پشتوں تک صبا کا مقروض رہے گا کس کس چیز کا قرض اتاریں گے۔ تایا کو خود مختاری کی بیماری تھی۔ فیصلوں کا شوق تھا۔ بڑا زعم تھا اپنی خاندانی نجابت پر۔ وہ کس کس گناہ کا کفارہ ادا کریں گے۔ صبا کو ایک بوڑھے کی دوسری بیوی بنا دینے کا؟ یا سارہ پر ناجائز اولاد کا ٹھپہ لگوا دینے کا؟ یا شادی کے چار ماہ بعد اسے طلاق ہو جانے کا؟ اس خاندان کی جھولی گناہوں سے بھری ہوئی ہے اور ہم...... ہم ایک بار پھر ان سے رشتے استوار کر رہے ہیں۔ سارہ کو اس گندگی میں پھینک

رہے ہیں۔ یہ لوگ کیا اس قابل ہیں کہ انھیں معاف کیا جائے۔ ان کی وجہ سے ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ان کی وجہ سے ہمیں یہ گھر چھوڑ کر جانا پڑا اور یہ سب دیکھو، یہ سب کتنے خوش، کتنے مطمئن ہیں۔ انھیں احساس ہی نہیں ہے کہ انھوں نے کتنی زندگیاں برباد کردی ہیں۔ یہ تو اس شادی کے ذریعے اپنے کفارے ادا کر رہے ہیں۔ اپنی عاقبت سنوار رہے ہیں ورنہ انھیں سارہ کی کیا پرواہ ہوسکتی ہے۔''

وہ سسکتی رہی تھیں۔ عظیم دل گرفتگی کے عالم میں سر جھکائے خاموشی سے ان کے پاس بیٹھے رہے۔

''کچھ بھی ہوا قصیٰ! سارہ کے ساتھ وہ سب نہیں ہوسکتا جو صبا کے ساتھ ہوا، اس وقت ہم بے بس تھے۔ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ صبا کو بچا سکتے تھے نہ اسے تحفظ دے سکتے تھے۔ اب حالات ویسے نہیں ہیں۔ اب ہم سارہ کو سپورٹ کر سکتے ہیں پھر عارفین اور حیدر دونوں سارہ کا خیال رکھیں گے۔ تم پریشان مت ہو اقصیٰ۔''

عظیم نے انھیں تسلی دینے کی کوشش کی تھی وہ بھائی کے کندھے سے لگ کر رونے لگیں۔ صحن میں چہل پہل بڑھتی جا رہی تھی۔ مہندی لے جانے کے لیے سب لوگ تایا کے گھر اکٹھے ہو رہے تھے۔ اقصیٰ کی بڑی بیٹی باہر آ گئی تھی۔

''افوہ امی! آپ اب تو آ کر تیار ہو جائیں۔ وہ لوگ آنے والے ہیں، جلدی کریں۔ اب یہ رونا دھونا ختم کریں۔''

وہ آ کر ماں کا بازو کھینچنے لگی تھی۔ اقصیٰ آنکھیں پونچھتے ہوئے تیار ہونے کے لیے اندر آ گئی تھیں۔ رات دیر گئے مہندی کا ہنگامہ جاری رہا تھا۔

''بس مجھے یہاں اتار دیں میں تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی۔'' سارہ نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔'' اقصیٰ نے بھی گاڑی سے اترنا چاہا تھا لیکن سارہ نے انہیں روک دیا۔

''نہیں خالہ! مجھے اکیلے ہی جانا ہے۔ آپ کے ساتھ جانا مجھے اچھا نہیں لگے گا، میں بس اپنی دوست سے مل کر واپس آ جاؤں گی۔''

اس نے گاڑی سے اتر کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ اقصیٰ نے بادل نخواستہ اسے جانے دیا۔ وہ اسے تیار کروانے کے لیے بیوٹی پارلر لے کر جا رہی تھیں، جب اس نے اپنی کسی دوست سے ملنے کی فرمائش کی تھی اور ڈرائیور کو پتا بتایا تھا۔ اقصیٰ نے بڑے آرام سے ڈرائیور کو وہاں جانے کا کہہ دیا تھا کیونکہ بارات کو شام پانچ بجے آنا تھا اور اس وقت صرف ایک بجا تھا۔ گاڑی میں اقصیٰ کے ساتھ ان کی بڑی بیٹی افشاں اور عظیم کی بیوی بھی تھی۔

قائداعظم روڈ پر ایک بلند و بالا کمرشل عمارت کے سامنے اس نے گاڑی رکوائی تھی۔

''یہیں اوپر اس کا فلیٹ ہے۔''

سارہ نے اقصیٰ کو بتایا تھا۔ پھر وہ گاڑی سے اتر کر چلی گئی تھی۔ ڈرائیور نے کار پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر دی اور وہ آپس میں باتیں کرتے ہوئے اس کا انتظار کرنے لگیں۔ انہیں وہاں بیٹھے پندرہ منٹ گزر گئے لیکن وہ باہر نہیں آئی۔ اقصیٰ نے گھڑی دیکھنا شروع کر دیا تھا پھر آدھ گھنٹہ گزر گیا لیکن وہ باہر نہیں آئی اب اقصیٰ کو بے چینی ہونے لگی تھی۔ بیوٹیشن کے ساتھ ان کی دو بجے کی اپائنٹمنٹ تھی اور ڈیڑھ یہیں بج چکا تھا۔

''تم لوگ بیٹھو، میں اسے دیکھ کر آتی ہوں۔'' اقصیٰ نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا تھا۔

''امی! اب کہیں یہ نہیں ہو کہ آپ سارہ کو ڈھونڈنے جائیں اور وہ اتنی دیر میں آ جائیں پھر ہم آپ کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔'' افشاں نے ماں سے کہا تھا۔

''نہیں اگر سارہ آ جاتی ہے تو تم لوگ بیوٹی پارلر چلے جانا میں ٹیکسی لے کر آ جاؤں گی۔''

اقصیٰ یہ کہہ کر گاڑی سے اتر گئی تھیں۔ یہ ایک کمرشل عمارت تھی اور کافی لوگ اندر آ جا رہے تھے۔

''فلیٹس کس منزل پر ہیں؟'' اقصیٰ نے چوکیدار سے پوچھا تھا۔

''بی بی! اس عمارت میں کوئی فلیٹ نہیں ہے۔ بس آفس ہیں۔''

اقصیٰ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی انہوں نے حواس بحال رکھتے ہوئے ایک بار پھر اس سے پوچھا تھا۔

''نہیں۔ آفس تو گراؤنڈ فلور پر ہوں گے۔ اوپر والی منزلوں پر فلیٹ ہوں گے؟''

''بی بی! یہ عمارت میرے سامنے بنی تھی۔ میں پندرہ سال سے یہاں ہوں، یہاں ساری منزلوں پر ہی آفس ہیں، فلیٹ کوئی نہیں۔ اوپر والی دو منزلیں تو اس کمپنی نے لے رکھی ہیں۔'' اس نے ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا نام بتایا تھا۔

''نیچے کی دو منزلوں پر بھی صرف آفس ہیں پھر بھی اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو آپ اندر جا کر پتا کر لو۔'' اقصیٰ کو لگا تھا جیسے ان کے سر پر آسمان گر پڑا ہو۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی واپس کار پارکنگ میں آئی تھیں۔

''چوکیدار کہہ رہا ہے کہ اس عمارت میں کوئی فلیٹ نہیں ہے۔ صرف آفس ہیں۔'' انھوں نے بوکھلائے ہوئے افشاں اور مریم کو بتایا تھا۔ وہ دونوں گاڑی سے اتر آئی تھیں۔

''آئیں ہم خود چل کر دیکھتے ہیں۔''

عظیم کی بیوی بھی بوکھلائی ہوئی تھی۔ وہ تینوں عمارت کے اندر گئی تھیں اور وہاں انھوں نے جس سے بھی پوچھا تھا۔ اس نے یہی کہا تھا کہ وہاں کوئی فلیٹ نہیں ہے صرف آفس ہیں۔ وہ تینوں بے حد پریشان ہو کر عمارت کے اندرونی دروازے پر بیٹھے گارڈ کے پاس گئی تھیں اور اسے انھوں نے سارہ کا حلیہ بتا کر اس کے بارے میں معلومات لینے کی کوشش کی تھی مگر وہ بھی سارہ کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا تھا۔

''آپ خود دیکھ لیں، اس عمارت میں اتنی عورتیں آتی ہیں۔ ہم کس کس کو یاد رکھ سکتا ہے۔''

گارڈ نے ان سے کہا تھا۔ اب ان تینوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

''امی! آپ پاپا اور انکل عظیم کو رنگ کریں وہی کچھ کر سکتے ہیں۔''

افشاں نے ماں کو سمجھایا تھا، ایک پبلک کال آفس سے فون کر کے انھوں نے عظیم کو بلایا تھا اور وہ آدھ گھنٹہ بعد حواس باختہ سے وہاں پہنچے تھے۔ انھوں نے بھی چوکیدار اور گارڈ سے سارہ کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کرنا چاہی تھی مگر وہ بھی ناکام رہے تھے، سارہ کا کہیں کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

''یہ شادی اس کی پسند سے ہو رہی ہے پھر وہ کہاں غائب ہو سکتی ہے۔'' عظیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

''تم اسے یہاں لے کر کیوں آئی تھیں۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ اسے اکیلے اندر جانے دو۔''

وہ بری طرح اقصیٰ پر برس پڑے تھے اقصیٰ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ عظیم نے موبائل پر کال کر کے اقصیٰ کے شوہر اسد کو بھی وہیں بلوا لیا تھا۔ ان تینوں کو انتظار کرنے کا کہہ کر وہ دونوں ایک بار پھر اندر غائب ہو گئے تھے، ایک گھنٹے بعد ستے ہوئے چہروں کے ساتھ ان کی واپسی ہوئی تھی۔

''اب اور کوئی چارہ نہیں سوائے اس کے کہ عارفین کو یہاں بلا لیا جائے۔ اب تک تو بارات بھی روانہ ہو چکی ہوگی۔ تم لوگ ہوٹل چلے جاؤ کیونکہ وہاں بارات کے استقبال کے لیے تو گھر والوں میں سے کسی کو ہونا چاہیے۔ اقصیٰ! تم یہیں رہو اور مریم! تم عارفین کو یہاں بھجوا دو اسے ابھی سارہ کی گمشدگی کے بارے میں مت بتانا۔ صرف یہ کہنا کہ عظیم نے کسی ضروری کام کے لیے یہاں بلا لیا ہے اور کسی سے بھی ابھی سارہ کے بارے میں کچھ مت کہنا۔ بس یہی کہنا کہ وہ ابھی بیوٹی پارلر میں ہے اور اقصیٰ اس کے پاس ہے۔'' عظیم نے انھیں ہدایات دی تھیں اور پھر انھیں بھجوا دیا تھا۔

آدھ گھنٹہ بعد عارفین آئے تھے اور وہ کافی پریشان نظر آ رہے تھے شاید وہ سمجھ نہیں پائے تھے کہ انھیں وہاں کیوں بلایا گیا تھا۔ عظیم نے انھیں پورا واقعہ بتا دیا تھا اور ان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سارہ کہاں جا سکتی ہے۔ اقصیٰ! کہیں تم نے تو اسے کچھ نہیں بتایا۔'' عارفین کا ذہن فوراً اقصیٰ کی طرف گیا تھا۔

''نہیں عارفین! یقین کرو میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ یوں اچانک کیوں غائب ہوگئی ہے۔'' اقصیٰ نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

''خدا کے لیے اقصیٰ! اگر یہ سب تم نے کیا ہے تو ایسا مت کرو، وہاں پورا خاندان اکٹھا ہے۔ میرے سب دوست احباب، ملنے والے جمع ہیں۔ میں ان کا سامنا کیسے کروں گا۔'' عارفین عباس نے منت آمیز انداز میں اقصیٰ سے کہا تھا۔

''عارفین! میرا یقین کرو۔ میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ سارہ کو میں نے نہیں بھیجا۔ اپنی مرضی سے گئی ہے، غلط بیانی کر کے گئی ہے کہ یہاں اس کی دوست کا فلیٹ ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ اس کے چلے جانے سے صرف تمہاری رسوائی ہے؟ نہیں عارفین ہم بھی کسی کا سامنا نہیں کر سکیں گے۔'' اقصیٰ بے اختیار رو پڑی تھیں۔

عارفین انھیں بے بسی سے دیکھ کر رہ گئے تھے۔ کچھ دیر تک انھوں نے بھی ایک موہوم سی امید میں اس عمارت میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی اور پھر بالآخر انھوں نے اپنے ایک دوست کو فون کر کے پولیس کو بلوا لیا تھا، پولیس کی تھوڑی سی تفتیش سے ہی یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ سامنے والے گیٹ سے داخل ہونے کے بعد عقبی گیٹ سے باہر نکل گئی تھی۔ انھیں یہ اندازہ پہلے بھی تھا کہ وہ اپنی مرضی سے غائب ہوئی تھی مگر اب یہ بات طے ہوگئی تھی کہ وہ باقاعدہ منصوبہ بنا کر وہاں آئی تھی۔ یقیناً وہ پہلے بھی اس عمارت میں آتی جاتی رہی تھی اور جانتی تھی کہ اس عمارت کا ایک عقبی گیٹ بھی ہے اور وہ وہاں سے آسانی سے جا سکتی ہے۔

شام ہو چکی تھی اور وہ وہاں سے واپس آ گئے تھے۔ عارفین نے ہوٹل واپس آ کر حیدر کو ایک کمرے میں بلایا تھا اور اسے سب کچھ بتا دیا تھا وہ سکتے میں آ گیا تھا۔

''پاپا! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا ''وہ کہاں جا سکتی ہے اور کیوں جائے گی؟'' وہ روہانسا ہو گیا تھا ''مجھے بتائیں، میں کیا کروں میں لوگوں کے سامنے کیسے جاؤں؟''

''حیدر! خود پر قابو پاؤ، اقصیٰ سب سے کہہ رہی ہے کہ سارہ کو فوڈ پوائزننگ ہوگئی ہے اور اس وجہ سے اسے ہاسپٹل ایڈمٹ کروانا پڑا ہے، ہم بھی سب سے یہی کہیں گے۔''

''پاپا! لوگ بے وقوف نہیں ہیں۔ آپ کو کیا لگتا ہے، وہ اس بات پر یقین کر لیں گے۔ میں ان کے سوالوں کا جواب کیسے دوں گا۔ مجھے سچ بتائیں۔ وہ کیوں گئی ہے؟ ایسا کیا ہوا ہے؟'' حیدر کو لگ رہا تھا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔ ''میں اب کسی کے سامنے نہیں جاؤں گا میں اس کمرے سے باہر نہیں جاؤں گا۔ اس سے میری شادی آپ کا فیصلہ تھا۔ آپ جائیں، لوگوں سے جو بھی کہنا ہے آپ کہیں۔ میں کسی کا سامنا نہیں کروں گا۔''

حیدر نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ عارفین کچھ کہے بغیر باہر چلے گئے۔

"پاپا! آپ کو جو کچھ مجھ سے چھپانا تھا۔ آپ نے چھپالیا۔ اب مجھ سے صرف سچ بولیں۔ مجھے بتائیں۔ صبا سے آپ کا کیا رشتہ تھا۔ آپ دونوں کے درمیان کیا ہوا تھا۔ سارہ کس وجہ سے چلی گئی؟"

اس رات سارے مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد وہ دونوں گھر آئے تھے اور حیدر گھر آتے ہی سارہ کے کمرے میں چلا گیا تھا، سارہ اپنی چیزیں صبا کے گھر لے کر گئی تھی، اس کا باقی سامان یہیں پر تھا اور اس کی چیزیں دیکھتے ہوئے حیدر کو جھٹکے پر جھٹکے پہنچ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ عارفین کے صبا کے نام لکھے ہوئے خطوط اور کارڈز لگے تھے اور ان کی وہاں موجودگی نے اسے جتنا حیران کیا تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر اس انکشاف نے اسے دم بخود کیا تھا کہ صبا عارفین کی منکوحہ رہ چکی تھیں۔ پھر اس کے ہاتھ سارہ کی تعلیمی اسناد لگی تھیں اور وہ یہ جان کر ساکت ہو گیا تھا کہ وہ گریجویشن تک فرنچ کو ایک آپشنل سبجیکٹ کے طور پر پڑھتی رہی ہے۔ پھر وہ باپ کے پاس آیا تھا اور اب وہ ان سے سوال کر رہا تھا۔ اس نے وہ کارڈز اور خطوط ان کے سامنے ٹیبل پر پھینک دیے تھے۔ عارفین انھیں دیکھ کر ساکت رہ گئے تھے۔

"یہ تمھیں کہاں سے ملے؟"

"سارہ کے کمرے سے، اسے یہ کہاں سے ملے؟ یہ آپ کو پتا ہوگا اور یہ جان کر آپ کو مزید صدمہ ہوگا کہ وہ کالج میں فرنچ پڑھتی رہی ہے اب آپ مجھ سے کچھ نہ چھپائیں۔ مجھے بتائیں وہ سب کچھ جو آپ نے نہیں بتایا اور جس کی سزا مجھے ملی ہے۔"

عارفین نے اپنا سر جھکا دیا تھا۔

....

آمنہ! اب اٹھ جاؤ یار! کتنی دیر سوتی رہو گی!" گل کی آواز نے اسے بیدار کر دیا تھا۔

وہ تھکے تھکے انداز میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

گل آئینہ ہاتھ میں لیے تیزی سے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا رہی تھی، وہ بے خیالی میں اس کا چہرہ دیکھتی رہی وہ روز اس وقت اسی طرح سج دھج کر باہر جاتی تھی، اس کے بقول وہ اپنے منگیتر کے ساتھ گھومنے پھرنے جاتی تھی مگر اس کا منگیتر ہر تیسرے چوتھے دن بدل جاتا تھا سارہ کو اس کے منگیتر پر اعتراض تھا نہ منگیتر کے بدلنے پر۔

"بس میں اب جا رہی ہوں۔ تم دروازہ بند کر لینا، ہاں اور عذرا آج دیر سے آئے گی۔ وہ مجھے صبح بتا کر گئی تھی۔"

گل نے باہر نکلتے ہوئے اسے بتایا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔

روزہ افطار ہونے میں ابھی تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا۔ وہ کچن میں آ گئی۔ وہاں کچھ بھی پکا ہوا نہیں تھا۔ پچھلی رات کے پکائے ہوئے کچھ دال چاول ابھی بھی پڑے ہوئے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ عذرا اور گل دونوں باہر سے کھانا کھا کر آئیں گی اور شاید اپنے لیے کچھ ساتھ لے بھی آئیں۔ چاولوں کو گرم کرنے کے بعد ایک گلاس میں پانی اور چاول لے کر وہ کمرے میں آ گئی دونوں چیزوں کو اس نے فرش پر رکھ دیا تھا اور خود دوبارہ اپنے بستر پر بیٹھ گئی تھی۔

وہ روز سہ پہر کو سوتی نہیں تھی مگر آج خاص بات تھی۔ آج ایک بار پھر وہ اس کے ہتھے چڑھتے چڑھتے بچی تھی۔ ڈیڑھ ماہ میں یہ تیسرا موقع تھا جب سارہ کا اس سے سامنا ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

پہلی دفعہ اس کا حیدر سے ٹکراؤ تب ہوتے ہوتے رہ گیا تھا جب کچھ دن اپنی دوست کے پاس رہنے کے بعد اس نے اس کے ذریعے ایک ہاسٹل میں کمرہ کرائے پر لیا تھا۔ اسے ہاسٹل میں آئے تیسرا دن تھا جب وہ کسی کام سے باہر گئی تھی اور واپسی پر اس نے بہت دور سے ہی اس کی سلور گرے سوک ہاسٹل کے باہر دیکھ لی تھی وہ بہت محتاط ہو کر کچھ اور آگے گئی تھی۔ نمبر پلیٹ کو وہ پہچان گئی تھی۔ کار میں کوئی نہیں تھا۔ یقیناً وہ ہاسٹل کے اندر ہوگا۔ کار سے کچھ آگے پولیس کی ایک وین بھی کھڑی تھی۔ وہ الٹے قدموں اپنی دوست کے پاس گئی تھی۔

''سارہ! تم نے مجھے دھوکا دیا تمھارے انکل اور خالہ تمہاری شادی کسی بوڑھے کے ساتھ نہیں کر رہے۔ میں حیدر سے مل چکی ہوں اس نے مجھے نکاح نامہ بھی دکھایا ہے اور تمھارے کارنامے کے بارے میں بھی بتایا ہے پھر اس کے بعد میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں اس کو تمہارا ٹھکانا بتا دیتی۔''

اس کی دوست عامرہ نے اس کے شکوے پر کہا تھا، وہ فیکٹری میں اس کے ساتھ کام کرتی تھی اور سارہ شادی والے دن سیدھی اس کے پاس گئی تھی۔ سارہ کے پاس اب کہنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ اس کے پاس سے چلی آئی۔

پھر وہ دوبارہ ہاسٹل نہیں گئی تھی۔ اس کا بیگ اس کے پاس تھا جس میں اس کی ساری رقم موجود تھی، ہاسٹل میں پڑے ہوئے تھوڑے سے سامان کی اسے پروا نہیں تھی۔ اس نے کسی دوسرے ہاسٹل میں کمرہ ڈھونڈنے کے بجائے ایک پراپرٹی ڈیلر کے ذریعے ایک گندے سے گنجان آباد علاقے میں ایک فلیٹ چھ سو روپے ماہانہ پر کرائے پر لے لیا تھا، فلیٹ میں پہلے بھی دو لڑکیاں رہتی تھیں اور فلیٹ صرف ایک کمرے چھوٹے سے کچن اور اسی سائز کے باتھ روم پر مشتمل تھا اور اس کی حالت خاصی خراب تھی مگر سارہ کو اس کی پروا نہیں تھی، اس کے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ اپنے سر پر چھت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

دوسری بار حیدر سے تب اس کا سامنا ہوتے ہوتے رہ گیا تھا جب اس نے کام کی تلاش شروع کی تھی، اس کے پاس اس کی تعلیمی اسناد اور سرٹیفکیٹ نہیں تھے اور ان کے بغیر وہ کوئی ڈھنگ کی جاب حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ تب ہی اسے خیال آیا تھا کہ جس اکیڈمی کے ذریعے اس نے پہلے ٹیوشنز حاصل کی تھیں وہاں اس نے اپنی اسناد کی فوٹو کاپیز جمع کروائی تھیں اور وہ اس اکیڈمی کے ذریعے ایک بار پھر ٹیوشن حاصل کر سکتی تھی۔

وہ ایک روز وہاں گئی تھی۔ اکیڈمی کے مالک کا رویہ کچھ عجیب سا تھا۔ اس نے اس سے بیٹھنے کو کہا تھا اور پھر کسی ضروری کام سے اندر چلا گیا تھا کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ کسی بچے کے والد تھوڑی دیر میں آنے والے ہیں اور ان کے بچے کو ٹیوشن کی ضرورت ہے اس لیے سارہ وہاں بیٹھ کر کچھ انتظار کرے وہ بس آدھ گھنٹہ میں پہنچ جائیں گے اس نے دس منٹ وہاں بیٹھ کر انتظار کیا تھا اور پھر یکدم اس کی چھٹی حس اسے کسی خطرے سے خبردار کرنے لگی تھی اس نے اس اکیڈمی کے مالک سے پانی مانگا تھا وہ پانی لینے اندر گئے تھے اور وہ بیرونی دروازہ کھول کر باہر آ گئی تھی۔

تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس نے سڑک پار کر لی تھی اور پھر جیسے ہی اس نے موڑ کاٹا تھا۔ سلور گرے رنگ کی وہی جانی پہچانی کار اس

کے قریب سے گزر گئی تھی۔ خوف کی ایک لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی تھی۔

''اگر چند منٹ اور میں وہاں ٹھہرتی تو یہ شخص میرے سامنے ہوتا'' اس نے بے اختیار سوچا تھا۔ وہ اس کے بعد نہ صرف اس اکیڈمی نہیں گئی بلکہ کسی اکیڈمی بھی نہیں گئی۔ اس نے اپنی تعلیمی اسناد دوبارہ حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ صرف ان ہی کے ذریعے وہ کسی فیکٹری میں کوئی معقول جاب حاصل کر سکتی تھی۔ کل وہ اپنا میٹرک کا سرٹیفکیٹ دوبارہ بنوانے کے لیے اسکول گئی تھی اور کلرک نے اسے دوسرے دن آنے کے لیے کہا تھا اور آج جب وہ اپنے اسکول گئی تھی تو اسکول کے گیٹ سے تیس چالیس فٹ کے فاصلے پر کھڑی اسی خالی کار نے ایک بار پھر اسے دہلا دیا تھا۔

''اے خدا! یہ شخص کیوں سانپ کی طرح میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔''

اس نے بے اختیار سوچا تھا اور گم صم سی وہاں سے واپس آ گئی اس نے رستے میں ہی اپنی تعلیمی اسناد کے حصول کا ارادہ بھی ترک کر دیا تھا اور پورا رستہ وہ سوچتی رہی تھی کہ اب وہ کیا کرے گھر آ کر وہ بستر میں گھس کر سو گئی تھی اور اٹھنے کے بعد بھی وہ خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھی ہوئی تھی۔

اس رات اس نے سب کچھ سنا تھا۔ اقصیٰ یہ بھول گئی تھیں کہ سارہ صبا کے کمرے میں ہے اور صبا کے کمرے کی کھڑکی اسی برآمدے میں کھلتی تھی جہاں وہ بیٹھی رو رہی تھیں۔ اس نے مایوں کے کپڑے پہننے کے لیے سب کو کمرے سے نکال کر دروازہ بند کیا تھا اور تب ہی اس نے اقصیٰ اور عظیم کی باتوں کی آواز سنی تھی وہ کھڑکی کے پاس آ گئی تھی اور پھر ہر راز کھلتا گیا تھا۔ اس کی ماں نے کیا کیا تھا، اس کے ساتھ کیا ہوا تھا اس نے کیوں اس طرح اپنی زندگی برباد کر دی تھی۔ کچھ بھی اس کے لیے راز نہیں رہا تھا۔

وہ ایک مجسمہ کی طرح ساکت کھڑی رہ گئی تھی اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ روئے، چیخے، چلائے، وہاں سے بھاگ جائے کیا کرے، پھر اس کی کزنز نے دروازہ بجانا شروع کر دیا تھا اور وہ جیسے ہوش میں آ گئی تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔ پھر مہندی کی رسم کے لیے اسے باہر صحن میں لے جا کر پھولوں سے سجی ہوئی چوکی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ پھر باری باری خاندان کی مختلف عورتوں نے اس کے سر میں تیل لگانا اور اس کے ہاتھ پر مہندی رکھنا شروع کر دیا۔

اس نے یک دم رونا شروع کر دیا تھا۔ ہر بار جب کسی کا ہاتھ اس کے سر پر تیل لگاتا اسے لگتا جیسے کسی نے اسے جوتا مارا ہو، اسی طرح صحن کے بیچوں بیچ جس طرح چوبیس سال پہلے اس کی ماں کو مارے گئے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ اسی طرح رو رہی ہے جیسے سب لڑکیاں شادی پر روتی ہیں۔ اسے ان سب کے چہرے بھیانک اور کریہہ لگ رہے تھے۔ چند گھنٹے پہلے تک وہ اسے عظیم لگ رہے تھے جنھوں نے سب کچھ بھول کر اسے اپنایا تھا اور اب وہ ان سب سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی، اسی طرح جیسے اس کی ماں بھاگ گئی تھی، اس کی گود نوٹوں سے بھرتی جا رہی تھی اور اسے اپنا وجود کسی مزار پر رکھے ہوئے اس ہدیے کے ڈبے کی طرح لگ رہا تھا جس میں لوگ خود کو بخشوانے کسی منت کے پورا ہونے یا اپنی زندگی میں کامیابی کے لیے کچھ نہ کچھ ڈال کر جاتے ہیں۔ ہاں وہ سب بھی یہی کر رہے تھے صبا سے کی جانے والی زیادتی کے کفارے کے لیے اس کی بیٹی پر روپے نچھاور کر رہے تھے۔ وہ روتے روتے چپ ہو گئی تھی۔ ایک آگ نے اس کے وجود کو جلانا شروع کر دیا تھا۔ اسے کیا کرنا تھا اس نے سوچ لیا اور پھر اس نے وہی کیا تھا جو اس نے سوچا تھا۔ وہ اس عمارت میں گئی تھی اور پھر اس کے پچھلے گیٹ سے نکل

کر سیدھی اپنی دوست کے پاس فیکٹری میں گئی تھی۔ وہاں اس نے رو رو کر اسے بتایا تھا کہ کس طرح خالہ اور انکل ایک بوڑھے شخص کے ساتھ زبردستی اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں اور وہ گھر سے بھاگ آئی ہے۔ عامرہ اور اس کے گھر والے بھی اسی عمارت میں رہتے تھے جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔

انھوں نے اسے گھر میں پناہ دے دی تھی۔ دوسرے دن اس عمارت میں پولیس آئی تھی اور اس نے سارہ کے بارے میں سب سے پوچھ گچھ کی تھی۔ سارہ کا پرانا فلیٹ اب کسی اور رہائشی کے پاس تھا اور پولیس صرف اس عمارت میں ہی نہیں گئی تھی بلکہ اس فیکٹری میں بھی پہنچ گئی تھی جہاں وہ کام کرتی رہی تھی۔

عامرہ کے گھر والوں نے اس کے بارے میں ڈر کے مارے پاس پڑوس میں بھی کسی کو نہیں بتایا تھا۔ تیسرے دن عامرہ اخبار لے آئی تھی جس میں اس کی گمشدگی کی خبر کے ساتھ اس کی مایوں پر کھینچی جانے والی ایک تصویر اور ایک بڑے انعام کی آفر تھی۔ وہ بے حد خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس کی تصویر ایک ہفتہ تک روزانہ اخبار میں شائع ہوتی رہی تھی اور اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے ڈھونڈنے کے لیے کتنی سرتوڑ کوشش کی جا رہی ہے۔

سارہ جانتی تھی کہ عامرہ بہت دیر تک اسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس کے پاس وہ ساری رقم موجود تھی جو مہندی پر اسے دی گئی تھی اور اسی لیے اس نے عامرہ سے اپنے لیے کسی اور جگہ کا بندوبست کرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ لوگ کہیں اسے ڈھونڈتے ہوئے عامرہ کے گھر تک نہ پہنچ جائیں اور بعد میں اس کا خدشہ سچ ثابت ہوا تھا۔

اخبار میں شائع ہونے والی تصویر میں اس کا چہرہ میک اپ سے بالکل عاری تھا اور یہ اس کے حق میں بہت اچھا ثابت ہوا تھا۔ گل اور عذرا کو اس نے اپنا نام آمنہ بتایا تھا۔ گل اور عذرا کون تھیں وہاں کیوں رہتی تھیں۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا نہ اس نے جاننے کی کوشش کی تھی، اسے صرف یہ پتا تھا کہ وہ دونوں کسی فیکٹری میں کام کرتی ہیں۔ کیا کرتی ہیں وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی۔

ان دونوں نے سارہ سے اس کا حدود اربعہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ خاص طور پر اس کے کلائیوں تک مہندی سے بھرے ہاتھوں نے انھیں کئی قسم کے شبہات میں ڈالا تھا اور ہر بار جب وہ اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرتیں تو وہ رونا شروع کر دیتی۔ تنگ آ کر انھوں نے اس سے کچھ پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔

کئی دنوں تک ایسا ہی ہوتا رہا تھا۔ سارہ کو خود پتا نہیں چلتا تھا، کس بات پر اس کا دل بھر آتا اور وہ رونا شروع کر دیتی پھر کئی کئی گھنٹے وہ روتی رہتی عزت اور خودداری کی خاطر آسائشوں کو ٹھوکر مارنا کتنا مشکل کام تھا۔ یہ اسے اب معلوم ہوا تھا۔ وہ صرف چار ماہ آسائش میں رہی تھی اور اس کے لیے اب پہلے کی طرح ٹھوکریں کھاتے ہوئے زندگی گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔

''امی تو پیدائش سے جوانی تک آسائشوں میں رہی تھیں پھر انھوں نے کیسے سب کچھ چھوڑ دیا؟'' وہ سوچتی اور آنسو بڑھتے جاتے۔

گل نے ایک دن اس سے پوچھا تھا۔ ''تم اتنی خاموش کیوں رہتی ہو۔''

وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی تھی، اسے یاد آیا تھا اس نے بھی کئی دفعہ امی سے یہی سوال کیا تھا۔ وہ ہر بار خاموشی سے اسے دیکھتی رہتی تھیں۔

جواب نہیں دیتی تھیں۔ لوگ خاموش کیوں ہو جاتے ہیں اب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ کیوں دل چاہتا ہے کہ اپنوں کی نظروں سے اپنے وجود کو چھپا لیا جائے۔ دوبارہ ان کے سامنے نہ آیا جائے نہ ان سے کبھی بات کی جائے یہ بھی اس کی نظر میں راز نہیں رہا تھا۔

چار سال اس نے صرف ماں کے معمے کو حل کرنے کے لیے فرنچ پڑھی تھی مگر وہ انہیں بوجھنے، انھیں سمجھنے میں ناکام رہی تھی۔ کتابیں پڑھنے اور زبانیں سیکھنے سے لوگوں کے اسرار سمجھ میں نہیں آتے اور اب اسے ماں کی طرح رہتے ڈیڑھ ماہ ہوا تھا اور وہ ان کی ذات کے ہر راز کو جاننے لگی تھی۔

........✿........

سائرن ہونے لگا تھا۔ اس نے پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اس نے ریڈی میڈ گارمنٹس کی ایک فیکٹری میں چھوٹے بچوں کے فراک سینے کا کام شروع کر دیا تھا۔

"تمھارے ہاتھ میں زیادہ صفائی نہیں ہے۔ ابھی کافی عرصہ تمھیں کام سیکھنا پڑے گا۔ اس لیے تمھیں باقی عورتوں جتنے روپے نہیں ملیں گے بلکہ سیکھنے والی لڑکیوں کی طرح اجرت ملا کرے گی۔"

پہلے دن ہی سپروائزر عورت نے اس کا کام دیکھ کر کہہ دیا تھا۔ وہ خود بھی جانتی تھی کہ اس کے کام میں صفائی نہیں ہے۔ وہ سلائی کڑھائی میں کبھی بھی ماہر نہیں رہی تھی۔ بس اسے بہت سے دوسرے کاموں کی طرح یہ کام بھی آتا تھا، اس نے اس فیکٹری میں کام ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد شروع کیا تھا اور وہ ملنے والے معاوضے سے خوش نہیں تھی لیکن اس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ اس کے پاس روپے کم ہوتے جا رہے تھے اور ہر ماہ فلیٹ کا کرایہ، بجلی اور گیس کے بل اور دوسرے اخراجات کے لیے اسے روپیہ چاہیے تھا۔ یہاں کام کرنے سے بہت زیادہ نہیں لیکن وہ اتنے پیسے ضرور کما سکتی تھی جس سے اس کے بنیادی اخراجات پورے ہو جاتے۔

دو دن پہلے عذرا نے اطلاع دی تھی کہ وہ چند دن تک فلیٹ چھوڑنے والی ہے کیونکہ وہ شادی کر رہی تھی۔ اس کے لیے یہ ایک بری خبر تھی کیونکہ اس کے فلیٹ چھوڑنے کا مطلب یہ ہوتا کہ اسے اور گل کو فلیٹ کا زیادہ کرایہ دینا پڑتا اور بجلی اور گیس کے بل آپس میں بانٹنے پڑتے (پہلے وہ تین لوگ اس کو شیئر کرتے تھے) اس نے بجھے دل سے عذرا کو مبارکباد دی تھی اور بستر میں لیٹ کر ایک بار پھر حساب کتاب میں مصروف ہو گئی تھی۔

گل اور عذرا دونوں بے حد خوش نظر آ رہی تھیں۔ وہ ایک ہی بستر میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں اور باتیں کرتے کرتے وہ یک دم کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔ وہ افسردگی سے ان کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ وہ پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہی تھی اور پھر انھیں سوچوں میں گم وہ سو گئی تھی۔

دوبارہ اس کی آنکھ سحری کے وقت کھلی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن بے حد تیز تھی، اسے یاد آ گیا تھا چند لمحے پہلے اس نے خواب میں کیا دیکھا تھا۔ اس نے حیدر کو دیکھا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ وہ دونوں حیدر کے گھر کے لان میں پھر رہے ہیں ہنستے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے اور پھر یک دم اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اب وہ کمرے میں پھیلی ہوئی تاریکی کو گھور رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو جکڑ لیا، بہت دنوں سے یہی وہ رہا تھا۔ وہ اسے خواب میں اپنے ساتھ دیکھتی تھی۔ اسی طرح اپنے مخصوص انداز میں باتیں کرتا ہوا، دھیمی آواز میں ہنستا ہوا اور پھر یک دم اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ اس نے بستر سے نکل کر کمرے کی لائٹ جلا دی۔ چند منٹوں بعد گل اور عذرا بھی اٹھ گئی تھیں۔ آج انتیس واں روزہ تھا اور وہ

دونوں رات کو اسے بتا چکی تھیں کہ صبح وہ بھی روزہ رکھیں گی۔ پہلے روزے کی طرح انھوں نے بس آخری روزہ رکھنا ضروری سمجھا تھا۔

اس کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ کچن میں جا کر اس نے چائے بنائی تھی اور پھر تینوں کے لیے پراٹھے پکانے کے بعد اپنے حصے کی چائے کا کپ اور پراٹھا لے کر کمرے میں آ گئی۔ گل اور عذرا بھی چائے اور پراٹھا لے کر کمرے میں آ گئی تھیں۔

سارہ پراٹھے کے چھوٹے چھوٹے لقمے بے دلی سے چائے کے ساتھ نگلتی جا رہی تھی۔ تب ہی گل نے کسی بات پر قہقہہ لگایا تھا، سارہ نہیں جانتی تھی اسے کیا ہوا، بس اس نے چائے اور پراٹھا ایک طرف رکھ کر گھٹنوں میں منہ چھپا کر بے آواز رونا شروع کر دیا۔

''تمھیں کیا ہو گیا بھئی؟ اب تم پر کون سی آفت ٹوٹی ہے؟'' گل اور عذرا اس کے قریب چلی آئی تھیں مگر اس نے سر نہیں اٹھایا۔

''اس وقت کون یاد آ گیا ہے؟ کیا رونے کی بیماری لگا رکھی ہے۔ اب پھر دورہ پڑ گیا ہے۔ سحری ختم ہونے میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے کم از کم اپنا کھانا تو کھا لو آمنہ! کیا پاگل ہو گئی ہو؟ اس وقت رونے کی کیا بات ہے؟ اپنا سر اٹھاؤ۔''

گل اور عذرا باری باری اسے چپ کروانے کی کوشش کرتی رہی تھیں مگر وہ چپ ہوئی تھی نہ اس نے سر اٹھایا تھا۔ تنگ آ کر گل اور عذرا نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ پھر اذان ہونے لگی تھی مگر وہ اسی طرح چہرہ چھپائے آنسو بہاتی رہی۔ وہ دونوں کمرے کی لائٹ بند کر کے ایک بار پھر بستر میں جا چکی تھیں۔

چھ بجے کے قریب اس نے اٹھ کر فیکٹری جانے کی تیاری شروع کر دی تھی، اس کی متورم آنکھوں اور ستے ہوئے چہرے نے فیکٹری میں بھی سب کو متوجہ کیا تھا۔

''طبیعت خراب ہے۔'' اس نے ہر ایک سے یہی کہا۔ تین بجے فیکٹری سے فارغ ہونے کے بعد وہ واپس گھر جانے کے بجائے بازار چلی گئی تھی۔ پورا ایک گھنٹہ وہ بغیر کسی مقصد کے بازار میں پھرتی رہی دکانوں پر بڑھتی ہوئی چہل پہل اور سڑکوں کے کنارے لگے ہوئے چوڑیوں اور عید کارڈوں کے اسٹال دیکھتی رہی۔ پچھلے سال بھی وہ عید پر ماں کے ساتھ بے مقصد بازار میں پھرتی رہی تھی تب اس کی دوست عامرہ بھی اس کے ساتھ تھی اور اس نے کچھ چیزیں بھی خریدی تھیں۔ اس دفعہ وہ اکیلی ہی وہاں پھر رہی تھی۔

افطار میں ایک گھنٹہ رہ گیا تھا۔ اس نے آج ملنے والی پوری اجرت ریڑھیوں سے کھانے پینے کی چیزیں خریدنے میں لگا دی۔ یہ عید کے لیے اس کی واحد عیاشی تھی۔

افطار میں آدھ گھنٹہ باقی تھا جب وہ واپس فلیٹ پہنچ گئی تھی گل نے دروازہ کھولا۔

''آؤ سارہ! آج تو بہت دیر لگا دی۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔''

سارہ نے غور نہیں کیا کہ اس نے اسے آمنہ کے بجائے سارہ کیوں کہا تھا۔ وہ بغیر کوئی جواب دیے اندر آ گئی، لفافے اس نے دیوار کے پاس پڑی تپائی پر رکھ دیے۔ بیگ گدے پر پھینکنے کے بعد اس نے چادر اتاری اور تھکے تھکے انداز میں اسے تہہ کرنے لگی، گل اور عذرا خلاف معمول خاموش تھیں اس نے انھیں دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

''ہیلو کیسی ہو سارہ؟'' مدھم لیکن بہت شستہ فرنچ میں اسے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا۔ وہ پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت ہو گئی۔ آواز اس کی سماعتوں کے لیے ناآشنا نہیں تھی۔ وہ اسے لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔

کمرے میں Eternity کی پھیلی ہوئی مانوس سی مہک کو اس نے اب محسوس کر لیا تھا۔ سر اٹھا کر اسے کمرے میں ڈھونڈنے کی بجائے اس نے اسی طرح گردن کو حرکت دیے بغیر سر جھکائے ہوئے فرش پر نظریں دوڑانا شروع کر دیا تھا۔ کمرے کے دائیں کونے میں لیدر شوز پر اس کی نظر اٹک گئی تھی۔ وہ وہاں کھڑا تھا۔ سینے پر بازو لپیٹے، دیوار سے ٹیک لگائے۔ سیاہ جینز اور اسی کلر کی لیدر جیکٹ میں ملبوس پُرسکون، سنجیدہ، نظر اس پر جمائے ہوئے۔ سارہ نے صرف ایک بار اسے سر اٹھا کر دیکھا تھا اور پھر سر جھکا لیا چادر کو ایک بار پھر کھول کر اس نے کندھوں پر ڈال لیا۔

''سارہ! یہ تم سے ملنا چاہتے تھے۔ کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ انھوں نے ہی ہمیں بتایا کہ تم آمنہ نہیں سارہ ہو اور یہ کہ تم ان کی منکوحہ ہو۔''

کمرے میں گل کی آواز گونجی۔ سارہ کا دل نہیں چاہا کہ وہ گل اور عذرا کی شکل دیکھے۔

''ہم ذرا ساتھ والے فلیٹ میں جا رہے ہیں۔ تمھیں ان سے جو بات کرنا ہے کر لو۔'' سارہ نے عذرا کو کہتے اور پھر دروازہ بند کرتے سنا تھا۔

''میں تمھیں صرف یہ سمجھانے آیا ہوں کہ فرار کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔'' کمرے میں اس کی آواز گونجی تھی۔ سارہ نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔ وہ اب پہلے والی جگہ سے آگے بڑھ آیا تھا۔

''مجھے کسی کی کوئی بات نہیں سننی ہے، تم یہاں سے جاؤ۔'' اس کے چہرے کو دیکھے بغیر اس نے کہا تھا۔

''لیکن مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے اور میں یہاں سے جاؤں گا نہیں۔'' وہ اب بھی پُرسکون تھا۔

وہ چلا اٹھی ''میں نے کہا، تم یہاں سے جاؤ۔''

''ہاں چلاؤ اور چلاؤ، اس سے تمہارا ڈپریشن دور ہو جائے گا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں چیخنے چلانے سے انسان کا کتھارسس ہو جاتا ہے اور تمھیں اس وقت اسی ایک چیز کی ضرورت ہے۔'' وہ کسی ماہر سائیکالوجسٹ کی طرح تشخیص کر رہا تھا۔ وہ یک دم چپ ہو گئی۔

''اور مجھے تم سے بہت کچھ پوچھنا بھی ہے۔'' حیدر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''تمھیں جو کچھ پوچھنا ہے اپنے باپ سے پوچھو۔ میرے پاس تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔''

''مجھے پاپا سے جو کچھ پوچھنا تھا پوچھ چکا ہوں، اب تمہاری باری ہے۔ مجھے بتاؤ تم نے مجھ سے کس بات کا بدلہ لیا ہے؟ میں نے تم پر کیا ظلم کیا تھا؟''

''میری ماں نے کسی پر کیا ظلم کیا تھا! تمہارے باپ نے ان سے کس چیز کا بدلہ لیا؟'' وہ فرش پر بچھے ہوئے بستر پر بیٹھ گئی۔

''ہاں۔ تو یہ سوال تمھیں پاپا سے کرنا چاہیے تھا۔ پوچھنا چاہیے تھا ان سے بلکہ میرے ساتھ چلو اور چل کر ان سے پوچھو مگر تم میں اتنی ہمت کہاں کہ تم ان کے سامنے کھڑی ہو کر بات کر سکو۔'' وہ اسے چیلنج کر رہا تھا۔

''میں تمھارے گھر دوبارہ کبھی جانا چاہتی ہوں نہ تمھارے باپ کی شکل دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں ان سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔'' وہ اس پر غرائی تھی۔

''اگر تم میرے باپ کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی تھیں تو پھر تم نے میرا پرپوزل قبول کیوں کیا؟ مجھ سے نکاح کیوں کیا۔ میرے ساتھ۔''

سارہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''تب تک مجھے حقیقت کا پتا نہیں تھا اور مجھے سب کچھ پہلے پتا چل جاتا تو تمھارے ساتھ نکاح تو دور کی بات ہے، میں کبھی تمھارے باپ کے پاس بھی نہ جاتی۔ میں کبھی اس شخص کے پاس جانا پسند نہ کرتی جس نے میری ماں کی زندگی برباد کر دی جس نے ان کو بے عزت کیا۔''

''سارہ! تم یہ بات مت کہو، تمھیں یہ بات کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہاں تمہاری امی کہہ سکتی تھیں کیونکہ ان پر ظلم ہوا تھا اور انھوں نے کسی سے اس کا بدلہ نہیں لیا تھا مگر تم بدلہ لے چکی ہو۔ تم نے مجھے بے عزت کیا ہے اگر تمہاری ماں بے قصور تھیں تو مجھے بتاؤ۔ میں نے کون سا گناہ کیا تھا۔ کیا تم نے سوچا تمھارے اس طرح چلے جانے سے میں لوگوں کے سامنے تماشا بن کر رہ جاؤں گا؟ نہیں، تم نے نہیں سوچا بالکل اسی طرح جس طرح میرے دادا، دادی نے نہیں سوچا تھا۔ اسی طرح جس طرح میرے باپ نے نہیں سوچا تھا۔ تم میں اور ان میں کیا فرق ہے، بتا سکتی ہو تو بتاؤ؟''

وہ ایک کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا تھا۔

''تمہاری امی کا دل مرنے کو چاہا ہوگا۔ میرا دل بھی چاہا تھا میں خودکشی کر لوں تمہاری امی مظلوم تھیں۔ تم مظلوم نہیں ہو۔''

''میں نے تم سے یا کسی سے بھی کوئی بدلہ نہیں لیا۔ میں بس تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ تمھارے گھر آنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے میں وہاں سے بھاگ آئی۔ یہ میں نے بعد میں سوچا تھا کہ اس سے۔''

حیدر نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ''دادا نے بھی یہ بعد میں سوچا تھا کہ انھوں نے تمہاری امی پر ظلم کیا۔ دادی نے بھی یہ بعد میں سوچا تھا کہ انھوں نے تمہاری امی کو رسوا کر دیا، پاپا کو بھی یہ بعد میں خیال آیا تھا کہ انھوں نے تمہاری امی کی زندگی برباد کر دی۔ اگر تم اپنے اس اقدام کو Justify (جائز) کرتی ہو تو ان کو بھی کرو، کوئی بھی غلط کام کرتے ہوئے نہیں سوچتا کہ وہ غلط کام کر رہا ہے۔ ہر ایک بعد میں ہی سوچتا ہے۔ وہ تم ہو پاپا ہوں یا دادا، دادی۔''

سارہ نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''تم چاہتے کیا ہو؟''

''بہت کچھ، یہ کہ تم پاپا کو معاف کر دو اور یہ کہ تم میرے ساتھ چلو۔''

''میں دونوں کام نہیں کر سکتی۔'' اس نے قطعی انداز میں جواب دیا تھا۔

''پھر تیسرا کام میں کر سکتا ہوں یعنی تم کو طلاق دے دوں۔''

سارہ نے بے اختیار سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور پھر گھٹی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ ''دے دو۔''

وہ اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا پھر اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا تھا۔ ”طلاق لے کر کیا کرو گی؟ کیسے رہو گی؟ زندگی کیسے گزارو گی؟“

”ویسے ہی گزاروں گی جیسے میری ماں نے گزاری تھی۔“

”یہی تو مشکل ہے سارہ! کہ تم اپنی امی کی طرح زندگی نہیں گزار سکتیں۔ میں تمہاری امی کے بارے میں وہی کچھ جانتا ہوں جو میں نے لوگوں سے سنا ہے لیکن مجھے لگتا ہے میں ان کو کسی سے بھی بہتر سمجھ سکتا ہوں تم سے بھی بہتر حالانکہ میں نہ کوئی سائیکالوجسٹ ہوں نہ مجھے لوگوں کو سمجھنے کا شوق ہے۔ لیکن پچھلے دو ماہ سے میں ان کے بارے میں اتنا سوچتا رہا ہوں کہ ان کو پسند کرنے لگا ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کوئی اتنا صبر، اتنا ایثار کر سکتا ہے جتنا انھوں نے کیا۔ پاپا کو لگتا ہے کہ صبا نے ان سے بہت محبت کی تھی اور جب انھوں نے انھیں چھوڑ دیا تو پھر صبا نے دنیا ترک کر دی مگر مجھے ایسا نہیں لگتا۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہاری امی کا اور خدا کا ایک بہت خاص رشتہ تھا۔ انھیں صرف خدا کے ہونے پر یقین نہیں تھا۔ یہ بھی اعتماد تھا کہ جو کچھ انھیں مل رہا ہے اس کی وجہ سے ہے اور انھیں لگتا ہوگا کہ خدا نے ان کے گرد ایک حفاظتی دیوار ایک حصار کھینچا ہوا ہے۔ انھیں یہ زعم ہوگا کہ وہ خدا سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ وہ کبھی اس حصار کو ٹوٹنے نہیں دے گا۔ لیکن ہوا کیا میرے دادا، دادی تمہاری امی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ پاپا کے مجبور کرنے پر انھوں نے تمہاری امی سے ان کا نکاح کیا تھا۔ دادا نے تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس رشتے کو قبول کر لیا لیکن دادی نہیں کر پائیں اور پھر وہی عورت کی ازلی رقابت اور سازش، پھر ایک کے بعد ایک ایسے واقعات ہوئے جنھوں نے تمہاری امی کو متزلزل کر دیا۔ انھیں یقین نہیں آیا ہوگا کہ یہ سب ان کے ساتھ ہو سکتا ہے اور تابوت میں آخری کیل میرے پاپا نے طلاق دے کر گاڑ دی۔ تمہاری امی کو لگا عارفین عباس نے نہیں خدا نے انھیں چھوڑ دیا اور پھر ساری زندگی وہ خدا کو منانے کی کوشش کرتی رہیں اور تمھیں پتا ہے ایسے لوگ میرے تمہارے جیسے دنیادار لوگوں کے لیے کتنے خطرناک ہوتے ہیں۔ ان کو منا کر رکھیں تو ان کا غلام بن جانے کو جی چاہتا ہے۔ ان کو تکلیف پہنچائیں تو اللہ سکون چھین لیتا ہے۔ جیسے میرے پاپا کے ساتھ ہوا یا میرے خاندان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہوا، میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ انھیں خوش یا مطمئن نہیں دیکھا جیسے دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں رہی۔ کامیاب بینکر، اچھی خوبصورت بیوی، اولاد، دولت، عزت ان کے پاس کیا تھا جو نہیں رہا۔ ہاں بس سکون نہیں تھا نہ اب ہے۔“

وہ اس طرح اسے سب کچھ بتا رہا تھا جیسے وہ اس کی بہترین دوست ہے جیسے وہ یہی سب بتانے کے لیے وہاں آیا ہو، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی باتیں سنتی گئی۔

”اور وہ اکیلے اس اذیت کا شکار نہیں تھے۔ ہمارے خاندان کے ہر فرد کو اذیت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ دادا کو، دادی کو، پھوپھو کو، میری ممی کو اور اب مجھے اور میں چاہتا ہوں یہ سلسلہ ختم ہو جائے۔ تمہاری امی نے اللہ سے اتنی محبت کی کہ پھر اس کے علاوہ کسی اور چیز کی خواہش نہیں کی مگر سارہ! تمہارا خدا کے ساتھ ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ تم کبھی صبا کریم جیسی قناعت حاصل نہیں کر سکتیں۔ تم گھر چھوڑ سکتی ہو، دنیا کو نہیں تمہاری امی تمہاری طرح کسی اکیڈمی میں نہیں گئیں نہ انھوں نے اپنے سرٹیفکیٹس حاصل کرنے کی کوشش کی کیونکہ انھوں نے اب کسی Materialistic Pursuit میں شریک نہیں ہونا تھا اور تم نہ دنیا چھوڑ سکتی ہو نہ خدا کو۔ کچھ وقت گزرے گا پھر تمھیں پچھتاوے ہونے لگیں گے اور میں چاہتا ہوں اس وقت سے پہلے تم واپس آ جاؤ تمھیں یاد رکھنا چاہیے کہ تمہاری امی نے تمھیں میرے پاپا کے پاس بھجوا دیا تھا۔ ان کی یہ خواہش ہوگی کہ تم ان جیسی زندگی نہ گزارو، عام

لوگوں کی طرح نارمل زندگی گزارو۔ اپنے ماضی سے بے خبر رہ کر اسی لیے انھوں نے تمھیں اپنے بہن بھائیوں کے پاس نہیں بھیجا۔ انھیں خدشہ ہو گا وہ ان کے اور تمھارے ماضی کو چھپا کر نہیں رکھیں گے اور یہ باخبری تمھیں ساری عمر تکلیف دیتی رہے گی۔ میرے پاپا یہ کام کر سکتے تھے سو انھوں نے تمھیں ان کے پاس بھجوا دیا۔ تمھارے نانا، ماموں اور خالہ نے تمھیں ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ تم نہیں ملیں۔ ایک ماہ پہلے وہ واپس چلے گئے۔ اب تمھیں صرف میں اور پاپا ڈھونڈ رہے تھے۔''

سارہ نے ایک بار پھر اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔

''تم سے میں ایک بار پھر کہوں گا۔ میرے ساتھ گھر چلو، پاپا سے ناراضگی ہے، ان سے لڑو، جو کہنا ہے کہہ دو۔ مجھ سے اگر کوئی شکایت ہے تو کرو لیکن میرے ساتھ چلو۔''

وہ چہرہ چھپائے بے آواز روتی گئی تھی۔

''ہاں۔ تم نے سچ کہا۔ مجھے امی کی طرح دنیا میں رہنا نہیں آ رہا نہ کبھی آ سکتا ہے۔ امی کی طرح زندگی گزارنا بہت مشکل ہے اور میں۔ میں بہت کمزور ہوں۔''

وہ روتی ہوئی دل ہی دل میں اعتراف کر رہی تھی۔

دور کہیں سائرن بجنے لگا تھا۔ پھر اذان ہونے لگی۔ حیدر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور تپائی پر رکھے ہوئے لفافوں کو کھول کر دیکھنے لگا۔ اس نے ایک کھجور نکال کر روزہ افطار کیا تھا۔

گل اور عذرا اندر آ گئی تھیں۔

''اس کو پھر دورہ پڑ گیا؟'' گل نے سارہ کو دیکھتے ہی بے اختیار کہا تھا۔ حیدر نے شاپر سے ایک کیلا نکال کر کھانا شروع کر دیا۔

''سارہ! روزہ تو افطار کر لو'' عذرا کچن سے ایک پلیٹ میں کچھ چیزیں رکھ کر اس کے پاس آ گئی تھی۔ اس نے سر اٹھایا تھا اور آستینوں سے چہرہ خشک کرنا شروع کر دیا پھر اس نے پلیٹ میں سے ایک کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال لی اور کھڑی ہو گئی، بستر پر رکھے ہوئے بیگ کو اس نے کندھے پر ڈال لیا تھا۔ حیدر مسکرایا اور اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا اس نے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ تھما دیا۔

''تم جا رہی ہو تو اپنا سامان تو لے جاؤ'' عذرا اسے جاتے دیکھ کر چیخی تھی۔

''نہیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ خدا حافظ'' اس نے دروازہ پار کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ اس کا ہاتھ تھامے کسی ننھے بچے کی طرح وہ اس کے پیچھے چلتی جا رہی تھی۔

''پچھلے دو ماہ سے میں اپنی پوری سیلری تمھیں ڈھونڈنے پر خرچ کر رہا ہوں بلکہ اکاؤنٹ میں جو تھوڑے بہت روپے تھے وہ بھی خرچ کر چکا ہوں۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ اس لیے اب تمھیں چند سال اور میری طرح پاپا پر انحصار کرنا پڑے گا۔ حد سے زیادہ چھٹیوں پر بینک والوں کی طرف سے بھی ایک وارننگ لیٹر مل چکا ہے۔ تم نے مجھے صحیح معنوں میں خوار کیا ہے۔''

اس کا ہاتھ تھامے نیم تاریک سیڑھیوں میں اس کے آگے چلتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

''تم یہاں تک کیسے پہنچے؟'' سارہ کو یک دم خیال آیا۔

''میں جانتا تھا کہ اگر تم ہاسٹل میں نہیں تو پھر اسی طرح کے کسی فلیٹ میں ہوگی۔ تم کسی بڑے پراپرٹی ڈیلر کے پاس تو جا نہیں سکتی تھیں۔ اس لیے ظاہر ہے کسی چھوٹے موٹے پراپرٹی ڈیلر کے پاس ہی جاتیں۔ پولیس نے تمام چھوٹے موٹے پراپرٹی ڈیلرز کو کانٹیکٹ کیا اور تمھارے بارے میں معلومات لینا شروع کیں۔ بالآخر ایک کے ذریعے تمہارا پتا مل گیا پھر آج دوپہر کو ہم یہاں تک پہنچ گئے۔ تمھارے ساتھ رہنے والی لڑکیوں کو تمہاری فیکٹری کا پتہ نہیں تھا ورنہ میں سیدھا وہیں آتا۔'' وہ کہتا گیا تھا۔

''حیدر زیادہ باتیں نہیں کرتا، بہت ریزرو ہے بلکہ یہ کہہ سکتی ہو کہ کم گو ہے۔ وہ کسی سے زیادہ بے تکلف بھی نہیں ہوتا۔ یہ سب اس کی عادتوں میں شامل ہے۔'' عارفین عباس نے ایک بار اسے حیدر کے بارے میں بتایا تھا۔

سارہ نے اس ''کم گو'' کو دیکھا جو اس کا ہاتھ تھامے سیڑھیاں اترتے ہوئے مسلسل بول رہا تھا۔

''مجھے اکثر چیزوں کا پتا بعد میں چلتا ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''جیسے یہ کہ تمہاری امی اور پاپا کا اصل رشتہ کیا تھا؟ وہ کون تھیں اور ان کے ساتھ کیا ہوا تھا یا یہ کہ میں اگر ہر دفعہ تم تک پہنچنے میں ناکام ہو جاتا تھا تو اس کی وجہ میری گاڑی تھی جس کی موجودگی نے ہر دفعہ تمھیں پہلے ہی خبردار کر دیا یا پھر یہ کہ۔ کہ میں تم سے محبت کرنے لگا تھا اور یہ کہ یہ محبت یکطرفہ نہیں تھی۔''

سارہ کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''ہاں اور یہ بھی کہ تم فرنچ جانتی تھیں۔'' وہ یک دم فرنچ بات کرنے لگا تھا۔

''اس لاعلمی سے مجھے کیا نقصان پہنچا۔ یہ تم مجھے گھر پہنچ کر بتانا۔'' وہ سیڑھیاں اتر کر عمارت سے باہر آ گئے تھے۔

''اوئے ہوئے! ٹائی ٹینک کا ہیرو اور ہیروئن جا رہے ہیں۔''

پاس سے گزرتے ایک لڑکے نے سیٹی بجاتے ہوئے تبصرہ کیا تھا۔ حیدر نے جھینپتے ہوئے بے اختیار اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ سامنے سڑک پر بہت رش تھا۔ زندگی کا رستہ اتنا ہی صاف نظر آنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر آسمان پر چاند دیکھنے کی پہلی کوشش کی تھی۔

...........✿...........

یہ جو اک صبح کا ستارا ہے

آج اس کی زندگی کا پہلا انٹرویو تھا اور اپنی باری آنے سے پہلے ہی وہ یہ جاب مل جانے کی امید چھوڑ چکی تھی۔ وزیٹرز روم میں اس کے ساتھ جو دوسری لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں، وہ ہر لحاظ سے اس سے بہتر تھیں اور وہ خود بھی ذہنی طور پر ان کے حق میں دستبردار ہو چکی تھی۔ مگر پھر بھی وہ انٹرویو دے دینا چاہتی تھی کیونکہ وہاں تک آنے میں وہ کافی کرایہ خرچ کر چکی تھی۔ وزیٹرز روم کے ایک کونے میں بیٹھ کر وہ خاموشی سے اپنے اردگرد بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی باتیں اور قہقہے سنتی رہی۔ جس لڑکی کے چہرے پر وہ نظر ڈالتی، اسے لگتا کہ یہ جاب اسے ہی مل جائے گی اور وہ جاب بے شک سیکرٹری کی تھی مگر وہ جس فرم میں تھی اور اس کے اور اس کے ساتھ جو مراعات دی گئی تھیں وہ کافی کوالیفائیڈ لڑکیوں کو وہاں کھینچ لائی تھی۔ وہ خود بھی صرف قسمت آزمائی کے لیے آئی تھی ورنہ اسے قطعاً کوئی امید نہیں تھی کہ جو دو لڑکیاں اس فرم کو سیکرٹری کے طور پر چاہئیں ان میں اس کا نام بھی ہو سکتا ہے اور یہاں آ کر تو وہ بالکل مایوس ہو چکی تھی اس وقت وزیٹرز روم میں ایک کونے میں بیٹھی وہ Odd one out کی بہترین مثال لگ رہی تھی۔ کسی قسم کے میک اپ سے بے نیاز چہرے اور گھٹنوں تک لمبی چادر میں خود کو لپیٹے وہ رنگین و سنگین ملبوسات اور لہراتے آنچلوں کی اس بھیڑ میں کافی احمق لگ رہی تھی۔

اب اسے یاد آ رہا تھا کہ صبح آتے ہوئے خالہ کی بات نہ مان کر اس نے کتنی بڑی غلطی کی تھی جو بار بار اس سے کہہ رہی تھیں کہ وہ اس قسم کی جاب کے لیے جانے سے پہلے اپنا ظاہری حلیہ تو ٹھیک کرے۔ انھوں نے بہت زور لگایا تھا کہ وہ چادر کے بجائے دوپٹہ اوڑھ لے اور کچھ میک اپ اور جیولری بھی پہن لے مگر وہ قطعاً نہیں مانی تھی۔ وہ خوفزدہ تھی کہ اسے اتنی دور جانا ہے اور وہ بھی اکیلے اور اگر وہ کچھ سج سنور کر جائے گی تو کیا ہوگا پھر اس کے ذہن میں یہ بھی تھا کہ وہ ایک فرم میں جا رہی ہے جہاں مردوں کی اکثریت ہوگی اور اگر وہ کچھ بناؤ سنگھار کر کے گئی تو پتا نہیں ان کا رویہ اس کے ساتھ کیسا ہو اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے یہ امید ہی نہیں تھی کہ وہ اسے ملازمت دیں گے، کیونکہ وہ اشتہار میں موجود کوائف پر بھی پورا نہیں اترتی تھی وہ تو صرف اپنی جھجک ختم کرنے کے لیے آئی تھی۔ سو خود پر توجہ دینا اس نے ضروری نہیں سمجھا مگر اب اسے یہ سب باتیں احمقانہ لگ رہی تھیں۔

''اگر یہ سب لڑکیاں اس طرح یہاں آ سکتی ہیں تو میں بھی آ سکتی تھی۔ خالہ ٹھیک سمجھا رہی تھیں۔''

بار بار اس کے ذہن میں یہی خیال آ رہا تھا۔ اس کی باری آ ہی گئی تھی۔ فائل کو سینے سے لگائے چادر سنبھالتی دھڑکتے دل اور لرزتے قدموں کے ساتھ وہ اندر داخل ہوئی۔ اندر کا ماحول اسے ٹھنڈے پسینے دلانے کے لیے کافی تھا۔ وزیٹرز روم کی ڈیکور نے ہی اسے بہت مرعوب کیا ہوا تھا۔ لیکن یہ کمرہ اس سے بھی زبردست تھا۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر گلاس ٹاپ ٹیبل کے پیچھے ریوالونگ چیئر میں بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ آدمی پر پڑی تھی۔ دوسرا آدمی قدرے کم عمر تھا اور وہ ٹیبل کی دائیں طرف رکھی ہوئی دو کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا ہوا تھا۔

''پلیز تشریف رکھیے۔'' ٹیبل کے پاس پہنچنے پر ادھیڑ عمر آدمی نے اسے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''پلیز اپنی فائل دکھائیں۔'' دائیں طرف بیٹھے ہوئے آدمی نے اس سے کہا تھا کانپتے ہاتھوں سے اس نے فائل اس کی طرف بڑھادی۔

''آپ کا نام؟'' ادھیڑ عمر آدمی اس سے پہلا سوال کیا تھا۔

''رومیصہ عمر۔'' اس کے حلق سے بمشکل آواز نکلی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا سوال کرتا۔ کمرے کے بائیں کونے میں موجود ادھ کھلا دروازہ کھول کر کوئی کمرے میں داخل ہوا تھا اور دیوار کے ساتھ شیلف پر رکھے ہوئے کمپیوٹر کو کھڑے کھڑے آپریٹ کرنے لگا تھا۔ وہ صرف اس کی پشت دیکھ سکتی تھی۔ دونوں آدمیوں کی نظر صرف ایک لمحہ کے لیے ادھر گئی تھی اور پھر دوبارہ ان کی توجہ اس پر مبذول ہو گئی تھی۔

''آپ کا نام رومیصہ ہے اور آپ کی کوالیفیکیشن ؟''

ادھیڑ عمر آدمی نے دوبارہ سلسلہ وہی سے جوڑا تھا۔ اس نے ٹشو سے ناک پر آیا پسینہ خشک کیا۔ حالانکہ کمرہ میں اے سی چل رہا تھا۔

''ایف اے'' اسے لگا تھا۔ اس کے جواب پر کمپیوٹر پر کام کرتا ہوا آدمی مڑا تھا۔ مگر وہ اس وقت اپنی توجہ ادھیڑ عمر آدمی پر مبذول کیے ہوئے تھی۔ جس نے اس کے جواب پر اپنی بائیں ابرو اچکائی تھی۔

''آپ ایف اے پاس ہیں۔ آپ کو علم ہے کہ ہم نے گریجویٹ کے لیے اشتہار دیا تھا۔''

''یس'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا تھا۔ کمپیوٹر پر کام کرتا ہوا بندہ اب باقاعدہ رخ موڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ ادھیڑ عمر آدمی کچھ دیر تک خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے پوچھا۔

''آپ کو کوئی تجربہ ہے؟ اس بار اس نے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ خشک کیا تھا "No"

"Can you operate computer?" (آپ کمپیوٹر آپریٹ کر سکتی ہیں) اس نے ایک اور سوال داغا تھا۔

جواب اب بھی وہی تھا "No"

"Do you know how to typ?" (آپ ٹائپ جانتی ہیں؟)

اس نظر ٹیبل کی چمکتی ہوئی سطح پر جمادی "No"

''شارٹ ہینڈ۔'' "No"

"Do you know how to "handle telephone exchange?"

(آپ ٹیلیفون ایکسچینج ہینڈل کر سکتی ہیں) "No" سوالوں کی ایک لمبی قطار کا جواب اس نے ایک ہی لفظ سے دیا تھا۔ ہر بار وہ نظر اٹھاتی اور پھر ٹیبل پر نظر جمالیتی۔

''تو بی بی! پھر آپ نے ہمارا وقت ضائع کیوں کیا؟'' پہلا جملہ اردو میں اسی ادھیڑ عمر نے بولا تھا مگر اس بار کا لہجہ کافی ترش تھا۔ رومیصہ کو اپنی گردن ایک دم دو من کی لگنے لگی تھی۔

"Who is your favourite actor?" (آپ کا پسندیدہ ایکٹر کون ہے) کمرے کی خاموشی کو اس بار ایک اجنبی آواز نے توڑا

تھا۔ رومیصہ نے گردن اٹھا کر ادھیڑ عمر آدمی کو دیکھا تھا، جس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھری تھی۔ پھر اس نے آواز کی سمت میں دیکھا تھا۔ کمپیوٹر پر کام کرنے والا بندہ اب دونوں بازو سینے پر لپیٹے شیلف سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ بلیو جینز اور بلیک شرٹ میں وہ بے حد خوبصورت لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی سنجیدگی سے یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے کوئی بہت اہم سوال پوچھا تھا۔ وہ چند لمحے کچھ کہے بغیر اسے دیکھتی رہی اور پھر اس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف گردن موڑ لی۔ وہ اس قسم کے سوال کا جواب دینا نہیں چاہتی تھی۔ مگر ادھیڑ عمر آدمی نے...... کہا۔

''آپ اس سوال کا جواب دیں۔''

''کوئی بھی نہیں۔'' دھیمی آواز میں اس نے کہا تھا۔

"Why?" (کیوں؟) اس نے پھر اس بندے کو دیکھا تھا جواب بھی اسی انداز میں کھڑا تھا۔

''میں فلمیں نہیں دیکھتی۔'' اس نے کہا تھا۔

"Why?" (کیوں؟) اس بار اس نے بے چارگی سے اسے دیکھا۔ لیکن اس بندے کو شاید اس پر ترس نہیں آیا تھا۔

"Your favourite T.V actor?" (آپ کا پسندیدہ ٹی وی فنکار؟)

''میں ٹی وی نہیں دیکھتی۔''

"Why?" اس بار پھر وہی سوال دہرایا گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ اس نے سوال کا جواب دیے بغیر اس بندے کی طرف سے نظر ہٹا کر سامنے دیکھنا شروع کر دیا۔ مگر وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر ادھیڑ عمر آدمی کی کرسی کی طرف آ گیا تھا۔ جس نے اپنی کرسی اس کے آنے پر خالی کر دی تھی اور خود دوسرے آدمی کے ساتھ والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"Who is you favourite author?" (آپ کا پسندیدہ مصنف کون ہے؟)

اپنا پچھلا سوال دہرانے کے بجائے ریوالونگ چیئر پر بیٹھتے ہی اس نے اگلا سوال کیا تھا۔

''میں کتابیں نہیں پڑھتی۔'' اسے اپنے بالکل سامنے موجود پا کر وہ کچھ سراسیمہ ہو گئی تھی۔

"What are your passtimes then?" (پھر آپ وقت کیسے گزارتی ہیں؟) ریوالونگ چیئر پر آگے پیچھے جھولتے ہوئے اس نے اگلا سوال پوچھا تھا۔ اس بار وہ چپ رہی۔

''فادر کیا کرتے ہیں آپ کے؟'' اس بار اس نے اردو میں پوچھا تھا۔

''وہ مر چکے ہیں۔''

''اور آپ کی مدر؟''

''وہ بہت سال پہلے وفات پا چکی ہیں۔''

تاسف کا کوئی تاثر اس شخص کے چہرے پر نہیں ابھرا تھا۔ نہ ہی لہجے میں کوئی نرمی آئی تھی۔

''بہن بھائی ہیں؟''

''نہیں۔''

''کس کے پاس رہتی ہیں؟''

''خالہ کے پاس۔''

''آپ کو پتا ہے سیکرٹری کی جاب کتنی مشکل ہوتی ہے؟'' وہ اس کے سوال پر اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔

''ہم لوگ بہت سہولیات دیتے ہیں مگر کام میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کرتے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ورکنگ آورز کے بعد بھی آفس میں ٹھہرنا پڑ جاتا ہے، خاص طور پر جب کوئی ڈیلنگ ہو رہی ہو کسی غیر ملکی پارٹی سے اور ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے۔ بعض دفعہ رات تک ٹھہرنا پڑ سکتا ہے۔ آپ یہ شیڈول فالو کر سکتی ہیں؟''

اس بار اس نے کسی مشکل کے بغیر جواب دیا تھا۔ ''نہیں۔''

اس شخص نے اس جواب پر چند لمحوں کے لیے دوسرے دو آدمیوں کو دیکھا پھر چیئر کو آگے پیچھے جھلاتے ہوئے وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا جو اب دوبارہ ٹیبل پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

''اگر آپ کو ملازمت دے دیں تو کیا آپ اتنی ہی بڑی چادر اوڑھ کر آتی رہیں گی؟''

رومیصہ نے کچھ حیرانی سے اپنے مدمقابل کو دیکھا تھا۔

''میں دوپٹہ لے لیا کروں گی۔''

اس شخص کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری تھی وہ فوراً ہی غائب ہو گئی تھی۔ مزید کچھ کہے بغیر وہ یک دم کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے۔ انھیں اپائنٹ کر لیں اور اپائنٹمنٹ لیٹر ابھی دے دیں۔''

وہ دوبارہ اس پر نظر ڈالے بغیر ادھیڑ عمر آدمی کو یہ ہدایت دینے کے بعد کمپیوٹر کی طرف چلا گیا تھا اور پرنٹر سے کچھ کاغذات نکالنے کے بعد اسی تیز رفتاری سے اس ادھ کھلے دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ وہ ہکا بکا ہو کر اسے جاتے دیکھتی رہی۔

''ٹھیک ہے۔ آپ وزیٹرز روم میں بیٹھیں۔ کچھ دیر بعد آپ کو اپائنٹمنٹ لیٹر مل جائے گا۔''

ادھیڑ عمر آدمی نے اب یکسر بدلے ہوئے لہجے میں اس سے کہا تھا۔ وہ کچھ پوچھے بغیر حیرت کی اسی کیفیت میں باہر آ گئی تھی۔ اس سہ پہر واپس گھر آتے ہوئے بھی وہ حیرانگی کی اس کیفیت سے باہر نہیں آئی تھی۔

''کیا انٹرویو ایسا ہوتا ہے؟'' بار بار اس کے دماغ میں یہی سوال آ رہا تھا۔

اگر دنیا میں پہلی نظر میں محبت نام کی کوئی چیز تھی تو اس دن نبیل سکندر بری طرح اس کا شکار ہوا تھا۔ یہ صرف اتفاق ہی تھا کہ اس روز اس کے کمرے میں موجود کمپیوٹر خراب ہو گیا تھا اور وہ مینیجر کے کمپیوٹر پر کام کرنے کے لیے ان کے آفس میں گیا جب وہ انٹرویوز ہو رہے تھے۔ ایک سیکرٹری کا انتخاب اسی کے آفس کے لیے ہو رہا تھا مگر وہ ان کے معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ ہمیشہ مینیجر ہی انٹرویوز کر کے فرم کے مختلف حصوں کے لیے سیکرٹریز اپائنٹ کیا کرتے تھے اور اسے ان کے انتخاب پر کبھی شکایت نہیں ہوتی تھی۔ سو اس روز بھی کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے وہ آتے جاتے ہوئے امیدوار لڑکیوں پر نظر ڈالتا رہا۔ اچانک اسے کچھ کاغذات کی ضرورت پڑی تھی۔ انہیں لینے کے لیے وہ اپنے آفس گیا تھا اور واپس آ کر وہ پرنٹر سے کچھ ڈاکومنٹس نکال رہا تھا۔ جب غفور صاحب کے سوالوں پر اس نے گھبرائی ہوئی مدھم آواز میں کسی لڑکی کے جواب سنے تھے۔ کچھ دلچسپی سے اس نے مڑ کر دیکھا اور اس لڑکی نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ دوبارہ کمپیوٹر کی طرف متوجہ نہیں ہو سکا۔ غفور صاحب کے سوالوں پر وہ شرمندگی سے سر جھکائے اپنی نااہلیت کا اقرار کرتی رہی۔ وہ زیادہ دیر تک چپ نہیں رہ پایا اور اس نے جان بوجھ کر ایک بہت احمقانہ سا سوال پوچھا تھا۔ اس لڑکی نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت تھی اور اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات نے نبیل سکندر کو کچھ لمحوں کے لیے منجمد کر دیا تھا۔ وہ بے حد خوبصورت تھی اور شاید کچھ اور بھی تھا اس میں کوئی ایسی کشش کوئی ایسی چیز جسے وہ سمجھ نہیں پایا۔ وہ خود کو انٹرویو میں انوالو کرنے سے باز نہیں رکھ سکا۔ وہ جانتا تھا وہ اس کے سوالوں پر بہت پریشان تھی بلکہ روہانسی ہو رہی تھی۔ مگر وہ بس اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے دیکھتے رہنا چاہتا تھا۔ اس کی آواز سننا چاہتا تھا۔ اس نے اسے اپائنٹ کر لیا تھا۔

انٹرویوز ختم ہونے کے بعد غفور صاحب نے اس کے پاس آ کر اسے فیصلہ کے کچھ مضمرات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے بہت پرسکون انداز میں کہا تھا۔

''وہ سب کچھ سیکھ جائے گی۔ اس میں اتنی صلاحیت ہے اور ویسے بھی وہ میرے آفس میں کام کرے گی، وہاں پر ورک لوڈ اتنا زیادہ ہے بھی نہیں کہ میرے لیے کوئی پرابلم ہو۔ آپ پریشان نہ ہوں۔''

غفور صاحب نے دوبارہ کچھ کہنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سمجھدار آدمی تھے۔ جان گئے تھے کہ اس لڑکی کو اس کی خوبصورتی کی وجہ سے جاب دی گئی ہے اور یہ واحد قابلیت تھی جو نبیل سکندر کو متاثر کرتی تھی۔ وہ خود خوبصورت تھا اور خوبصورت چیزوں کے عشق میں گرفتار ہونے کا کافی شوق تھا اسے۔ چاہے وہ کوئی لڑکی ہو یا پھر کسی دکان میں پڑا ہوا ڈیکوریشن پیس۔ وہ دونوں کو ایک ہی طریقے سے سراہتا تھا۔ جب تک دل نہیں بھرتا۔ وہ اس کی نظروں کے سامنے رہتے پھر ان کی جگہ کوئی اور لے لیتا۔ کچھ اس سے بہتر چیز کوئی اس سے اچھی لڑکی۔

سکندر علی کے چھ بیٹے تھے۔ نبیل سکندر تیسرے نمبر پر تھا۔ اس سے بڑے اشعر اور احمر تھے اور ذیشان، فراز اور ولید اس سے چھوٹے تھے۔ سکندر علی ملک کے چند نامور ایکسپورٹرز میں سے تھے۔ اور نبیل بھی اپنے بڑے بھائیوں کی طرح باپ کے ساتھ سرجیکل اور لیدر گڈز کے بزنس میں شریک تھا۔ اس نے امریکا سے بی بی اے کیا تھا اور پھر اسٹڈیز میں اس کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ سکندر علی چاہتے تھے کہ وہ امریکا میں ہی رہے تاکہ وہاں ان کے آفس کو اسٹیبلش کیا جا سکے۔ وہ خود بھی اس پروجیکٹ میں انٹرسٹڈ تھا۔ اس لیے وہ امریکا میں ہی رہنے لگا تھا۔ پانچ چھ سال تک وہ مستقل امریکا

میں ہی رہا اور جب وہاں ان کا آفس اچھی طرح اسٹیبلش ہو گیا تو اس نے سال کا کچھ حصہ پاکستان میں گزارنا شروع کر دیا تھا۔

وہ سال میں تین چار بار پاکستان آتا۔ شادی سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اسے ایک فضول ذمہ داری سمجھتا تھا اور سوچتا تھا کہ اگر شادی کبھی کی بھی تو صرف اس وقت کروں گا جب کسی لڑکی سے اتنی انڈراسٹینڈنگ ہو جائے گی کہ وہ مجھ پر فضول پابندیاں لگانے کی کوشش نہ کرے اور مجھے اپنی زندگی اپنے طریقے سے گزارنے دے۔ یہی وجہ تھی کہ بتیس سال کا ہونے کے باوجود ابھی تک وہ خود کو شادی کے لیے آمادہ نہیں کر پایا تھا۔

اس کے بڑے دونوں بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی اور وہ دونوں بہت پر سکون زندگی گزار رہے تھے مگر یہ سکون بھی اسے شادی کی طرف اٹریکٹ نہیں کرتا تھا۔ سکندر علی کا وہ لاڈلا تھا اس لیے ان کی طرف سے اس پر کوئی پریشر نہیں تھا اور حیرت کی بات یہی تھی کہ ساری اولاد میں سے سکندر علی اگر واقعی کسی کو چاہتے تھے تو وہ نبیل ہی تھا۔ نہ انہیں اپنے سب سے بڑے بیٹے اشعر سے اتنا لگاؤ تھا نہ سب سے چھوٹے بیٹے ولید سے اتنی محبت تھی۔ جتنی وہ نبیل سے کرتے تھے۔ وجہ شاید یہ تھی کہ نبیل ان سے بہت مشابہت رکھتا تھا۔ یا پھر شاید یہ بات تھی کہ بہت عرصے تک بیرون ملک ان سے الگ رہا تھا، اس لیے وہ اسے زیادہ چاہنے لگے تھے اور شاید ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ نبیل کسی دوسرے کے لیے اچھا ہو یا نہ ہو، وہ کم از کم ایک فرمانبردار بیٹا ضرور تھا۔ وہ نہ صرف فرمانبردار بلکہ بہت محنتی بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے مختصر عرصے میں امریکا میں ان کے لیے ایک اچھی خاصی مارکیٹ بنادی تھی۔ اس وقت ان کی پچاس فیصد ایکسپورٹس امریکا کو ہی ہو رہی تھیں اور اس میں بڑا ہاتھ نبیل کا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اس پر کبھی کوئی روک ٹوک کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نہ ہی کوئی پابندی لگائی تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اس کی حرکتوں کے بارے میں مکمل طور پر بے خبر تھے، مگر پھر بھی وہ اس سب کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ سو نبیل سکندر کو ہر معاملے میں خاصی چھوٹ تھی۔ روپے کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں تھی اور جس معاشرے میں وہ رہتا تھا وہاں یہ چیز ہو تو پھر کچھ بھی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ پھر وہ جسمانی طور پر بھی اتنا خوبصورت تھا کہ صنف مخالف کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کوئی خاص محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔

امریکا میں اس کی کافی گرل فرینڈز تھیں اور ان میں سے اکثر بہت اچھی فیملیز سے تعلق رکھتی تھیں۔ سکندر علی کو قطعاً اعتراض نہ ہوتا، اگر وہ ان میں سے کسی سے شادی کرنا چاہتا۔ مگر نبیل سکندر کو صرف وقتی تعلق بنانے کی عادت تھی۔ وہ انہیں مستقل کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔ یہ عادت اچھی تھی یا بری، وہ کبھی نہیں جان سکا، کیونکہ اسے اس عادت سے کبھی نقصان اٹھانا نہیں پڑا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اسے پہلے کبھی کسی سے عشق ہوا ہے نہ ہو، کئی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ خود کو محبت کی بیماری میں مکمل طور پر گرفتار سمجھنے لگا تھا۔ مگر یہ کیفیت بہت عارضی ثابت ہوئی تھی۔ مگر اس بار اس نے قدرے مختلف قسم کے جذبات محسوس کیے تھے۔

❁

وہ سوچتی تھی کہ پہلے دن آفس جا کر اسے بہت سے مسائل پیش آئیں گے، مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے آفس کی گاڑی نے اسے پک کر لیا تھا اور آفس میں پہلے ہی اس کے انتظار میں عافیہ نام کی ایک لڑکی موجود تھی۔ وہ کمپیوٹر سیکشن میں کام کرتی تھی اور رومیصہ کو اس کا آفس دکھانے لے گئی تھی اور اپنا آفس دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی اگرچہ وہ وزیٹرز روم بھی تھا مگر اگر وہاں کوئی موجود نہ ہوتا تو وہ کسی بگ باس کے

آفس کا منظر پیش کرتا تھا کم از کم رومیصہ کو یونہی لگا تھا۔ اسے اپنی ٹیبل پر بے پناہ رشک آیا تھا۔ جس پر ہر جدید سہولت موجود تھی۔ ایئر کنڈیشنڈ روم میں ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر اس نے خود کو بے حد معتبر محسوس کیا تھا۔

''تم اس آفس میں کام کرو گی نبیل سکندر صاحب کے ساتھ۔ وہ آفس میں قدرے دیر سے آتے ہیں۔ اس لیے ان کے آنے سے پہلے تم ہر روز میرے ساتھ رہا کرو گی۔ میں تمھیں کمپیوٹر اور فیکس وغیرہ کے بارے میں تھوڑا ٹرین کر دوں گی۔ ٹیلی فون ایکسچینج ہینڈل کرنا تو خیر اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے اور پھر تمہاری خوش قسمتی ہے کہ نبیل سکندر صاحب کے آفس میں کام بھی زیادہ نہیں ہے۔ ورنہ تم کسی دوسرے سیکشن یا آفس میں بغیر تجربے یا ان چیزوں کے علم کے بغیر آتیں تو تمھارے لیے بہت مشکل ہو جاتی۔ بہر حال تمھیں یہ سب سیکھنے کے لیے کافی وقت مل جائے گا۔''

عافیہ اسے بتاتی گئی تھی۔ ''نبیل سکندر تو یہ میرے باس کا نام ہے۔'' اس نے سوچا تھا۔ اس دن عافیہ نے اسے صرف ٹیلی فون ایکسچینج کو ہینڈل کرنا سکھایا تھا۔ دو گھنٹے تک وہ اس کے ساتھ بیٹھی فرم کے مختلف آفسز اور فیکٹری کے مختلف حصوں سے لنک اور ڈی لنک ہونا سیکھتی رہی۔

پھر عافیہ اسے اس کے آفس میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اپنے آفس کی تنہائی میں وہ بڑی آزادی سے ہر چیز کو دیکھتی رہی۔ یہ احساس کہ وہ ان تمام چیزوں کو اپنی مرضی سے استعمال کر سکتی ہے۔ بہت خوبصورت تھا۔ عافیہ اسے کوئی کام سونپ کر نہیں گئی تھی اس لیے کچھ دیر تک اپنے آفس کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد وہ اپنی چیئر پر آ کر بیٹھ گئی۔ آج وہ اپنی چادر کو گھر چھوڑ آئی تھی مگر چادر کے بجائے اس سے کچھ کم لمبائی اور چوڑائی کا دوپٹہ اسی انداز میں اوڑھے ہوئے تھی۔

کچھ ہمت کر کے اس نے چہرے پر لپ اسٹک اور آئی لائینر کا اضافہ بھی کر لیا تھا۔ مجموعی طور پر اس کا حلیہ انٹرویو والے دن سے کافی بہتر تھا۔ اور اس دن کی طرح اسے فرم میں کام کرنے والی دوسری لڑکیوں کو دیکھ کر کسی قسم کا احساس کمتری نہیں ہو رہا تھا۔ تقریباً بارہ بجے کا وقت تھا۔ وہ پچھلے آدھ گھنٹہ سے اپنی چیئر پر بیٹھی خالی الذہنی کی کیفیت میں سامنے والی کھڑکیوں پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ جب ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر کوئی بڑی تیز رفتاری سے اس کے آفس میں داخل ہوا تھا۔ اس نے کچھ ہڑبڑا کر اس اچانک آنے والے کو دیکھا تھا۔ بلیک پینٹ، سفید ہاف بازوؤں والی شرٹ کے اوپر رائل بلو اسٹرپس والی ٹائی لگائے ہاتھ میں بریف کیس تھامے کلون سے مہکتا ہوا وہ لمبا چوڑا وجود ایک بار پھر اس کے سامنے تھا۔ وہ صرف ایک لمحے کے لیے اس کے سامنے رکا تھا۔

"So you are here. Alright"

Just come into my room (اچھا تو آپ یہاں ہیں۔ ٹھیک ہے ذرا میرے کمرے میں آئیں۔)

وہ مسکراتے ہوئے اس کے سامنے سے گزر کر اگلا دروازہ کھول کر اندر غائب ہو گیا تھا۔ وہ چند لمحوں تک ساکت بیٹھی دروازے کو دیکھتی رہی۔ ابھی بھی اسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ اس کا باس ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی جگہ سے ہلی نہیں مگر چند لمحوں بعد ہی ٹیبل پر موجود انٹر کام کی بزر ہونے لگی تھی۔ اس نے نیم دلی سے ریسیور اٹھایا۔

''مس رومیصہ! پلیز میرے آفس میں آئیں۔''

''یس سر۔'' گھٹے ہوئے لہجے میں اس نے کہا تھا۔

''تو یہ نبیل سکندر ہے۔'' وہ جو کسی ادھیڑ عمر باس کی منتظر تھی اب یہ جان کر ایک صدمے کی کیفیت میں تھی کہ نہ صرف باس نوجوان تھا بلکہ اس کے سامنے اس کا پہلا امپریشن بھی کچھ اچھا نہیں تھا۔ بادل نخواستہ وہ اٹھ کر اندر چلی آئی تھی۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا موبائل پر کسی کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ بڑی بے دلی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تھی۔ چند منٹوں تک وہ موبائل پر مصروف گفتگو رہا مگر اس کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز رہیں جو ٹیبل کو گھورنے میں مصروف تھی۔ اس کے چہرے پر موجود بیزاری اس کی تیز نظروں سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ موبائل بند کر کے ٹیبل پر رکھتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

''کیا آپ کو اپنا آفس پسند نہیں آیا؟'' وہ اس تیکھے سوال پر گڑبڑا گئی تھی۔

''نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''تو پھر آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟''

''نہیں میں پریشان تو نہیں ہوں۔'' اس نے اسے یقین دہانی کروانے کی کوشش کی تھی۔

وہ کچھ لمحوں تک خاموشی سے جیسے اس کے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کرتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر اس نے کہا۔

''آل رائٹ۔ میں مان لیتا ہوں کہ آپ پریشان نہیں ہیں۔ اب کچھ کام کی باتیں کر لیتے ہیں۔ یہ تو آپ کو پتا ہی ہوگا کہ آپ کو میرے ساتھ کام کرنا ہے۔ میں کام کے معاملے میں بہت پروفیشنل اپروچ رکھتا ہوں، بے ترتیبی اور بددیانتی برداشت نہیں کرتا ہوں آپ پر کام کا زیادہ بوجھ نہیں ہوگا۔ بہت سی بنیادی چیزوں سے آپ واقف نہیں ہیں۔ اس لیے ایک دو ماہ تک تو آپ کو ان چیزوں میں ٹرینڈ کیا جائے گا پر گائیڈنس بھی دی جائے گی۔ اس کے بعد آپ کو ہر کام خود ہی سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا اور میرا خیال ہے یہ کوئی مشکل نہیں ہوگا آپ کے لیے۔ زیادہ لمبا چوڑا لیکچر نہیں دینا چاہتا آج کے لیے بس اتنی انسٹرکشنز کافی ہیں۔ اگر آپ کو یہاں کسی قسم کی پرابلم کا سامنا کرنا پڑے تو آپ میرے پاس آسکتی ہیں۔ اب آپ جا سکتی ہیں۔''

وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ آفس میں آہستہ آہستہ لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ مگر یہ سب فرم کے ہی مختلف سیکشنز کے لوگ تھے۔ وہ صرف انٹر کام پر اندر اطلاع کرتی رہی۔ لنچ تک یہی سلسلہ جاری رہا۔

لنچ بریک سے کچھ دیر پہلے عافیہ اسے لینے آ گئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ فیکٹری کیفے ٹیریا میں آ گئی تھی۔ وہاں فیکٹری اور فرم میں کام کرنے والی خواتین کی بڑی تعداد موجود تھی۔ اسے یہ دیکھ کر بے حد سکون تھا۔

دن اسی طرح گزرنے لگے تھے۔ وہ صبح آنے کے بعد دو گھنٹے عافیہ کے ساتھ کمپیوٹر اور فیکس پر کام کرتی پھر اپنے آفس میں آ کر تھوڑا بہت وہاں کا کام نمٹاتی۔ نبیل سکندر ہمیشہ دیر سے ہی آیا کرتا تھا۔ لیکن آنے کے بعد وہ کافی مشینی انداز میں کام کیا کرتا تھا۔ یکے بعد دیگرے فیکٹری یا فرم میں سے کوئی نہ کوئی اس کے پاس آتا رہتا تھا یا وہ خود کسی نہ کسی کو بلاتا رہتا تھا اور جب وہ کسی کو نہیں بلاتا تھا تب وہ فون پر کسی نہ کسی کے ساتھ مصروف

گفتگو ہوتا۔ فرم میں مختلف حصے بنے ہوئے تھے۔ اب ایک نیا حصہ تشکیل دیا جا رہا تھا جو اس کے چھوٹے بھائی کے سپرد کیا جانا تھا۔ تمام حصے سکندر علی کی زیر نگرانی کام کرتے تھے مگر وہ اپنے بیٹوں کے کام میں دخل اندازی نہیں کیا کرتے تھے۔ کسی بات پر اعتراض وہ صرف تب کرتے تھے جب فرم کو کسی وجہ سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا یا نقصان ہوتا ورنہ انھوں نے باقی تمام معاملات میں اپنے بیٹوں کو مکمل آزادی دے رکھی تھی۔

رومیصہ کو یہ پتا چل گیا تھا کہ نبیل سال کا زیادہ حصہ باہر گزارتا ہے اور یہ جان کر اسے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ عافیہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ ہر دو چار ماہ بعد کچھ عرصے کے لیے باہر ضرور جاتا ہے اور اب رومیصہ شدت سے اس کے باہر جانے کی منتظر تھی۔ نبیل سکندر سے اس عرصے میں اسے کوئی تکلیف یا پریشانی نہیں ہوئی تھی، مگر اس کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھی۔ اسے اس کی آنکھوں سے بے حد خوف آتا تھا حالانکہ عافیہ کو نبیل سکندر کی آنکھیں بے حد پسند تھیں مگر رومیصہ کبھی بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ نہیں پائی۔ کوئی بہت عجیب سا تاثر ہوتا تھا اس کی آنکھوں میں جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھی لیکن بعض دفعہ وہ بے حد پریشان ہو جاتی تھی یہ اندازہ اسے ہو گیا تھا کہ وہ صرف اپنے حصے میں ہی نہیں دوسرے حصے میں کام کرنے والی لڑکیوں میں بھی خاصا مقبول تھا۔ بنیادی وجہ تو ظاہر ہے یہ تھی کہ وہ فرم کے مالکوں میں سے تھا۔ اور بے حد خوبصورت تھا مگر ایک اور وجہ اس کے لہجے کی نرمی تھی۔ اس میں غرور یا اکھڑ پن نہیں تھا جو اس کے بڑے دونوں بھائیوں میں تھا۔ اپنے ماتحتوں کے ساتھ وہ خوش اخلاقی سے ہی پیش آتا تھا جب تک ان میں سے کوئی ایسی حرکت نہ کر دیتا۔ جو اسے آپے سے باہر کر دیتی مگر غصے میں بھی وہ بلند آواز سے بولتا اور ماتحتوں کو جھڑکتا ضرور تھا۔ مگر ان کو ذلیل نہیں کیا کرتا تھا۔ نہ ہی ان کی ایک ایک غلطی لے کر بیٹھا رہتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کے حصے میں کام کرنے والے سب سے زیادہ مطمئن تھے۔

اس سے پہلے نبیل سکندر کی سیکرٹری کے طور پر جو لڑکی کام کر رہی تھی وہ اس سے پہلے چیمبر آف کامرس میں کام کرتی رہی تھی۔ اس فرم کو جوائن کرنے کے بعد بہت کم عرصے میں وہ نبیل کے بہت قریب آ گئی تھی۔

''بے حد خوبصورت تھی شمائلہ۔ پھر اسے مردوں کو پھانسنے کے سارے حربے آتے تھے اور پھر نبیل سکندر تو ہے ہی دل پھینک، چند ماہ میں نوبت یہ آ گئی تھی کہ شام کو واپس بھی نبیل کی گاڑی میں جایا کرتی تھی۔ ہر دوسرے دن وہ ہمیں کوئی نہ کوئی قیمتی چیز یہ کہہ کر دکھاتی تھی کہ یہ نبیل نے دی ہے اور نبیل سکندر واقعی اسے بہت تحفے دیتا رہتا تھا بلکہ وہ تو اسے لے کر کئی دن مری اور بھوربن بھی رہ کر آتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ نبیل سکندر کی دلچسپی اس میں ختم ہونے لگی۔ تحفے تحائف کا سلسلہ بھی رک گیا اور ظاہر ہے خالی تنخواہ پر تو شمائلہ بی بی کا گزارہ ہو نہیں سکتا تھا۔ اس لیے یہاں آنے کے ایک سال بعد ہی وہ جاب چھوڑ کر چلی گئی، اسی لیے تمھیں کہتی ہوں کہ تم بھی محتاط رہنا۔ یہ بندہ فلرٹ ہے اسے ہم جیسی لڑکیوں سے عشق نام کی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ نہ یہ ہم سے شادی کر سکتا ہے۔ ہاں ذلت اور رسوائی کا طوق ضرور ہمارے گلے میں ڈال سکتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم کبھی اس کی باتوں میں نہ آنا۔ ذرا مضبوطی دکھاؤ گی تو یہ...... تنگ نہیں کرے گا۔ یہ خوبی ہے اس میں کہ اگر کسی لڑکی کی طرف سے کوئی رسپانس نہ ملے تو وہ اس کا جینا اجیرن کرتا ہے نہ اسے تنگ کرتا ہے بلکہ خاموشی سے کنارہ کر لیتا ہے۔''

عافیہ نے ایک دن نبیل سکندر کے بارے میں تقریباً سارے ہی انکشافات کر دیے تھے۔ نبیل کے بارے میں اس کے خدشات اور بڑھ گئے تھے۔ حفظ ماتقدم کے پہلے اقدام کے طور پر اس نے میک اپ کا استعمال ترک کر دیا تھا۔ وہ چھوٹی موٹی جیولری جو وہ پہن کر آنے لگی تھی وہ ایک

بار پھر سے اس نے اتار کر رکھ دی تھی۔ جب بھی وہ اسے آفس میں بلاتا تو وہ پتا نہیں خود پر کیا کیا پھونک کر جاتی۔

بعض اوقات اس کا دل چاہتا، وہ یہ جاب چھوڑ دے اور دوبارہ کبھی وہاں نہ آئے مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ خالہ کسی طور پر بھی اس بات پر تیار نہیں تھیں کہ وہ یہ جاب چھوڑ دے۔ وہ سمجھتی تھیں کہ ایسی جاب تو قسمت والوں کو ملتی ہے۔ سترہ گریڈ کے افسر کی اتنی تنخواہ نہیں ہوتی جتنی اسے مل رہی تھی پھر وہ کفران نعمت کیوں کر رہی تھی۔ کئی بار اس نے نبیل سکندر کے بارے میں کی جانے والی باتوں کے بارے میں انھیں بتایا مگر ہر بار وہ سنی ان سنی کر جاتیں اگر کہتیں بھی تو بس یہ۔

''لو باس برا ہے تو پھر کیا ہے۔ تھوڑی بہت خرابی تو ہر مرد میں ہوتی ہے۔ بندے کو خود اچھا ہونا چاہیے اور پھر تم اکیلی تو نہیں ہزاروں لاکھوں لڑکیاں یہی کام کرتی ہیں آخر وہ بھی تو لڑکیاں ہی ہیں مگر وہ تو ڈر کر نہیں بھاگتیں۔ پھر لوگوں کو تو ویسے بھی رائی کا پہاڑ بنانے کی عادت ہوتی ہے، کسی میں چیونٹی جتنی خرابی دیکھ لیں تو اسے ہاتھی بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے نہ ہی کسی کی باتوں میں آنے کی ضرورت ہے۔''

وہ خاموشی سے ان کی تقریر سنتی رہتی۔ اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ وہ ان کے گھر رہتی تھی۔ خالہ کے بقول اس پر ان کے بہت احسانات تھے اور اب وہ اس قابل ہوئی ہے کہ دوسروں کے لیے کچھ کر پائے تو اپنے فضول کے خدشات کو سر پر لادے نہ پھرے۔ بعض دفعہ اس کا دل چاہتا وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے اگر اس کا اپنا باپ یا ماں ہوتے تو کیا انھیں بھی اس کے خدشات اتنے ہی بے جواز لگتے۔ شاید کبھی نہیں۔

عافیہ نے اپنی بہن کی شادی کے لیے ایک ہفتے کی چھٹی لی تھی اور اس کا دل ہی نہیں چاہا تھا کہ وہ اکیلے کیفے ٹیریا جا کر کھانا کھائے۔ کسی اور لڑکی کے ساتھ اس کی اتنی دوستی نہیں تھی۔ اس لیے اس نے سوچا تھا کہ جتنے دن عافیہ نہیں آئے گی۔ وہ اپنے آفس میں ہی لنچ کر لیا کرے گی۔ نبیل لنچ ٹائم میں آفس سے چلا جایا کرتا تھا بعض دفعہ وہ لنچ کے لیے کسی ریسٹورنٹ چلا جاتا تھا اور بعض دفعہ وہ اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ آفس میں لنچ کیا کرتا تھا۔ اس لیے رومیصہ کو یہ پریشانی بھی نہیں تھی۔

اس دن بھی نبیل حسب معمول لنچ آور شروع ہونے پر آفس سے نکل گیا تھا لیکن اپنی کار کے پاس پہنچنے پر اسے یاد آیا کہ وہ اپنا موبائل اوپر آفس میں ہی چھوڑ آیا تھا۔ اسے لینے کے لیے وہ اوپر آیا تھا لیکن اپنے آفس میں جانے کے لیے جب وہ رومیصہ کے آفس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہ ٹیبل پر لنچ باکس رکھے لنچ کرنے میں مصروف تھی، اسے خلاف توقع وہاں موجود پا کر وہ گڑبڑا گئی تھی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا سینڈوچ اس نے لنچ باکس میں رکھ دیا تھا۔ وہ اپنے آفس میں جانے کے بجائے اس کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔

''آپ لنچ یہیں کرتی ہیں؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''نہیں، میں کیفے ٹیریا میں عافیہ کے ساتھ لنچ کرتی ہوں مگر وہ ایک ہفتے کی چھٹی پر ہے، اس لیے میں نے سوچا کہ یہیں لنچ کرلوں۔'' اس نے وضاحت کی تھی۔

''آپ میرے ساتھ چلیں، ہم اکٹھے لنچ کرتے ہیں۔'' نبیل نے فوراً اسے پیش کش کی تھی اور اس کے جسم سے جیسے جان نکل گئی تھی۔

''نہیں تھینک یو۔ لیکن مجھے یہیں لنچ کرنا ہے۔''

اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا تھا مگر نبیل پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''نہیں۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے۔ میں ذرا اپنا موبائل لے آؤں۔''

وہ اس کے انکار کو گردانے بغیر اپنے آفس میں چلا گیا اور چند لمحوں بعد واپس آ گیا تھا۔

''او کے چلیں۔'' اس نے آتے ہی کہا تھا۔

''نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔ پھر میں لنچ بھی کر چکی ہوں۔ میں نہیں جاؤں گی۔''

اس نے مزاحمت کی کوشش کی تھی۔ مگر دوسری جانب کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''مزید جھوٹ نہیں۔ آپ بس اٹھ جائیں۔ اس قسم کے جھوٹے بہانے مجھے پسند نہیں ہیں۔''

اس بار اس نے قدرے سختی سے کہا تھا اور وہ مزید مزاحمت نہیں کر پائی تھی۔ بہر حال وہ اس کا باس تھا۔ اپنے لنچ باکس کو بند کرنے کے بعد بیگ اٹھا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ نبیل اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اس کی دلی کیفیت سے بخوبی واقف ہو چکا تھا مگر پھر بھی وہ اسے ساتھ لے جانے کے ارادے پر قائم تھا۔ جب وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو اس نے آگے بڑھ کر اس کے لیے آفس کا دروازہ کھولا تھا۔ باہر آنے کے بعد نبیل کے پیچھے چلتے ہوئے اس کا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اسے دیکھنے والی ہر نظر ملامت کر رہی ہے۔ خاموشی کے ساتھ آگے پیچھے چلتے ہوئے وہ

پارکنگ میں آئے تھے۔نبیل نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا تھا۔وہ چند لمحوں تک بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں وہیں کھڑی رہی مگر وہ قطعاً اس کی طرف متوجہ نہیں تھا بلکہ کار اسٹارٹ کر رہا تھا۔زہر کا گھونٹ بھرتے ہوئے وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

''کہاں لنچ کریں گی؟''اس کے سوال اس کا دل چاہا تھا، کہہ دے کہیں بھی نہیں مگر اس نے یہ نہیں کہا تھا۔

''پتا نہیں۔میں کبھی کسی ریسٹورنٹ نہیں گئی۔''

''ٹھیک ہے پھر میں آپ کو اپنی پسند کی جگہ لے جاتا ہوں۔''

اس نے کہا تھا۔کچھ دیر وہ خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتا رہا پھر اس نے گفتگو کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

''کیسی لگ رہی ہے آپ کو اپنی جاب؟''

''ٹھیک ہے۔''اس نے ڈیش بورڈ کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔نبیل نے بھنویں اچکاتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

''بس ٹھیک ہے؟''اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''میرا مطلب ہے اچھی ہے۔''اس نے بجھے دل سے تعریف کرنے کی کوشش کی تھی۔

''اور باس کیسا ہے آپ کا؟''بڑی سنجیدگی سے سوال کیا گیا تھا۔رومیصہ نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔

''میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے؟''سوال اسی سنجیدگی سے دہرایا گیا تھا۔اس نے ایک بار پھر اس کی طرف گردن گھمائی مگر وہ بڑی بے نیازی سے ونڈ اسکرین پر نظر جمائے پورے انہماک سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہیں۔''اس نے کہا تھا۔

''صرف ٹھیک ہیں؟''اس نے کچھ بلند آواز سے کہا تھا۔نبیل کو توقع تھی کہ وہ اس بیان کو بھی کچھ بدلے گی مگر وہ حیران ہوا تھا جب وہ کچھ کہنے کے بجائے چپ رہی تھی۔ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی تھی۔

''ٹھیک ہیں، بہت خوب!''

اس نے زیر لب کہا تھا پھر ایک نظر اس پر ڈالی تھی جو اب سامنے یا باہر دیکھنے کے بجائے گود میں رکھے ہوئے ہاتھوں پر نظر جمائے بیٹھی تھی۔اس نے دوبارہ اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ریسٹورنٹ میں پہنچ کر ٹیبل تک پہنچنے تک دونوں کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی، مگر مینو کارڈ ہاتھ میں لیتے ہی نبیل نے کہا تھا۔

''کیا کھانا پسند کریں گی آپ؟''

''کچھ بھی۔''اس نے ویٹر سے مینو کارڈ لے کر دیکھنے کے بجائے ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

''کچھ بھی۔''نبیل نے اس کے جملے کو دہرایا تھا۔

''آل رائٹ پھر میں اپنی مرضی کا لنچ کرواتا ہوں آپ کو۔''

مینو کارڈ پر نظریں دوڑاتے ہوئے اس نے کہا تھا اس نے اپنی پسند کی چند ڈشز ویٹر کو لکھوائی تھیں۔ جب ویٹر آرڈر نوٹ کرنے کے بعد چلا گیا تو نبیل نے اس پر نظریں جمادی تھیں۔ وہ پہلے جتنی پریشان تھی اب اس سے زیادہ نروس نظر آ رہی تھی۔

اپنے اردگرد کے خوبصورت ماحول پر نظریں دوڑانے کے بجائے وہ ٹیبل پر پڑے کینڈل اسٹینڈ پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ وہ کچھ دیر تک اس کی اس سرگرمی کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بہت آہستگی سے کینڈل اسٹینڈ ٹیبل سے اٹھا لیا تھا۔ رومیصہ کی نظروں نے اس کے ہاتھ میں آنے تک کینڈل اسٹینڈ کا تعاقب کیا تھا۔ پھر اس نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔ پھر اس نے بہت پرسکون انداز میں کینڈل اسٹینڈ کو فلور پر رکھ دیا تھا اور پھر پہلے کی طرح اطمینان سے کچھ کہے بغیر ٹیبل پر بازو ٹکا کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک شرمندگی کے عالم میں ٹیبل پر ادھر سے ادھر نظر دوڑاتی رہی۔ لیکن کسی چیز کو مستقل طور پر دیکھنے کی کوشش اس نے نہیں کی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنی گود میں رکھے ہوئے بیگ پر نظریں جمادی تھیں۔ نبیل نے ایک گہری سانس لی تھی۔ وہ کم از کم بیگ وہاں سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ ویٹر سوفٹ ڈرنک سرو کرنے آیا تھا اور نبیل کے کہنے پر کینڈل اسٹینڈ اٹھا کر لے گیا تھا۔

''پیئیں۔'' اس نے ویٹر کو جانے کے بعد ہاتھ کے اشارے سے اسے ڈرنک شروع کرنے کا اشارہ کیا تھا ایک سپ لینے کے بعد وہ دوبارہ پرانی سرگرمی میں مشغول ہوگئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد نبیل نے اسے کہا تھا۔

''آپ ڈرنک نہیں لے رہی ہیں؟''

''میں پی لوں گی۔'' ہلکی سی آواز میں اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا گیا تھا۔ وہ خاموشی سے ڈرنک کے سپ لیتا اسے دیکھتا رہا۔ پہلے سپ کے علاوہ اس نے دوبارہ گلاس کو ہاتھ نہیں لگایا تھا وہ اس کی نظریں خود پر جمی محسوس کر رہی تھی۔ اور اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ نظر اٹھا سکے۔ لنچ سرو ہونے تک نبیل سکندر نے دوبارہ اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ لنچ سرو ہونے کے بعد اس نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا تھا۔

''آپ شروع کریں۔'' وہ بڑے اطمینان سے ٹیبل پر بازو ٹکا کر اس کے کھانا شروع کرنے کا انتظار کرنے لگا۔ رومیصہ نے ایک نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا پھر ٹیبل پر نظر دوڑائی تھی۔ بڑی ہمت کر کے اس نے اپنے آگے رکھی ہوئی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول نکال لیے تھے۔ اسے کھانا شروع کرتے دیکھ کر نبیل سکندر نے بھی اپنی پلیٹ آگے سرکا لی تھی۔

پھر پورا وقت وہ چاولوں میں چمچ پھیرتی رہی۔ اس نے شاید کچھ نہ کھانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اس نے دو تین بار اسے کچھ اور لینے کے لیے کہا تھا۔ مگر جب اس نے ان چیزوں کو بھی پلیٹ میں رکھ کر بس وقت گزارنا شروع کیا تو نبیل سکندر نے اپنا اصرار ترک کر دیا تھا جب تک وہ لنچ سے فارغ ہوا وہ تب بھی پلیٹ میں ان ہی چیزوں کو لیے چمچ سے انھیں اِدھر سے اُدھر کر رہی تھی۔ اس نے ایک نظر اس کی پلیٹ پر ڈالی تھی۔ بڑے تحمل سے اس نے رومیصہ سے پوچھا تھا۔

''آئس کریم کھائیں گی؟''

میں آئس کریم نہیں کھاتی ہوں۔'' اس نے چمچ ہاتھ سے چھوڑ کر پلیٹ ہاتھ سے پیچھے سرکا دی تھی۔

''چائے پئیں گی؟''

''نہیں۔''

''کافی؟''

''نہیں۔''

''کوئی اور چیز؟''

''نہیں۔''

''آل رائٹ۔'' نبیل نے یہ کہہ کر ویٹر کو بل لانے کے لیے کہہ دیا تھا۔

واپسی کا سفر بھی اسی خاموشی سے ہوا تھا مگر اب وہ پہلے کی نسبت پر سکون تھی۔ جہاں تک نبیل سکندر کا تعلق تھا تو یہ اس کی زندگی کا بدترین لنچ تھا جو اس نے کسی لڑکی کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے پورے ڈیڑھ گھنٹے میں ایک بار بھی اس کے چہرے پر نظر جمانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ پریشان تھی یا خوفزدہ۔ یہ وہ اندازہ نہیں کر پایا تھا مگر وہ یہ ضرور جان گیا تھا کہ اسے لنچ پر اس کے ساتھ آنا پسند نہیں آیا اور شاید یہ اس کی ناپسندیدگی کے اظہار کا طریقہ تھا۔ جس نے اس جیسے بندے کو خاصا ڈسٹرب کیا تھا واپس رومیصہ کے آفس میں آ کر اس نے کہا تھا۔

''میں آپ کو پندرہ منٹ دیتا ہوں۔ آپ لنچ کر لیں۔''

رومیصہ اندازہ نہیں لگا پائی کہ وہ ناراض تھا یا نہیں، بہر حال دوبارہ اس نے اسے لنچ کی آفر کرنے کی کوشش نہیں کی۔

❁

''آؤ نبیل! آؤ۔'' سکندر علی نے اسے اپنے بیڈروم کے دروازے پر دستک دے کر اندر آنے کی اجازت مانگتے دیکھا تھا۔

''آپ کو کوئی کام تو نہیں ہے؟'' اس نے باپ کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا جو فائلیں دیکھ رہے تھے۔

''نہیں۔ اب ایسا بھی کوئی کام نہیں ہے یہ تو بس میں کچھ بلز کی فائلز دیکھ رہا ہوں۔ تمہیں کچھ کہنا ہے مجھ سے؟'' انھوں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائل میز پر رکھ دی تھی۔

''ہاں، مجھے آپ سے، بہت ضروری بات کرنی ہے۔ اصل میں پاپا! میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

بغیر کسی تمہید کے اس نے اپنے مخصوص انداز میں سیدھے موضوع پر آتے ہوئے کہا تھا۔ سکندر علی کے چہرے پر مسکراہٹ لہرا گئی تھی۔

''That's very good لگتا ہے، کوئی لڑکی پسند آ ہی گئی ہے تمہیں۔''

''وہ ان کی بات پر مسکرایا تھا۔'' بالکل نہ صرف مجھے پسند آ گئی ہے بلکہ میرا خیال ہے آپ کو بھی پسند آئے گی۔''

''اچھا۔ اس کا مطلب ہے کافی سوچ سمجھ کر انتخاب کیا ہے؟'' ان کے لہجے کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔

''پاپا! آپ میری سیکرٹری کو جانتے ہیں نا رومیصہ عمر کو۔ میں اسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کی بات پر انھیں جیسے شاک لگا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ کچھ بول ہی نہیں پائے۔ بس حیرت سے اس کا چہرہ دیکھتے رہے۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا نبیل! اس بات پر جو تم نے کہی ہے۔ تم اپنی سیکرٹری سے شادی کرنا چاہتے ہو؟ انھوں نے اس سے کہا تھا۔

''پاپا! آپ کو بھی یہ بات سن کر یقین نہیں آئے گا کہ میں نے اسے پہلی بار دیکھتے ہی شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سیکرٹری کے طور پر اپائنٹ تو میں نے اسے صرف اس لیے کیا تھا تا کہ میں اس کے طور طریقوں کے بارے میں تھوڑا بہت جان سکوں اور اب جب میں اس سے مطمئن ہوں تو میں اس سے شادی کرنا چاہ رہا ہوں۔''

سکندر علی کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار نمایاں تھے۔

''یہ ایک بہت احمقانہ اور جذباتی قسم کا فیصلہ ہے اور ایسا فیصلہ کرنے والے اکثر اس پر پچھتاتے ہیں۔'' انھوں نے سمجھانے کی کوششوں کا آغاز کرتے ہوئے پہلا جملہ بولا تھا۔

''پاپا! کم از کم اس بار ایسا نہیں ہوگا۔''

ویسے بھی میں کوئی ٹین ایجر نہیں ہوں۔ بتیس سال کا ہوں اور میرے خیال میں یہ کافی میچور عمر ہے۔ میں جانتا ہوں رومیصہ کے بارے میں آپ کو بہت سے خدشات اور اعتراضات ہوں گے۔ مثلاً یہ کہ وہ لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا مضبوط تو ایک طرف کوئی بیک گراؤنڈ ہی نہیں ہے۔ تعلیم کم ہے، پھر ورکنگ گرل ہے۔ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹی ہے۔ مگر ان باتوں کے بارے میں پہلے ہی اچھی طرح سوچ چکا ہوں اور میرا نہیں خیال کہ یہ چیزیں میرے یا اس کے لیے شادی کے بعد کوئی مسئلہ کھڑا کر دیں گی۔ میرے لیے سب سے اہم چیز یہ ہے کہ وہ ایک بہت اچھی لڑکی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ اعتراض نہیں کریں گے۔''

وہ بہت روانی سے بولتا چلا گیا تھا۔ سکندر علی نے بہت غور سے اس کی باتوں کو سنا تھا۔

''تمھیں لگتا ہے کہ وہ ہمارے ماحول میں ایڈجسٹ کر پائے گی، تمھارے ساتھ چل سکے گی؟'' اس کی باتیں سننے کے بعد انھوں نے اس سے پوچھا تھا۔

''بالکل وہ نہ صرف یہاں ایڈجسٹ کر لے گی، بلکہ اچھی طرح ایڈجسٹ کر لے گی وہ بہت کمپرومائزنگ ہے، صبر ہے اس میں ضد یا انا ٹائپ کی کوئی چیز نہیں ہے اس میں اور میرے خیال میں ایک اچھی بیوی میں یہی خوبیاں ہونی چاہئیں۔''

''تمھاری ممی تو اس بات پر ہنگامہ کھڑا کر دیں گی۔'' سکندر علی نے اس کی ماں کا غصہ یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔

''ان کی مجھے پرواہ نہیں ہے، وہ اگر مان گئیں تب بھی اور نہ مانیں تب بھی مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ میں صرف آپ کی رضامندی چاہتا ہوں اور آپ کو یاد ہے، آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں جہاں شادی کرنا چاہتا ہوں کر سکتا ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور اگر ہوگا بھی تب بھی آپ مجھے شادی سے نہیں روکیں گے۔''

اس نے سکندر علی کو ان کا وعدہ یاد دلایا تھا۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر آئی تھی۔

''مگر مجھے یہ توقع تھی کہ شاید تم کسی غیر ملکی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟'' انھوں نے کہا تھا۔

''جو بھی تھا وعدہ تو وعدہ ہے۔ آپ کو پورا تو کرنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے نبیل! میں اس بارے میں سوچوں گا اور تمہاری ممی سے بھی بات کروں گا۔'' انھوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا تھا۔

''دیکھیں پاپا! آپ ممی کو بتا دیجئے گا کہ اگر انھیں اعتراض ہوا تب بھی میں شادی تو اسی لڑکی سے کروں گا، اس لیے بہتر ہے کہ وہ اعتراض نہ کریں۔ آفٹر آل زندگی مجھے گزارنی ہے اور کس کے ساتھ کس طرح گزارنی ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کا حق بھی مجھے ہی ہونا چاہیے۔''

وہ یہ کہتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور جب سکندر علی نے اپنی بیوی سے یہ بات کی تھی تو انھوں نے حسب توقع ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا وہ بے حد غصے اور طیش میں تھیں۔ لیکن نبیل کو ان کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا گھر میں باپ کا حکم چلتا ہے۔ اس لیے ممی جتنا شور مچا لیں وہ اپنی مرضی کا کام نہیں کروا سکتی تھیں اور وہ جانتا تھا کہ باپ اسے اس شادی کی اجازت دے دے گا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ انھوں نے بادل نخواستہ سہی لیکن اس کو شادی کے لیے رضامندی دے دی تھی لیکن اپنی بیوی کے غصے کو وہ ختم نہیں کر سکے تھے۔ اور فاخرہ اس رشتے کی مخالفت میں تنہا نہیں تھیں۔ نبیل کے سارے گھر والے، اس کے بھائی بھابیاں حتیٰ کہ ذیشان بھی اس رشتے کی مخالفت کر رہا تھا۔ بھائیوں میں اگر کسی کے ساتھ اس کی دوستی تھی تو صرف ذیشان کے ساتھ اور یہی حال ذیشان کا تھا۔

مگر اب جب نبیل نے اسے اپنے فیصلے کے بارے میں بتایا تھا تو وہ نہ صرف حیران ہوا تھا بلکہ اس نے نبیل کا مذاق بھی اڑایا تھا۔

''تو نبیل سکندر صاحب شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ہاؤ فنی۔''

''اس میں مذاق کی کیا بات ہے؟'' نبیل کو اس کے لہجے کا تمسخر پسند نہیں آیا تھا۔

''دیکھیں جناب نبیل صاحب! آپ کچھ بھی ہو سکتے ہیں، مگر آپ کبھی بھی ایک اچھے شوہر نہیں ہو سکتے۔ پھر کیوں خود کو اس رول میں ٹرائی کرنا چاہتے ہیں؟'' اس کی طرح ذیشان بھی خاصا صاف گو تھا۔

''کیوں میں اچھا شوہر کیوں نہیں ہو سکتا؟''

''یہ سوال آپ کو اپنے آپ سے کرنا چاہیے۔ جواب بڑی آسانی سے مل جائے گا۔ رشتہ بہت زیادہ بھی ہوا تو صرف چند سال چل سکے گا وہ بھی اگر تمہاری بیوی میں صبر اور برداشت کا مادہ وافر مقدار میں ہوا تو اور جب بھی اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو وہ تمہاری شادی شدہ زندگی کا آخری دن ہوگا۔''

ذیشان کا تجزیہ حقیقت پسندانہ تھا کیونکہ وہ نبیل سکندر کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن اس کی باتوں نے نبیل کو ہرٹ نہیں کیا۔ وہ بڑے سکون سے اس کی باتیں سنتا رہا تھا۔

''ذیشان! کم از کم اس معاملے میں میں تمھیں حیران کر دوں گا۔ تم دیکھو گے کہ میں اس رشتے کو نبھانے کے لیے کس حد تک جاتا ہوں۔ کم از کم مجھے شبہ نہیں ہے کہ میں اور رومیصہ بہت اچھی زندگی گزاریں گے۔'' اس کے لہجے میں بے حد سنجیدگی تھی۔

جس لڑکی کی تم بات کر رہے ہو۔ اس میں ہر وہ خامی ہے جو ہماری کلاس کے نزدیک نا قابل برداشت ہوتی ہے۔ صرف خوبصورتی کی وجہ سے تم کب تک اسے سراہتے رہو گے۔ اس کا سارا چارم شادی کے چار دن کے بعد ختم ہو جائے گا پھر تمھیں اس میں صرف خامیاں نظر آنے لگیں گی تب تم کیا کرو گے۔ ابھی تو اس نے تمھیں اور تمہاری دولت کو دیکھا ہے۔

تمہاری کسی خامی کے بارے میں وہ جانتی نہیں ہو گی اور اگر جانتی بھی ہو گی تو اسے یہ لگتا ہو گا کہ تم شادی کے بعد بالکل صحیح ہو جاؤ گے۔ لیکن بعد میں جب وہ تمھارے بارے میں جاننا شروع کرے گی پھر وہ بہت مسائل کھڑے کرے گی تمھارے لیے اس اٹھارہ، انیس سال کی لڑکی سے شادی کر کے تمھیں صرف ٹینشن ملے گی۔ وہ عمر میں تم سے بہت چھوٹی ہے ظاہر ہے میچور بھی نہیں ہو گی اور نہ ہی ہماری کلاس کی لڑکیوں کی طرح براڈ مائنڈڈ ہو گی، جو اپنے شوہروں کو تھوڑی بہت آزادی ضرور دیتی ہیں۔ مجھے تو حیرت ہے کہ تم نے یہ سب سوچا کیسے ہے صرف خوبصورتی دیکھ کر پاگل ہو گئے ہو۔ نہیں نبیل سکندر صاحب! آپ بہت حماقت کا ثبوت دے رہے ہیں، ایسے رشتے دیر تک نہیں چلتے۔ کل پچھتانے کے بجائے بہتر ہے کہ آج ہی کچھ عقل سے کام لیں۔

ذیشان نے اس کو سمجھانے کے لیے بے تحاشا دلائل دیے تھے۔ مگر نبیل قائل نہیں ہوا تھا۔ اسے قائل کرنا بہت مشکل کام ہوتا تھا وہ دوسروں کی بات سن لیا کرتا تھا مگر کرتا صرف وہی تھا جسے وہ ٹھیک سمجھتا تھا۔

''مجھے مزید سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بہت سوچ چکا ہوں اور جتنا میں سوچ رہا ہوں، میرا فیصلہ اور ارادہ اتنا ہی مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے اسی سے شادی کرنا ہے۔''

اس نے ذیشان کی ساری باتوں کے جواب میں بس یہی کہا تھا۔ ذیشان نے مزید سر کھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''ٹھیک ہے جیسا تم بہتر سمجھتے ہو۔'' اس نے یہ کہہ کر بات کا موضوع بدل دیا تھا۔

اس دن اسے آفس میں آئے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ جب خلاف توقع اور خلاف معمول نبیل سکندر ساڑھے نو بجے آفس آ گیا تھا۔ رومیصہ نے حیرانی سے اسے آفس میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اپنی تین ماہ کی سروس میں ایسا پہلی دفعہ ہوا تھا۔

''آپ ذرا میرے آفس میں آئیں۔'' وہ اس کی ٹیبل کے پاس سے گزرتے ہوئے کہہ گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر اس کے پیچھے آفس میں چلی گئی تھی۔ وہ اپنا کوٹ اتار کر ریوالونگ چیئر کی پشت پر ڈال رہا تھا۔ جب وہ اندر داخل ہوئی تھی۔

''بیٹھیں۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا تھا۔ لیکن خود وہیں کھڑا رہا تھا۔ وہ رائٹنگ پیڈ ٹیبل پر رکھ کر ڈکٹیشن لینے کے لیے تیار ہو گئی۔ کچھ دیر تک وہ ریوالونگ چیئر کے پیچھے کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر چیئر پر بیٹھ گیا۔

"Are you engaged?" (آپ انگیجڈ ہیں؟) وہ اس کے اس غیر متوقع سوال پر حیران رہ گئی تھی۔

"No" بمشکل اس کے حلق سے آواز نکلی تھی۔ نبیل سکندر کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ کچھ دیر تک وہ خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

"Alright then would you like to marry me?" (آل رائٹ تو آپ مجھ سے شادی کریں گی؟)

اسے جیسے دو ہزار وولٹ کا کرنٹ لگا تھا۔ وہ حیرت سے اس کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟'' نبیل کا اطمینان ابھی بھی برقرار تھا۔ وہ حیرانی کے عالم میں اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ کچھ دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی تھی پھر اس نے ٹیبل کے ایک کونے میں پڑی ہوئی ایک ڈبیا کھول کر اس کے آگے سرکا دی۔ اس نے ڈبیا کو دیکھا تھا۔ ایک خوبصورت انگوٹھی اس میں جگمگا رہی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ''انگیجمنٹ رنگ ہے۔ پہن لیں۔ یا اگر آپ اجازت دیں تو میں پہنا دوں؟''

وہ اپنی چیئر سے کھڑا ہو گیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ حرکت کرتا۔ وہ بھی بوکھلا کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے باہر جانا ہے، کام کرنا ہے مجھے۔'' نبیل نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

''میرے والدین ایک دو دن تک آپ کے گھر آئیں گے اور مجھے امید ہے کہ آپ کی طرف سے انکار نہیں ہوگا۔'' وہ اس کے پاس آ گیا تھا۔

''مجھے باہر جانا ہے۔'' اس نے بے چارگی سے کہا تھا۔

''آپ بیٹھ جائیں۔ مجھے آپ سے کچھ اور باتیں بھی کرنی ہیں۔''

''مجھے بہت کام ہے۔'' وہ کسی طرح وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

''میں نے کہا ناں، بیٹھ جائیں۔'' اس بار اس نے ترش لہجے میں اسے جھڑکتے ہوئے کہا تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی کرسی پر بیٹھ

گئی۔ وہ اس کے ساتھ رکھی ہوئی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا آپ کو اس پرپوزل پر کوئی اعتراض ہے؟'' اس نے بیٹھتے ہی اس سے پوچھا تھا۔

''دیکھیں۔ میں یہاں کام کرنے آتی ہوں۔''

''میں جانتا ہوں مگر میں نے تم کو اسی کام کے لیے رکھا تھا۔ جب میں نے پہلی بار وہاں آفس میں تمھیں انٹرویو دیتے ہوئے دیکھا تو میں نے سوچا تھا This girl is going to be my wife (یہ لڑکی میری بیوی بنے گی) میں تمھیں اس وقت پرپوز کر دینا چاہتا تھا مگر پھر تمھارے بارے میں کچھ اور جاننے کے لیے میں نے تمھیں جاب دی اور اب میں تمھیں پرپوز کر رہا ہوں۔ تمہاری فیملی اور حالات کے بارے میں تقریباً سب کچھ جانتا ہوں۔ سو تمھیں اس بارے میں کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔ تم سے کوئی وعدے تو نہیں کرنا چاہتا مگر پھر بھی یہ یقین ضرور دلاتا ہوں کہ میرے ساتھ تم بہت خوش رہو گی کیا اتنی یقین دہانی کافی نہیں ہے۔''

اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی جس نے اسے نبیل کے چہرے سے نظر ہٹانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے رومیصہ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ جیسے ہپناٹائز ہو چکی تھی۔ بہت آہستگی سے نبیل نے اس کے ہاتھ میں انگوٹھی پہنا دی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنا ہاتھ دیکھتی رہی۔ وہ کچھ دیر تک دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے اس کے خوبصورت ہاتھ کو دیکھتا رہا پھر وہ ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''تھینک یو ویری مچ۔ تم آفس سے اپنی چیزیں سمیٹ لو۔ نیچے میری گاڑی میں ڈرائیور تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ تم گھر چلی جاؤ اور کل سے آفس مت آنا۔''

وہ سر جھکائے اس کی آواز سنتی رہی تھی۔ بات ختم ہونے پر وہ اس کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے باہر آ گئی تھی۔ گھر آ کر اس نے خالہ کو طبیعت کی خرابی کا بتایا تھا اور آرام کرنے کو کہہ کر لیٹ گئی تھی۔ انگوٹھی اس نے گاڑی میں ہی اتار کر بیگ میں رکھ لی تھی۔ وہ خالہ کے سامنے اس انگوٹھی کی موجودگی کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتی تھی۔ نہ ہی اس میں اتنی ہمت تھی کہ وہ اس پرپوزل کے بارے میں خالہ کو بتا دیتی۔

خالہ بری نہیں تھیں مگر بہت اچھی بھی نہیں تھیں۔ اس کی امی بہت چھوٹی عمر میں فوت ہو گئی تھیں اور اس کے ابو نے اسے اکیلے ہی پالا تھا مگر سات آٹھ سال بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا تھا وہ تب ساتویں میں تھی۔ ابو ایک فرم میں اکاؤنٹنٹ تھے اور جب تک وہ زندہ رہے۔ رومیصہ ان کی آنکھوں کا تارا بنی رہی۔ انھوں نے اسے ہر آسائش دینے کی کوشش کی۔ مگر ان کی وفات کے ساتھ ہی حالات بدل گئے تھے۔ وہ اپنے گھر سے خالہ کے گھر آ گئی تھی۔ خالہ نے اس کا گھر بیچ دیا تھا اور ابو کے آفس سے جو رقم ملی تھی وہ بھی انھوں نے یہ کہہ کر اپنے پاس رکھ لی تھی کہ بڑے ہو کر اس کی شادی کے کام آئے گی۔ وہ اتنی چھوٹی تھی کہ ان معاملات میں بول ہی نہیں سکتی تھی پھر اسے خالہ کے ساتھ رہنا تھا۔ وہ اگر اعتراض کرتی تو اپنے لیے ہی کانٹے بوتی۔ خالہ نے سب سے پہلے اس کا اسکول بدلا تھا اس وقت انھوں نے یہ بہانا کیا تھا کہ وہ اکیلی اسکول جائے گی تو وہ پریشان ہوں گی۔ اس لیے بہتر ہے وہ ان کی بیٹیوں کے ساتھ اسکول جائے۔ وہ کچھ کہہ نہیں پائی تھی۔ انگلش میڈیم سے وہ گورنمنٹ اسکول آ گئی تھی پھر آہستہ آہستہ بہت کچھ بدل گیا تھا۔

دو سال میں خالہ نے اپنی دو بیٹیوں کو بیاہ دیا تھا اور وہ بھی خاصی دھوم دھام سے اتنا پیسہ کہاں سے آیا، تقریباً سب ہی جانتے تھے انھوں نے رومیصہ کے باپ کا روپیہ اپنی بیٹیوں کے جہیز پر خرچ کر دیا تھا ورنہ اپنے کلرک شوہر کی کمائی سے وہ بیٹیاں کیسے بیاہ سکتی تھیں۔ ان کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا جو سب سے چھوٹا تھا۔ دو بیٹیاں بیاہنے کے بعد انھوں نے رومیصہ کو کوئی جاب ڈھونڈنے پر مجبور کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت یہی کہا کرتی تھیں۔

''بھئی۔ آج کل تو سب لڑکیاں جاب کرتی ہیں اس طرح کام کرنے والی لڑکیوں کی عزت بھی ہوتی ہے اور وہ دوسروں پر بوجھ بھی نہیں بنتیں۔ میں تو تمھیں پڑھا بھی اس لیے رہی ہوں کہ تم بھی اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤ۔''

اپنی بیٹیوں کے لیے ان کے خیالات اور ارشادات اور طرح کے ہوتے تھے انھیں وہ کبھی گھر کے کام کے سوا باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ ایف اے کرتے ہی انھوں نے رومیصہ کو جاب ڈھونڈنے پر لگا دیا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی باہر نکلنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ خالہ کی دونوں بیٹیاں رومیصہ سے بڑی تھیں شاید وہ یہ چاہتی تھیں کہ رومیصہ بھی گھر کی آمدنی میں کچھ اضافہ کرے تاکہ وہ اپنی باقی دونوں بیٹیوں کے فرض سے بھی سبکدوش ہو سکیں اور رومیصہ اس بات سے واقف تھی لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی، وہ خالہ کا گھر نہیں چھوڑ سکتی تھی ان کے علاوہ اس کا کوئی اور سگا رشتہ دار نہیں تھا اور جو دور پار کے رشتے دار تھے بھی وہ اس کی ذمہ داری کہاں اپنے کندھوں پر لے سکتے تھے۔ بہت صبر سے وہ یہاں وقت گزار رہی تھی۔ مگر اب زندگی میں جو انقلاب آیا تھا اس نے اسے دنگ کر دیا تھا۔

.....✿.....

نبیل سکندر کے والدین تین دن بعد آئے تھے اور تین دن تک وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر گھر پر ہی رہی۔ وہ خالہ کو جاب چھوڑنے کا نہیں بتا سکتی تھی۔ نبیل کے پرپوزل پر خالہ کا ردعمل عجیب تھا۔ پہلے انھیں یقین نہیں آیا کہ وہ واقعی رومیصہ کا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے مانگ رہی ہیں سکندر علی کی بیوی کا رویہ بھی کافی نخوت بھرا تھا۔ مگر سکندر علی کافی سلیقے اور قرینے سے بات کر رہے تھے۔ پھر خالہ نے سوچنے کے لیے وقت مانگا مگر ان کے جانے سے پہلے یہ کہہ کر انکار کر دیا ان کے خاندان میں لڑکیوں کی شادیاں خاندان سے باہر نہیں کرتے پھر رومیصہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔ فاخرہ سکندر علی اس انکار سے کافی خوش ہوئی تھیں جبکہ سکندر علی نے اسے اپنی توہین جانا تھا اور کافی ناراضگی کے عالم میں واپس گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد خالہ اس کے پاس آئی تھیں اور عجیب نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھیں پھر انھوں نے بڑے نارمل انداز میں کہا تھا۔

''جس کے ساتھ تم کام کرتی ہو۔ اس نے اپنا رشتہ بھیجا ہے۔ میں نے انکار کر دیا۔ تم نے بتایا تھا نا کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے پھر میں تمھیں اس کے ساتھ کیسے بیاہ دیتی۔ ویسے بھی تم ابھی چھوٹی ہو پہلے تو نازیہ اور شازیہ کی شادی ہوگی اور پھر مجھے لڑکے کی ماں بھی اس رشتے پر خوش نظر نہیں آئی۔ خیر دفع کرو ان باتوں کو تم ذرا رات کا کھانا بنا لو۔''

وہ اس کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی تھیں اور پتا نہیں کیوں لیکن رومیصہ کا دل چاہا تھا کہ وہ بلند آواز سے رونے لگے۔ اسے نبیل سکندر سے عشق تھا نہ محبت نہ اس نے اس کے ساتھ کوئی عہد و پیمان کیے تھے۔ پھر بھی وہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ یک دم اسے خالہ کا گھر جہنم لگنے لگا تھا۔

پچھلے تین دن اسے یوں لگتا رہا تھا جیسے قسمت اس پر مہربان ہوگئی ہے اور اب اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ ایک فریب تھا۔ نہ وہاں کوئی نبیل سکندر تھا نہ اس کے لیے کوئی سائبان سب کچھ پہلے ہی کی طرح صحرا تھا۔ لیکن وہ کسی چیز کا اظہار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ خالہ پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ ان کے انکار سے اسے دکھ ہوا ہے۔ اس لیے بڑے حوصلے کے ساتھ وہ رات کا کھانا تیار کرنے میں مصروف ہوگئی تھی۔

اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے جب اچانک دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ خالہ کا بیٹا دروازہ کھولنے گیا تھا اور کچھ دیر بعد وہ اندر آیا تھا۔

''رومیصہ باجی کے دفتر سے کوئی نبیل سکندر آئے ہیں۔'' وہ دسترخوان پر کھانا لگانا بھول گئی تھی۔ فق ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس نے خالہ کو دیکھا تھا جو سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' خالو اٹھ کر باہر چلے گئے تھے۔ خالہ بھی ان کے پیچھے ہی نکل گئی تھیں۔ دروازے پر نبیل سکندر منتظر کھڑا تھا۔ اس نے خالو سے ہاتھ ملایا اور پھر اپنا تعارف کروایا۔

''میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں اگر آپ مجھے اندر آنے دیں۔''

اس نے خالو سے کہا تھا۔ جو اس کے حلیے سے بہت مرعوب ہوگئے تھے اور کچھ ایسا ہی حال خالہ کا تھا۔ ان کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ نبیل سکندر اس قدر خوبرو ہوسکتا ہے۔ خالو اسے ڈرائنگ روم میں لے گئے تھے اور نبیل نے بیٹھتے ہی اپنے آنے کا مقصد بیان کرنا شروع کردیا تھا۔ خالو کچھ حیران ہوئے تھے کیونکہ ابھی تک خالہ نے انھیں چند گھنٹے پہلے آنے والے رومیصہ کے پرپوزل کے بارے میں نہیں بتایا تھا اور نہ ہی وہ یہ جانتے تھے کہ ان کی بیوی نے انکار کردیا تھا۔ وہ حیران تھے کہ اگر ایسا رشتہ آیا تھا تو خالہ نے سوچنے کے لیے وقت لینے کے بجائے انکار کیوں کردیا۔

''آپ کو مجھ میں کیا کمی نظر آتی ہے؟'' نبیل نے خالہ سے پوچھا تو اس کے سوال پر گڑبڑا گئی تھیں۔ ان کے تو وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ نبیل سکندر رشتہ ٹھکرانے کے چند گھنٹوں بعد ہی ان کے سامنے ہوگا۔

''وہ اصل میں بیٹا ہمارے ہاں لڑکیاں خاندان سے باہر بیاہنے کا رواج نہیں ہے۔'' انھوں نے بہت کمزور سے لہجے میں کہا تھا۔

''یہ تو کوئی وجہ نہیں ہے۔ میرا فیملی بیک گراؤنڈ بہت اچھا ہے۔ اور میرا خیال ہے ہمارے خاندان کے ساتھ رشتہ جوڑ کر آپ کو بہت خوشی ہوگی، دوسری بات آپ نے میرے والدین کو یہ کہی تھی کہ رومیصہ ابھی کم عمر ہے۔ ٹھیک ہے وہ کم عمر ہے لیکن کیا لڑکیوں کی شادی کم عمری میں نہیں ہوتی اور ویسے بھی وہ کوئی بارہ یا تیرہ سال کی تو نہیں ہے پھر عمر کا کیا مسئلہ ہے۔ ایک بات تو بہرحال طے ہے کہ مجھے ہر صورت میں اسی کے ساتھ شادی کرنا ہے اگر آپ کو عمر کا کوئی مسئلہ لگتا ہے تو ٹھیک ہے میں چند سال انتظار کرلیتا ہوں۔ لیکن آپ میرے ساتھ اس کا نکاح کردیں۔ میں آپ لوگوں کی بہت عزت کرتا ہوں اور آپ کی مدد بھی کرنا چاہتا ہوں۔ رومیصہ کے بدلے میں اگر آپ مجھ سے کوئی مطالبہ بھی کریں گے تو میں اسے پورا کروں گا۔ اگر آپ کی کوئی ڈیمانڈ ہے تو آپ بتادیں۔ لیکن رومیصہ کی شادی اگر ہوئی تو صرف مجھ سے کہیں اور نہیں ہوگی۔ اگر آپ اپنی مرضی سے نہیں کریں گے تو پھر مجھے کوئی اور راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ جو میں نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ آپ رومیصہ کے رشتہ دار ہیں اس لیے میں آپ کی عزت کرتا ہوں لیکن آپ کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑے گا۔''

اس نے بہت دھیمے لیکن بہت مستحکم آواز میں انھیں اپنے عزائم سے آگاہ کر دیا تھا۔خالہ نے گلا صاف کر کے کہا۔

''دیکھو بیٹا! رومیصہ میری دونوں بیٹیوں سے چھوٹی ہے۔ان کے شادی کیے بغیر اس کی کیسے کر سکتی ہوں۔''

''وہ کوئی مسئلہ نہیں۔آپ ان کے لیے رشتے ڈھونڈیں اور شادی طے کر دیں۔جہاں تک اخراجات کا تعلق ہے تو وہ میں ادا کروں گا۔اس بارے میں آپ فکرمند نہ ہوں۔''

''لیکن دیکھو ابھی ہمارے پاس رومیصہ کی شادی کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ہم اسے خالی ہاتھ تو نہیں بھیج سکتے۔آخر وہ بھی ہماری بیٹی ہے۔'' خالہ نے ایک بار پھر کہا تھا۔

''وہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔مجھے جہیز کی ضرورت نہیں ہے میرے پاس سب کچھ ہے اور شادی بھی بہت سادگی سے ہوگی۔آپ کو صرف نکاح کرنا ہوگا۔اس کے علاوہ جو تھوڑے بہت اخراجات ہوں گے یا رومیصہ اگر کوئی زیور اور کپڑے بنوانا چاہتی ہے تو میں اس کے لیے آپ کو چیک کاٹ کر دے دیتا ہوں۔''

خالہ کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا مگر وہ چہرے سے سنجیدہ نظر آ رہی تھیں۔

''رومیصہ کا حق مہر کیا ہوگا؟'' انھوں نے پوچھا تھا۔

''جو آپ چاہیں۔'' نبیل جیسے گھر سے پوری تیاری کر کے آیا تھا۔

خالہ نے معاملات طے کرنے شروع کر دیے۔

''ایک تو اس کے نام کوئی گھر ہونا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ ایک لفظ کہے بغیر ان کا پہلا مطالبہ مان گیا۔

''کم از کم پانچ لاکھ روپیہ ہونا چاہیے اس کے نام بینک میں۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اور ماہانہ خرچ کم از کم دو ہزار ہونا چاہیے۔''

''اور کم از کم پچاس تولے زیور بری میں آنا چاہیے۔''

''میں سو تولے دے دوں گا۔'' اس نے صرف آخری مطالبے میں کچھ تبدیلی کی تھی۔

''کچھ اور؟'' نبیل نے پوچھا تھا۔

''نہیں۔بس اتنا ہی کافی ہے۔'' اس بار خالہ کو شرم آ گئی تھی۔

''اب ایک بات آپ میری مان لیں۔میں دو ہفتے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔آپ تاریخ طے کر دیں۔'' اس نے اپنا واحد مطالبہ سامنے رکھا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ہم دو ہفتے میں شادی کر دیں گے۔''

خالہ نے فوراً کہہ دیا۔نبیل نے اپنی جیب سے چیک بک نکال کر ایک لاکھ کا چیک لکھ کر خالہ کو دیا تھا۔

''یہ اخراجات کے لیے ہے۔میرے ایک دوست کی بیوی ہر روز میرے ڈرائیور کے ساتھ آیا کرے گی۔وہ رومیصہ اور آپ کو ساتھ لے جایا کرے گی رومیصہ کو کپڑے اور زیورات پسند کروانے کے لیے۔میں شادی پر کوئی ہنگامہ نہیں چاہتا، چند لوگ آپ کی طرف سے ہونے چاہئیں اور چند ہی لوگ ہماری طرف سے ہوں گے۔ہوٹل کے ہال کی بکنگ کروا دوں گا اور کل آپ کو اس کے بارے میں انفارم کر دوں گا۔کسی اور بارے میں مجھ سے کوئی بات کرنا چاہیں تو ان میں سے کسی بھی نمبر پر رنگ کر کے مجھ سے کونٹیکٹ کر سکتے ہیں۔اب مجھے اجازت دیں۔''

وہ یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔خالہ اور خالو دروازے تک اسے چھوڑنے آئے۔وہ اندر کمرے میں دستر خوان پر بے جان سی بیٹھی تھی وہ نہیں جانتی تھی کہ نبیل نے ان سے کیا کہا تھا مگر وہ بے حد خوفزدہ تھی لیکن خالہ نے اندر آتے ہی اسے گلے لگا لیا تھا۔

''بیٹا! نبیل تو بہت ہی اچھا لڑکا ہے۔ایسے رشتے تو قسمت والوں کو ملتے ہیں۔میں تو اسے انکار نہیں کر سکی۔''

خالہ اس کا منہ چومتے ہوئے کہہ رہی تھیں اور وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

٭٭٭

اگلے دو ہفتے بے حد مصروف گزرے تھے۔نبیل کے ایک دوست کی بیوی ہر روز آیا کرتی تھی اور اسے اور خالہ کو ساتھ لے کر شادی کی شاپنگ کیا کرتی تھی۔خالہ کو اس کی قسمت پر رشک اور حسد دونوں ہوتے تھے۔چند دن پہلے تک وہ کیا تھی اور اب وہ کیا بننے جا رہی تھی۔شادی کے تمام انتظامات نبیل نے کیے تھے۔بیوٹی پارلر سے لے کر ہال تک سب کچھ پہلے سے بک تھا۔شادی والے دن صرف نبیل کے گھر والے اور اس کے کچھ دوست اپنی بیویوں کے ساتھ آئے تھے۔رومیصہ کی طرف سے بھی زیادہ لوگ نہیں تھے۔نکاح کے فوراً بعد رخصتی ہو گئی تھی۔وہ نبیل سکندر کے گھر آ گئی تھی۔جو کسی طرح سے بھی شادی والا گھر نہیں لگ رہا تھا۔نبیل کا کمرہ سیکنڈ فلور پر تھا۔آنے کے فوراً بعد اسے نبیل کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔نبیل کے ماں باپ اور بڑے بھائیوں اور بھابھیوں نے اسے منہ دکھائی میں بجھے دل سے کچھ تحفے دیے تھے۔ان کے رویے سے وہ یہ جان گئی تھی کہ اس شادی سے کوئی بھی خوش نہیں ہے مگر اسے اس سب کی توقع تھی۔اس لیے زیادہ دکھ نہیں ہوا۔پھر اس کے چھوٹے دیوروں نے بھی اسے کچھ تحائف دیے تھے باقی لوگوں کی نسبت ان کا رویہ قدرے بہتر تھا۔خاص طور پر ذیشان کا۔کچھ دیر تو اسے دیکھ کر وہ بھی اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکا تھا۔

''تو نبیل سکندر صاحب! یہی وہ خوبصورتی تھی جس نے آپ کو عقل سے پیدل کر دیا تھا۔'' بے اختیار اس نے سوچا تھا۔وہ بلاشبہ بے تحاشا خوبصورت تھی اور اس وقت تو ویسے بھی خوبصورتی کے تمام ہتھیاروں سے لیس تھی۔

''رومیصہ! یہ وہ بندہ ہے جس نے تم سے شادی کے فیصلے پر میرا سب سے زیادہ مذاق اڑایا تھا۔اس کا خیال ہے کہ میں کبھی بھی ایک اچھا شوہر نہیں ہو سکتا۔''

نبیل نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے اس کے بارے میں کچھ مزید اطلاع فراہم کی تھی۔رومیصہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔وہ

نبیل سے کافی مشابہ تھا اور اس وقت کچھ جھینپا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر رومیصہ سے رسمی سی باتیں کرتا رہا تھا اور پھر وہ نبیل کے ساتھ کمرے سے نکل گیا تھا۔

کمرے میں اب اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس نے سر اٹھا کر کمرے میں نظر دوڑائی تھی اور کچھ لمحوں تک وہ مبہوت ہو کر رہ گئی تھی۔

ہر چیز کتنی خوبصورت ہو گئی تھی۔ اس کی زندگی کی ساری بدصورتیاں پتا نہیں کہاں چھپ گئی تھیں۔ سب کچھ کتنا مکمل، کتنا خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ اور پھر وہ آ گیا تھا اور پتا نہیں اس رات نبیل سکندر نے اس سے کیا کیا کہا تھا۔ اسے پہلی بار دیکھنے سے لے کر آج تک کی ساری کیفیات اس نے اسے بتا دی تھیں۔ اور وہ بس خاموشی سے اس کے خوبصورت چہرے پر نظر آنے والی چمک اور جھلملاتے رنگوں کو دیکھ رہی تھی۔ کیا میں کسی کے لیے اس قدر اہم ہو سکتی ہوں اور وہ بھی نبیل سکندر جیسے بندے کے لیے اسے یقین نہیں آ رہا تھا مگر یہ سب حقیقت تھی۔

⁂

شادی کے تیسرے دن وہ دونوں ہنی مون کے لیے امریکہ آ گئے تھے۔ اور فلائٹ کے دوران یہ سوچ کر اسے ہنسی آ گئی تھی کہ کچھ دن پہلے تک وہ بے حد بے تابی سے اس کے باہر جانے کا انتظار کر رہی تھی، مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ اس بار جب وہ باہر جائے گا تو وہ بھی اس کے ساتھ ہو گی۔

ایک ماہ تک وہ دونوں باہر رہے تھے اور صرف رومیصہ کے لیے ہی نہیں نبیل سکندر کے لیے بھی یہ اس کی زندگی کے سب سے خوبصورت دن تھے۔ اس کا دل چاہتا تھا وہ دنیا کی ہر چیز اسے خرید کر دے دے۔ اس کا جی چاہتا تھا زندگی بس ایسے ہی گزرے۔ ہر مصروفیت ہر کام ختم ہو جائے اگر کچھ باقی رہے تو صرف رومیصہ۔

ایک ماہ بعد وہ واپس آئے تھے اور اس ایک ماہ میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ وہ نبیل کے بارے میں بہت کچھ جان چکی تھی۔ اس کی پسند، ناپسند تقریباً ہر چیز ہی اس کے علم میں آ چکی تھی۔ وہ اس کے معاملے میں کتنا پوزیسو تھا۔ وہ یہ بھی جان چکی تھی اور جتنا وہ اس کے بارے میں جان رہی تھی اتنا ہی وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو رہی تھی۔

امریکہ سے واپس آنے کے دوسرے دن شام کے وقت اس نے اپنے بیگ کھولے تھے اور جو تحفے نبیل کے گھر والوں کے لیے لائی تھی وہ نکالے تھے۔ نبیل اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ وہ اس کی امی کے لیے خریدی گئی گھڑی اور پرفیوم لے کر نیچے آ گئی تھی۔ بہت جھجکتے ہوئے وہ دروازہ کھٹکھٹا کر ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ نبیل کی ممی اس وقت ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر بلش آن لگاتے ہوئے ان کے ہاتھ رک گئے تھے۔ بہت بے تاثر چہرے کے ساتھ انھوں نے اس کے آنے کا مقصد پوچھا تھا۔

''ممی! ہم لوگوں نے آپ کے لیے کچھ گفٹس لیے ہیں۔ میں وہی دینے آئی ہوں۔'' ممی کے تاثرات اس کی بات پر کچھ اور بگڑ گئے تھے۔

''کیا گفٹ لائی ہو؟''

''یہ کچھ پرفیومز اور ایک گھڑی آپ کے لیے۔'' وہ چلتے ہوئے ان کے پاس آ گئی تھی۔ نبیل کی ممی نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے برش سے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے ہوئے پرفیومز کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''کیا ان سے زیادہ اچھے اور مہنگے پرفیوم لائی ہو؟'' ان کے لہجے میں بے حد حقارت تھی۔

ہو جاتا تھا۔ پھر ملازمہ بیڈ رومز کو صاف کیا کرتی تھی اور وہ اسے ہدایات دینے میں مصروف رہتی تھی۔ گھر کے افراد کے کپڑے تقریباً روز دھلتے اور پریس ہوتے تھے اور سہ پہر کا وقت اس کام میں گزر جاتا تھا۔

پھر رات کے کھانے کی تیاری شروع ہو جاتی تھی اور رات کا کھانا بہت سے لوازمات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس لیے نہ صرف اس کی تیاری میں زیادہ وقت لگتا تھا بلکہ بعد میں کچن صاف کروانے اور برتن دھلوانے میں بھی بہت وقت لگ جاتا تھا۔ ممی کا حکم تھا کہ رات کو جب تک ملازم کچن صاف کر کے نہ چلے جائیں وہ نیچے ہی رہے اور کاموں سے فارغ ہوتے ہوتے اسے گیارہ بارہ بج جاتے تھے۔

نبیل کو اس کی ان طویل مصروفیات کا علم نہیں تھا۔ ہنی مون سے واپس آنے کے بعد وہ دس پندرہ دن آفس کے کاموں میں بہت مصروف رہا اور اکثر خود بھی رات کو دیر سے آتا رہا لیکن پھر بہت جلد اس نے رومیصہ کی مصروفیات کا اندازہ لگا لیا تھا۔

''تم اتنی دیر تک نیچے کیا کرتی رہتی ہو؟'' اس دن وہ رات کو کمرے میں داخل ہوئی تھی تو اس نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تھا۔

''تھوڑا کام تھا۔''

''روز کام ہوتا ہے تمہیں؟'' وہ کافی سنجیدہ تھا۔

''کیا کام کرتی ہو؟''

''وہ کچن میں تھوڑا کام ہوتا ہے۔''

''کیوں ملازم نہیں ہیں وہاں؟''

''نہیں۔ میں خود تھوڑا کرتی ہوں۔ وہی کرتے ہیں میں تو بس ذرا اپنے سامنے کام کرواتی ہوں تاکہ سب کچھ ٹھیک سے ہو جائے۔'' وہ بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

''یہ تمہاری ذمہ داری نہیں ہے کہ ان کی نگرانی کرتی پھرو۔ تم کوئی ہاؤس کیپر نہیں ہو۔ میں آئندہ تمہیں یہ سب کرتے نہ دیکھوں۔'' اس نے تنبیہی انداز میں اسے کہا تھا۔

''لیکن ممی نے مجھ سے کہا ہے میں یہ کرواؤں۔''

وہ اس کی بات پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ ''کیا ممی نے یہ سب کرنے کو کہا تھا؟'' وہ بے حد حیران تھا۔

''ہاں۔'' نبیل نے اس کے جواب پر بے اختیار ہونٹ بھینچے تھے۔

''تم کل سے کوئی کام نہیں کرو گی۔ ممی سے میں خود بات کر لوں گا۔''

''نبیل! یہ کوئی برا کام تو نہیں ہے، اپنے گھر کا کام......''

وہ اسے سمجھانا چاہتی تھی لیکن وہ یک دم بھڑک اٹھا تھا۔

''میں نے تمہیں لیکچر دینے کے لیے نہیں کہا۔ برا کام ہے یا اچھا کام ہے۔ تمہیں یہ کام نہیں کرنا۔ اور میں یہ بات دہراؤں گا نہیں۔''

رومیصہ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کچھ کہہ پاتی وہ تو اس کے بدلتے ہوئے تیوروں پر حیران ہوگئی تھی۔ نبیل نے اس طرح تو کبھی بات نہیں کی تھی۔ جھڑکنا تو دور کی بات وہ کبھی اس سے ناراض بھی نہیں ہوا تھا اور اب وہ اتنے خراب موڈ میں تھا کہ اسے اس سے خوف آنے لگا تھا۔ وہ لائٹ بجھا کر لیٹ گیا تھا اور وہ کتنی ہی دیر تاریکی میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ تو جیسے یک دم اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ ایک چھوٹی سی بات اتنی بڑھ جائے گی۔ اگلے دن نبیل نے پتا نہیں کس انداز میں ممی سے بات کی تھی مگر اس کا ردعمل یہ ہوا کہ ممی نے رات کے کھانے کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ نبیل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا مگر وہ بے حد شرمندہ تھی۔

اس کے ساتھ نبیل کا رویہ پہلے سے بھی زیادہ خوشگوار تھا۔ وہ رات کے کھانے کے بعد اسے سیر کرانے باہر لے گیا تھا۔ کافی دنوں بعد وہ اسے گھمانے کے لیے لے کر گیا تھا شاید یہ پچھلی رات کو ہونے والی تلخی کی تلافی تھی یا پھر شاید وہ ممی کے رویے کی تلافی کر رہا تھا۔ وجہ جو بھی تھی وہ اس کے ساتھ باہر وقت گزار کر کچھ پرسکون ضرور ہو گئی تھی۔

✿

پھر ان ہی دنوں اسے پتا چلا تھا کہ وہ ماں بننے والی تھی۔ زندگی میں یک دم جیسے ایک نیا موڑ آ گیا تھا۔ وہ تو یقیناً خوش تھی ہی لیکن نبیل تو جیسے ساتویں آسمان پر تھا۔ پتا نہیں وہ اپنے بچے کے لیے کیا کیا پلاننگ کرتا رہتا تھا اس کی خواہش تھی کہ اس کے ہاں بیٹی ہو۔

''یار! ہمارے گھر میں اتنے مرد ہیں کہ گھر کی ساری خوبصورتی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ بس اشعر بھائی کی ایک بیٹی ہے اور تم نے دیکھا ہے سب لوگ ان کے بیٹوں کو چھوڑ کر مونا کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ میرا دل بھی یہی چاہتا ہے کہ میرے ہاں بھی ایک بیٹی ضرور ہو۔ بہت کیوٹ سی Tender and delicate بالکل تمہاری طرح۔'' وہ اسے اکثر کہتا رہتا تھا۔

''اور اگر وہ پیاری نہ ہوئی تو'' وہ کبھی کبھار کہتی اور وہ ٹھنڈی سانس بھرتا۔

''پھر کیا ہو سکتا ہے۔ مجبوری ہے اپنی اولاد ہوگی، اسے پھینک تو نہیں سکتے، چلو خیر کم از کم بیٹی تو ہوگی نا۔''

''بیٹیاں بہت مسائل پیدا کر دیتی ہیں۔ کبھی تم نے یہ سوچا ہے؟'' وہ بڑی سنجیدگی سے کہتی۔

''رومیصہ پرابلمز ان کے لیے ہوتے ہوں گے جن کے پاس روپیہ نہیں ہوتا۔ میرے پاس بہت روپیہ ہے ایک کے بجائے سات بیٹیاں بھی ہوں تو مجھے کوئی فکر نہیں ہوگی۔ اس لیے تم یہ سو سال پرانے خیالات اپنے دماغ سے نکال دو۔''

وہ بڑی لاپروائی سے کہتا جاتا اور وہ اسے دیکھتی رہ جاتی۔

✿

اس دن خالہ اس سے ملنے آئی تھیں۔ نوکر نے انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا تھا۔ اور پھر اسے اطلاع کی تھی۔ اسے نیچے آنے میں چند منٹ لگ گئے تھے اور جب وہ نیچے آئی تھی تو ممی پہلے ہی ڈرائنگ روم میں موجود تھیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ خالہ سے ان کی تلخ کلامی ہو چکی تھی۔ خالہ سرخ چہرہ لیے کھڑی تھیں۔ وہ سب کچھ سمجھ گئی تھی۔

''ایک بات تم کان کھول کر سن لو، یہ گھر میں نے تھرڈ کلاس لوگوں کی آمدورفت کے لیے نہیں بنایا ہے۔ یہاں تم کو رکھ لیا ہے اتنا کافی ہے کسی اور گندگی کی جگہ نہیں ہے، تمھیں اپنے رشتہ داروں سے ملنا ہو تو ان کے گھر جا کر ملا کرو، انھیں یہاں مت بلوایا کرو۔ جو دینا دلانا ہو وہ وہیں جا کر دے آیا کرو۔''

ممی کے منہ میں جو آیا انھوں نے کہا اور وہاں سے چلی گئیں۔ اس کی خالہ بھی بگڑے تیوروں کے ساتھ کچھ کہے بغیر وہاں سے چلی گئی تھیں، اس میں اتنی ہمت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ انھیں روک پاتی۔ وہ تو شاید یہ سب نبیل سے کبھی نہ کہتی لیکن خالہ چپ نہیں رہی تھیں۔ انھوں نے واپس جاتے ہی اسے فون پر پورا واقعہ سنا دیا تھا۔ اور وہ لنچ سے پہلے ہی اکھڑے تیوروں کے ساتھ گھر آ گیا تھا، پھر وہ سیدھا ممی کے پاس گیا تھا اور ایک ہنگامہ تھا جو وہاں برپا ہو گیا تھا۔ ممی کے جو منہ میں آیا تھا انھوں نے سنایا تھا اور وہ بھی خاموش نہیں رہا تھا۔ اس کا دل ممی کی طرف سے پہلے ہی کھٹا تھا اس واقعہ نے اس کی کدورت کو اور بڑھایا تھا۔

خوش تو ممی اس سے پہلے بھی نہیں تھیں مگر اس ایک واقعہ کے بعد جو تھوڑی بہت مروت یا لحاظ وہ دکھا دیا کرتی تھی وہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ وہ موقع بے موقع اس کی تذلیل کیا کرتی تھیں۔ انھیں اس کی ہر چیز پر اعتراض تھا۔ اس کے لباس سے لے کر کھانے پینے کے انداز تک وہ ہر چیز کا مذاق اڑایا کرتی تھیں اور وہ یہ سب کھلے عام کرتی تھیں۔ انھیں قطعاً پروا نہیں ہوتی تھی کہ وہ کیا محسوس کرے گی یا نبیل کیا سوچے گا۔ جہاں تک نبیل کا تعلق تھا وہ اس جھگڑے کے کچھ عرصے بعد تک تو خاموشی سے ان سب باتوں کو نظر انداز کرتا رہا، مگر اس کے صبر کا پیمانہ آہستہ آہستہ لبریز ہو گیا تھا۔ اس دن اس نے اپنے باپ سے بات کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور جب اس نے سکندر علی سے بات کی تو وہ بالکل شاکڈ رہ گئے تھے۔

''نبیل! تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں نے جو بھی کہا ہے، بالکل ٹھیک کہا ہے۔ آپ جائیداد میں سے میرا حصہ دے دیں۔ میں الگ ہونا چاہتا ہوں۔'' وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

''آخر بات کیا ہے؟ ہوا کیا ہے؟''

''کیا آپ نہیں جانتے کہ ہوا کیا ہے اور اس گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ مجھے کچھ بتانے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے۔''

''تم اپنی ممی کے ساتھ ہونے والے جھگڑے کی بات کر رہے ہو۔ اس کی وجہ سے ناراض ہو؟''

سکندر علی کو نبیل اور اپنی بیوی کے درمیان ہونے والی چپقلش یاد آ گئی تھی۔

وہ ان کی بات پر جیسے پھٹ پڑا تھا۔ ''آپ کہہ رہے ہیں ناراض ہوں۔ میں ناراض نہیں ہوں۔ میں یہ تماشا مزید برداشت نہیں کر سکتا۔''

''دیکھو نبیل! رومیصہ اور فاخرہ کے درمیان جو تلخی ہے وہ ہر ساس اور بہو کے درمیان ہوتی ہے۔ ایسی چیزیں گھروں میں ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی معمولی بات پر کیا بندہ گھر چھوڑ دے۔''

پاپا! جو ممی اور رومیصہ کے درمیان ہے وہ تلخی نہیں وہ رومیصہ کو ٹارچر کرتی رہتی ہیں اور نہ صرف وہی نہیں اس گھر کا ہر فرد، آپ بھائی ان کی بیویاں ہر ایک۔''

نبیل نے سکندر علی کو بھی نہیں بخشا تھا۔

''نبیل! تم غلط سوچ رہے ہو۔ تمہاری بیوی میری بیٹیوں جیسی ہے میں اسے ٹارچر کیوں کروں گا۔'' انھیں بیٹے کی بات بہت بری لگی تھی۔

''آپ صرف زبان سے کہتے ہیں۔ دل سے سمجھتے نہیں۔ اگر آپ نے واقعی اسے بیٹی سمجھا ہوتا تو کیا آپ ممی کو ان کی حرکتوں سے منع نہیں کرتے۔ کیا آپ کو نظر نہیں آتا کہ وہ رومیصہ کے ساتھ کیا سلوک کر رہی ہیں۔ وہ اس کی ہر بات پر تنقید کرتی ہیں، انھیں اس کے گلاس پکڑنے کے طریقے تک پر اعتراض ہے۔ اتنی تنقید تو ویسے ہی اسے ذہنی مریض بنا دے گی۔ میں یہاں اسے اپنی بیوی بنا کر لایا تھا۔ آپ لوگوں نے اسے تماشا بنا دیا ہے اور آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ اسے بیٹی سمجھتے ہیں۔ کبھی آپ نے ممی کو سب کے سامنے اس کا مذاق اڑانے سے روکا۔ کبھی نہیں۔ میری شادی کو تین سال نہیں ہوئے صرف تین ماہ ہوئے ہیں اور آپ لوگ۔''

ذیشان کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا تھا۔ صورت حال گھمبیر تھی یہ تو وہ نبیل کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے سے ہی جان گیا تھا۔ نبیل اور سکندر علی دونوں نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''شادی کی اجازت آپ نے دی تھی مجھے اور آپ کو میں نے اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا پھر اب ہر ایک کو بار بار یاد کیوں آنے لگا ہے کہ وہ سیکرٹری جیسی گھٹیا جاب کرتی تھی۔ اس کے کردار پر شک ہونے لگا ہے وہ میری بیوی ہے اگر مجھے اس کی کسی چیز پر اعتراض نہیں ہے تو آپ لوگوں کو کیوں ہے؟''

''کیا بات ہے نبیل! کیا ہوا ہے؟'' ذیشان کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

نبیل نے سرخ چہرے کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔ ''بیٹھ جاؤ اور تم بھی سن لو۔ میں جائیداد میں سے اپنا حصہ چاہتا ہوں۔ میں اس گھر میں رہنا نہیں چاہتا۔'' اس کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔

''نبیل؟'' وہ نبیل کی بات پر حیران رہ گیا تھا۔

''نبیل! تم بہت زیادہ جذباتی ہو رہے ہو۔ تمھیں بہت زیادہ غلط فہمیاں ہو گئی ہیں یہ ٹھیک ہے کہ فاخرہ کا رویہ رومیصہ کے ساتھ مناسب نہیں ہے لیکن تم اپنی ممی کو اچھی طرح جانتے ہو وہ انھیں دوسروں کے جذبات یا احساسات کی پروا کم ہی ہوتی ہے اور صرف رومیصہ کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہوتا۔ وہ ستارہ اور عالیہ سے بھی خوش نہیں ہیں، بس فرق یہ ہے کہ ستارہ اور عالیہ کے ساتھ فاخرہ کا سلوک قدرے بہتر ہوتا ہے اور کیوں بہتر ہوتا ہے یہ تم جانتے ہو۔ لیکن فاخرہ آخر کب تک یہ رویہ رکھے گی۔ آہستہ آہستہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

سکندر علی نے اس کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔

''کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ آپ میری بات یاد رکھیے گا۔ ممی رومیصہ کے لیے اپنے دل سے نفرت اور کدورت کبھی نہیں نکال سکتیں اور وہی کیوں اس گھر کے باقی سب لوگ بھی آپ بھی پاپا آپ بھی۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر آج میں مر جاؤں تو آپ لوگ تو مجھے دفن کرنے سے پہلے رومیصہ کو دھکے دے کر اس گھر سے نکال دیں گے۔ آپ لوگ تو ایک بار بھی نہیں سوچیں گے کہ میں نے اس سے کتنی محبت کی تھی۔ آپ کو تو ایک لمحے کے لیے بھی ترس نہیں آئے گا۔''

''نبیل! تم کیسی فضول باتیں کرنے لگے ہو۔''

اس بار ذیشان نے پہلی بار اسے ٹوکا تھا۔ سکندر علی تو بس اس کا چہرہ دیکھے جا رہے تھے۔ انھیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ جس کو سب سے زیادہ چاہتے تھے وہ کبھی ان سے اس حد تک بدگمان ہو سکتا ہے۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ذیشان! میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں اور تم بھی اسی گروہ میں ہو گے۔ انہی لوگوں کا ساتھ دو گے؟'' وہ آج بدگمانی کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔

''پاپا! آپ مجھے بتا دیں۔ کیا آپ مجھے جائیداد میں سے حصہ دیں گے یا نہیں اور اگر آپ نہیں دینا چاہتے تو بھی آپ مجھے بتا دیں تاکہ میں اپنے لیے کچھ کر سکوں۔'' وہ اب اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''میں تمھیں جائیداد میں سے حصہ کیوں نہیں دوں گا۔ نبیل! کیوں اس طرح کی باتیں کر رہے ہو۔'' انھیں اس کی باتوں سے بے حد تکلیف پہنچ رہی تھی۔

''آپ نے مجبور کیا ہے مجھے اس طرح کی باتیں کہنے پر اور جہاں تک جائیداد میں حصہ نہ دینے کی بات ہے تو یہ ممی نے کہا ہے انھیں لگتا ہے کہ میں اور میری بیوی ان کے شوہر کی کمائی پر عیش کر رہے ہیں ان کے بقول میں کچھ نہیں کرتا۔ ساری محنت آپ اور ان کے دونوں بڑے بیٹے کرتے ہیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ شاید آپ کا بھی یہی خیال ہو اور آپ مجھے کچھ دینا نہیں چاہتے۔'' وہ کافی تلخی سے مسکرایا تھا۔

''میں نے تمھیں کہا نا۔ تمہاری ممی بے وقوف ہے۔ اسے کیا پتہ ہے کہ کون کیا کام کرتا ہے۔ میری جائیداد میں جتنا حصہ باقی سب کو ملے گا تمھیں بھی ملے گا۔ کم از کم اس معاملے میں تمھیں شبہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

انھوں نے جیسے اسے یقین دہانی کروانے کی کوشش کی تھی۔ وہ کچھ دیر تک بڑی عجیب نظروں سے ان کا چہرہ دیکھتا رہا تھا۔

''پاپا! کبھی کبھی مجھے ایسے لگتا ہے جیسے آپ......'' وہ اپنی بات مکمل کیے بغیر کمرے سے چلا گیا تھا۔ کچھ دیر تک کمرے میں مکمل خاموشی رہی۔

''تم نے دیکھا ذیشان! یہ کیسی باتیں کر رہا ہے؟'' چند لمحوں بعد سکندر علی نے اس خاموشی کو توڑا تھا۔

''پاپا! اگر وہ یہاں نہیں رہنا چاہتا تو آپ اسے الگ ہو جانے دیں۔ یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔'' ذیشان نے بہت پرسکون انداز میں کہا تھا۔

''تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں خود اپنے گھر کو توڑ دوں۔'' سکندر علی بے چین ہو گئے تھے۔

''رشتے ٹوٹ جانے سے بہتر ہے کہ گھر ٹوٹ جائے۔ ممی رومیصہ سے واقعی کوئی اچھا سلوک نہیں کر رہیں اور آپ جانتے ہیں کہ وہ اس کے بارے میں کتنا حساس ہے۔ وہ یہاں رہے گا تو اسی طرح غصہ میں آتا رہے گا۔ بہتر ہے آپ اسے گھر الگ کرنے دیں جہاں تک بزنس الگ کرنے کی بات ہے تو میں اسے سمجھا لوں گا۔ میرا خیال ہے وہ صرف غصہ میں یہ کہہ گیا ہے۔ غصہ ٹھنڈا ہو گا تو میں اس سے بات کروں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔'' ذیشان انھیں تسلی دے کر چلا گیا تھا۔

پھر شیخوپورہ واپس جانے سے پہلے اس نے نبیل سے بات کی تھی نبیل کے پاس سب کے خلاف شکایتوں کا ایک ڈھیر تھا۔ ذیشان جانتا تھا کہ یہ شکایتیں بے بنیاد نہیں ہیں مگر نبیل پر وہ اثر انداز ہو سکتا تھا۔ اس لیے اس نے اسے سمجھا بجھا کر اس کا غصہ ٹھنڈا کر دیا اور اسے اس بات پر تیار کر لیا کہ وہ بزنس سے الگ نہ ہو ہاں البتہ چاہے تو علیحدہ گھر لے لے۔ خود ذیشان کو بھی اس کے مسائل کا حل الگ گھر ہی نظر آتا تھا۔

اس جھگڑے کے بعد نبیل کی سکندر علی سے دوبارہ بات ہی نہیں ہو پائی۔ کچھ اس کے دل میں خفگی تھی کچھ سکندر علی بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ خود ان سے بات کرے مگر نبیل کو کچھ آرڈرز کے سلسلے میں امریکہ جانا تھا اور وہ اس سلسلے میں اتنا مصروف رہا کہ سکندر علی سے دوبارہ علیحدگی میں اس کی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔

''رومیصہ! مجھے امریکہ میں تقریباً ایک ماہ لگ جائے گا۔ ویسے میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد اپنا کام مکمل کر کے واپس آ جاؤں۔ لیکن پھر بھی میں تین ہفتے سے پہلے واپس نہیں آ سکتا۔ تم اگر ٹھیک ہوتیں تو میں تمہیں بھی ساتھ لے جاتا۔ لیکن خیر میں وہاں سے روز فون کیا کروں گا؟''

جانے سے ایک دن پہلے وہ سامان کی پیکنگ کرتے ہوئے اسے کہہ رہا تھا۔

''نبیل! کیا جانا بہت ضروری ہے؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''ہاں بے حد ضروری ہے۔ رومیصہ! اب مجھے پہلے سے زیادہ کام کرنا ہے۔ آج یا کل مجھے اپنا بزنس شروع کرنا ہے اور اگر میرے کونٹیکٹ نہیں ہوں گے تو مجھے بہت مشکل پیش آئے گی اور ویسے بھی ابھی ہم جس گھر میں شفٹ ہوں گے وہ تو پاپا کا ہی ہے مگر ظاہر ہے پھر اپنا گھر بنوانا پڑے گا اور اس سب کے لیے بہت زیادہ روپے کی ضرورت پڑے گی اس لیے تمہیں اب تیار ہو جانا چاہیے۔ میرے اس قسم کے لمبے ٹورز کے لیے۔''

وہ بہت سنجیدگی سے اسے سمجھا رہا تھا۔

''جو فلیٹ تم نے مجھے گفٹ کیا تھا کیا ہم اس میں شفٹ نہیں ہو سکتے وہ تو ہماری ضرورت سے زیادہ ہے۔''

''رومیصہ! میں فلیٹس میں رہنے کا عادی نہیں ہوں۔ میرا دم گھٹتا ہے وہاں مجھے بڑے بڑے گھروں میں رہنے کی عادت ہے اور ویسے بھی ہم جہاں شفٹ ہو رہے ہیں وہ گھر بے کار پڑا ہوا ہے پھر اسی بلاک میں ہے۔ میں یہاں بھی آسانی سے آ جا سکوں گا۔ تقریباً ہر چیز ہے وہاں پر پھر بھی تم وہاں کا چکر لگا لینا۔ کسی چیز کی کمی ہو تو ذیشان کو بتا دینا فون کر کے، یا پھر میرے آفس میں عظیم صاحب کو فون کر دینا۔ میں چاہتا ہوں کہ واپس آنے کے فوراً بعد وہاں شفٹ ہو جاؤں۔ تم ڈاکٹر کے پاس باقاعدگی سے جاتی رہنا اور اپنا خیال رکھنا۔ اگر باہر سے کچھ منگوانا ہے تو مجھے بتا دو بلکہ لسٹ بنا دو۔''

اس کے پاس ہدایات کا ایک انبار تھا۔

''اتنی لمبی چوڑی فرمائشیں تو نہیں ہیں میری کہ لسٹ بنانی پڑے لیکن بہر حال میں تمہیں لکھ کر دوں گی تا کہ تمہیں یاد رہے۔''

میں چاہتا ہوں تم لمبی چوڑی فرمائشیں کرو۔ مجھے بہت اچھا لگے گا اگر تم ایسا کرو گی۔''

وہ بریف کیس کھولتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ رومیصہ نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ بس خاموشی سے نبیل کے چہرے کو دیکھنے لگی جو بریف کیس سے کچھ کاغذات نکال کر دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بہت عجیب سے احساسات تھے اس کے۔ ہمیشہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ وہ اتنا

خوبصورت تھا کہ بعض دفعہ اس کا دل چاہتا وہ اس کے چہرے پر اپنا ہاتھ پھیر کر اس کے نقوش کو محسوس کرے اور کبھی کبھار وہ بے خیالی میں اسے دیکھتی رہتی۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ وہ بے خیالی میں اسے دیکھے گئی تھی۔ کچھ دیر تک نبیل کو احساس نہیں ہوا مگر پھر شاید وہ جان گیا تھا کہ وہ اس پر نظریں جمائے بیٹھی ہے۔ اس نے بریف کیس میں پیپرز رکھتے ہوئے یک دم اسے دیکھا تھا اور مسکرایا تھا۔ اور رومیصہ نے بہت تیز رفتاری سے اپنی توجہ ٹیرس پر مبذول کر لی تھی۔

اگلے دن شام کی فلائٹ سے وہ چلا گیا تھا۔ اور رومیصہ کو پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ اس کی موجودگی اس کے لیے کتنی اہم تھی۔ شادی کے بعد پہلی دفعہ وہ اس طرح اسے چھوڑ کر گیا تھا اور ساری دنیا اسے جیسے ویران لگنے لگی تھی۔ اس رات وہ جاگتی رہی تھی۔ اسے نیند ہی نہیں آئی۔

''اور ابھی صرف پہلا دن ہے۔'' اس نے سوچا تھا شاید وہ اس کی کمی اس لیے محسوس کر رہی تھی کیونکہ اس گھر میں وہ واحد آدمی تھا جس سے وہ بات کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کے پاس وہ چند منٹوں کے لیے جا کر بیٹھ سکتی۔ اگلے دن دوپہر کے قریب اس کا فون آیا تھا۔ وہ بھی اسے بہت مس کر رہا تھا۔ مگر اس وقت رومیصہ کو اس کی آواز ہی بہت بڑی نعمت لگ رہی تھی۔

''میں تمہیں صبح کے وقت ہی فون کیا کروں گا۔ کیونکہ اس وقت یہاں رات ہوتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ جب پاکستان میں رات ہوا کرے تو تم بس سو جایا کرو۔ کسی قسم کے انتظار کی تکلیف نہ اٹھانی پڑے تمہیں۔ اس لیے میں کبھی تمہیں رات کو فون نہیں کروں گا۔''

اس نے رومیصہ سے کہا تھا اور پھر یہی ہوا تھا وہ صبح دس گیارہ بجے کے قریب فون کیا کرتا تھا اور کافی دیر تک باتیں کرتا تھا۔

دن آہستہ آہستہ گزر رہے تھے اور وہ بے چینی سے اس کی واپسی کی منتظر تھی۔

☆

اس رات اس کی آنکھ بہت عجیب سا شور سن کر کھلی تھی۔ کچھ دیر تک وہ بیڈ پر لیٹی آنکھیں کھولے اس شور کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے نیچے کوئی زور زور سے دروازہ بجا رہا تھا پھر کسی کی چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ پہلے شور کم تھا پھر زیادہ ہو گیا پھر کوئی بھاگتے ہوئے اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے سے گزرا تھا اور تھوڑی دیر بعد دروازہ بجانے کی آواز آنے لگی تھی، مگر اس بار یہ آواز دوسری منزل پر تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ٹیبل لیمپ جلا کر اس نے وقت دیکھا تھا رات کے دو بج رہے تھے۔ وہ تیزی سے بیڈ سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر پہلے تک جن چیخوں کی آوازیں بے حد مدھم ہو کر اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ اب وہ بالکل صاف ہو گئی تھیں۔ پتا نہیں کیا بات تھی مگر ممی نیچے ہال میں بہت بلند آواز سے چیخیں مار رہی تھیں۔ اس نے ریلنگ کو پکڑ کر نیچے جھانکا نیچے ہال میں سب ہی تھے۔ مگر کوئی بھی ممی کو چپ کروانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

اس کا چھوٹا دیور ولید خود بھی ممی کے ساتھ لپٹا ہوا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پائی۔ بہت تیزی سے وہ سیڑھیوں کی طرف آئی تھی۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے آنے کے بعد وہ ٹھٹھک کر رک گئی تھی۔

''کیا ہوا ہے؟'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ سب نے اسے دیکھا تھا اور اس نے فراز کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کی آنکھیں

سرخ تھیں اور چہرہ ستا ہوا تھا۔

''بھائی! نبیل بھائی کی ڈیتھ ہوگئی۔'' وہ جملہ مکمل کرتے کرتے رونے لگا تھا وہ بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھتی رہ گئی۔

''نبیل کی......'' اپنی آواز اسے کھائی سے آتی ہوئی لگی تھی۔ وہ صرف دو لفظ ہی کہہ سکی جو باقی رہ گیا تھا۔ اسے کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی وہ حقیقت تھا۔

بالکل کسی مجسمے کی طرح وہ کھڑی ہال میں سب کو روتے چلاتے دیکھ رہی تھی۔ سن رہی تھی مگر اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایسا ہو کیسے سکتا ہے۔ ابھی صبح ہی تو وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اس کی مصروفیات بہت زیادہ ہوگئی ہیں۔ وہ جلدی واپس نہیں آئے گا اسے دیر ہوجائے گی، شاید ان سب کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے یا پھر شاید میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہوں۔ آج کل مجھے خواب بھی تو برے ہی آ رہے ہیں۔ ہاں یہ کوئی خواب ہی ہے، جب میری آنکھ کھلے گی تو صبح ہو چکی ہوگی۔ سب کچھ پہلے جیسا ہوگا۔ یہ ساری آوازیں، سارا شور ساری چیخیں ختم ہو جائیں گی کچھ بھی نہیں ہوگا۔

لوگوں کو ان کے دل جو فریب دیتے ہیں۔ وہ اسے اس کا دماغ دے رہا تھا۔ اشعر فون پر لوگوں کو اس کے مرنے کی اطلاع دے رہا تھا۔ اس نے سنا تھا کئی بار اس کی زبان سے سنا تھا۔

''نبیل مر گیا ہے۔''

''ایکسیڈنٹ میں نبیل کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔''

بہت آہستہ آہستہ یہ منظر دھندلانا شروع ہوگیا تھا۔ جسے دماغ قبول نہیں کر رہا تھا اسے دل نے قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ منظر صرف چند لمحوں کے لیے دھندلایا تھا جب آنکھوں سے پانی بہنا شروع ہوا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ کلیئر زیادہ بدصورت ہو کر سامنے آ گیا تھا۔ اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔ ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس نے دیوار سے ٹیک لگالی۔ کسی نے ہال کا بیرونی دروازہ کھول دیا تھا۔

''اللہ میرے ساتھ یہ کیسے کرسکتا ہے۔ مجھے پاتال میں کیسے پھینک سکتا ہے۔'' وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ سوچ رہی تھی۔

''میں جلدی واپس نہیں آؤں گا۔'' ابھی صبح ہی تو اس نے کہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

''پتا نہیں لوگ مجھے چھوڑ کر کیوں چلے جاتے ہیں۔ مجھ پر رحم کیوں نہیں کھاتے؟'' وہ فرش پر بیٹھ گئی۔

''یار! بعض دفعہ میرا دل چاہتا ہے، میں ہمیشہ کے لیے چپ ہو جاؤں بلکہ سب چپ ہو جائیں اگر کوئی بات کرے تو صرف تم۔ کسی کی آواز آئے تو صرف تمہاری۔ میری نہیں کسی کی بھی نہیں۔'' کوئی اس کے کانوں میں سرگوشی کر رہا تھا۔

''تو اب تم کبھی مجھے نظر نہیں آؤ گے۔'' میں چاہوں گی تو بھی تمہیں چھو نہیں پاؤں گی۔'' آنسوؤں کی رفتار میں بے حد اضافہ ہوگیا تھا۔

''رومی! آج سے تیس سال بعد جب ہم بوڑھے ہو جائیں گے تو ایسا کریں گے کسی سنسان سی جگہ پر اپنا گھر بنائیں گے کہیں پہاڑوں کے درمیان یا کہیں کسی جزیرے میں جہاں ہمارے علاوہ کوئی نہ ہو۔ کتنا رومانٹک لگتا ہے یہ سب۔ ہے نا۔ زندگی، تنہائی، خوبصورتی اور ہم۔ مگر ابھی اس خواب کو پورا ہونے میں تیس سال لگیں گے۔''

''تیس سال تیس سال'' وہ گھٹنوں میں سر دے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ ''پتا ہے رومی! میرا دل چاہتا ہے میں اپنے بچے کو بہت وقت دوں روز کچھ گھنٹے اس کے ساتھ ضرور گزاروں۔ اس کے ساتھ ہر موضوع پر بات کروں۔ کھیل سے لے کر اسٹڈیز تک ہر چیز پر۔ بزنس اہم ہونا چاہیے مگر سب سے اہم گھر ہونا چاہیے۔ بچے ہونے چاہئیں۔ میں اپنے باپ کی طرح دن رات بزنس میں مصروف نہیں رہنا چاہتا۔ اتنا مصروف نہیں رہنا چاہتا کہ میرا بچہ میری شکل بھی بھول جائے اور تمہیں میری تصویر دکھا کر اسے بتانا پڑے کہ یہ تمہارا باپ ہے۔''

پتا نہیں اسے کیا کیا یاد آ رہا تھا۔ یادیں جیسے خنجر بن کر اس پر وار کر رہی تھیں۔ وہ کتنے گھنٹے سر گھٹنوں میں چھپائے روتی رہی تھی۔

چار ماہ پہلے اسے لگا تھا جیسے کسی نے اس کی راہ کے سارے کانٹے چن لیے تھے۔ جیسے اس کے نصیب کی بدبختی ختم ہو گئی تھی۔ چار ماہ بعد وہ پھر وہیں کھڑی تھی۔ سب کچھ پہلے سے بھی بدتر تھا۔ پہلے زندگی میں کوئی نبیل سکندر نہیں تھا۔ زندگی مشکل تھی۔ وہ اب بھی نہیں تھا زندگی کیا رہ گئی تھی۔

⁂

جس دن اس نے رومیصہ سے بات کی تھی بات کرنے کے دس گھنٹے بعد وہ ایک کار کریش میں مارا گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو دوست بھی تھے مگر وہ دونوں محفوظ رہے تھے۔ انھیں صرف معمولی چوٹیں آئی تھیں مگر نبیل سکندر کے دماغ کے اندرونی حصہ پر چوٹ آئی تھی اور وہ فوری طور پر جاں بحق ہو گیا تھا۔ چار دن بعد اس کی لاش پاکستان لائی گئی تھی اور اسے دفن کر دیا گیا تھا۔ وہ اکیلا دفن نہیں ہوا تھا۔ اس کے ساتھ رومیصہ کے خواب، خواہشیں اور آرزوئیں بھی دفن ہو گئی تھیں سب کچھ پہلے کی طرح بکھر کر رہ گیا تھا۔ جب تک نبیل سکندر زندہ تھا تب تک سکندر علی کو رومیصہ کی پروا نہیں تھی مگر اس کی موت کے بعد وہ یک دم بدل گئے تھے۔ وہ روز دو تین بار رومیصہ کے پاس آتے، اسے تسلی دیتے اسے کھانا کھانے کی ہدایت کرتے۔ نبیل جانے سے پہلے ان سے لڑ کر گیا تھا اور وہ ان پر جتنی بے یقینی ظاہر کر کے گیا تھا۔ وہ شاید نادانستہ طور پر اسے غلط ثابت کرنا چاہتے تھے۔ بے شمار پچھتاوے تھے جو انھیں اپنے رویے کے بارے میں تھے۔ نبیل کی کہی گئی ایک ایک بات، ایک ایک جملہ جیسے ان کے دل میں کانٹے کی طرح گڑ کر رہ گیا تھا۔ اگر وہ یہ جانتے کہ اب وہ اسے دوبارہ کبھی زندہ نہیں دیکھیں گے تو شاید اس سے معافی مانگ لیتے۔ اپنے رویے کی معذرت کر لیتے۔ ایک بار اسے گلے لگاتے۔ اس کا ماتھا چومتے پھر شاید یہ کسک، یہ پچھتاوے اتنے تکلیف دہ نہ ہوتے بلکہ شاید ہوتے ہی نا۔ مگر سب کچھ ایسے ہی ہونا تھا۔ ان کے پچھتاوے نبیل کو واپس نہیں لا سکتے تھے۔ مگر کم از کم انھوں نے اس کی بیوی اور ہونے والے بچے کو تحفظ ضرور دے دیا تھا۔

دن آہستہ آہستہ گزر رہے تھے۔ سب کچھ معمول پر آتا جا رہا تھا۔ سب لوگ نارمل ہوتے جا رہے تھے۔ اگر کسی کے لیے نارمل ہونا مشکل تھا تو وہ رومیصہ تھی۔ چار ماہ میں نبیل سکندر نے اسے اتنا چاہا تھا کہ اب اس کے بغیر رہنا اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کسی نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہو، اور اسے اندھی بن کر زندگی گزارنا پڑ رہا ہو۔ نبیل کے چالیسویں کے ایک ہفتہ کے بعد ممی اس کے پاس آئی تھی اور بڑے کھردرے انداز میں انھوں نے اس سے کہا تھا۔

''مجھے نبیل کی درازوں کی چابیاں چاہئیں۔'' وہ ان سے اس جملے کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ نبیل کی موت سے لے کر اس دن تک انھوں نے اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ نہ اس سے بات کی تھی اور اب وہ درازوں کی چابیاں لینے آ گئی تھیں۔ وہ خاموشی سے ڈریسنگ روم میں چلی آئی۔ ممی

اس کے پیچھے ہی آ گئی تھیں۔ چابیاں ان کے ہاتھ میں تھمانے کے بعد وہ ڈریسنگ روم کے دروازے میں کھڑی ہوگئی۔ انھوں نے نبیل کی درازیں کھولنا شروع کر دی تھیں۔ ایک دراز انھوں نے باہر نکال لی تھی۔ اور باقی درروازوں سے وہ نبیل کے کاغذات، کریڈٹ کارڈز، چیک بکس اور کرنسی سمیٹ کر اس دراز میں ڈالنے لگیں۔ ایک ایک کر کے انھوں نے نبیل کی ساری درازیں خالی کر دی تھیں۔ وہ دراز بھر گئی تو انھوں نے ایک اور دراز نکال لی پھر انھوں نے رومیصہ کی درازوں کی چابیاں مانگی تھیں۔ اسی خاموشی سے اس نے وہ بھی انھیں تھما دی تھیں۔ انھوں نے پہلے اس کی الماری کھولی تھی اور زیورات کے تمام ڈبے خالی کر دیے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے حق مہر میں دیے گئے فلیٹ کے کاغذات بھی دراز میں ڈال لیے تھے۔ اس کے پاس ڈیڑھ دو لاکھ کی رقم بھی جو پچھلے چار ماہ میں وقتاً فوقتاً نبیل اس کی دراز میں رکھتا رہا تھا ممی نے وہ سارے روپے نکال لیے تھے۔ پھر انھوں نے اس کی چیک بک اور ایک پین اسے تھما دیا تھا۔

''ایک چیک پر دستخط کر دو۔'' وہی کھردری آواز پھر گونجی تھی۔ اس نے کسی معمول کی طرح سائن کر دیے تھے۔ دراز خالی کرنے کے بعد ممی نے ڈریسنگ ٹیبل کی درازیں کھولنا شروع کی تھیں اور وہاں موجود وہ جیولری بھی نکال لی تھی جو وہ گھر میں عام طور پر پہنتی تھی مگر نبیل کے مرنے کے بعد اس نے اتار دی تھی۔ سب چیزیں اکٹھی کرنے کے بعد انھوں نے ملازمہ کو بلوایا تھا اور وہ دراز اٹھا کر لے گئی تھی۔ وہ بے حد خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ چار ماہ پہلے اس کمرے میں آ کر اس نے سوچا تھا کہ وہ ایک ایسے خواب میں داخل ہوگئی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

وقت سے کون کہے یار ذرا آہستہ

گر نہیں وصل تو یہ خوابِ رفاقت

ہی ذرا دیر رہے

وقفہ خواب کے پابند ہیں

جب تک ہم ہیں

یہ جو ٹوٹا تو بکھر جائیں گے سارے منظر

تیرگی زار کو سورج ہے فنا کی تعلیم

ہست اور نیست کے مابین اگر

خواب کا پل نہ رہے

کچھ نہ رہے

وقت سے کون کہے

یار ذرا آہستہ

اور پانچ ماہ بعد اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی صحرا میں ہے جہاں دور دور تک کوئی ایسا نہیں ہے جس کی آنکھوں میں اس کے لیے رحم ہو۔

''ان چیزوں کا کیا ہے۔ نبیل بھی تو چلا گیا ہے پھر یہ تو بے جان چیزیں ہیں۔'' وہ خود کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی مگر سمجھانا آسان نہیں تھا۔ اسے روپے کی پروا نہیں تھی۔ اسے سوتے لے زیور کی بھی فکر نہیں تھی۔ جو اس نے شادی پر خریدا تھا۔ مگر وہ انگوٹھی جو نبیل نے اسے شادی سے پہلے پہنائی تھی شادی پر منہ دکھائی میں دیا جانے والا ڈائمنڈ کا سیٹ اور وہ چھوٹی موٹی جیولری جو شادی کے بعد مختلف موقعوں پر نبیل نے اسے دی تھی۔ وہ سب اسے رلا رہی تھیں۔ اس ایک شخص کے نہ ہونے سے کتنا کچھ بدل گیا ہے۔ یہ اسے آہستہ آہستہ سمجھ میں آ رہا تھا۔ مگر یہ تو صرف ابتدا تھی۔

اگلے روز سہ پہر کو ممی نے اسے نیچے بلوایا تھا۔ سیڑھیاں اترتے ہی اس نے ایک صوفہ پر بیٹھی ہوئی خالہ کو دیکھا تھا۔ دوسرے صوفہ پر تنے ہوئے چہرے کے ساتھ اس نے ممی کو بیٹھے دیکھا تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ خالہ کے قریب آئی تھی۔ اس نے ابھی خالہ کو سلام کیا ہی تھا کہ ممی نے کہا۔

''میں نے تمہاری خالہ کو اس لیے بلایا ہے کہ وہ تمہیں لے جائیں۔ تم جاؤ اور اپنا سامان پیک کر لو۔''

اسے لگا تھا کسی نے اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی وہ شاک کے عالم میں ممی کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ جن کی آنکھوں میں بے پناہ سرد مہری تھی۔ ''میرا منہ مت دیکھو، جاؤ۔'' بے حد سخت لہجے میں اس سے کہا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی جس لمحے سے وہ خوفزدہ تھی وہ آ گیا تھا۔

''ممی پلیز، مجھے اس گھر سے نہ نکالیں۔'' خود پر ضبط کرتے ہوئے کپکپاتی آواز میں اس نے کہا تھا۔

ممی اٹھ کر کھڑی ہوئی تھیں ''مجھے ممی مت کہو۔ تمہارا اور میرا اتنا رشتہ بھی نہیں ہے جتنا اس گھر میں کام کرنے والے نوکروں کا میرے ساتھ ہے۔ تمہیں جو لایا تھا جب وہی نہیں رہا تو پھر تمہارا یہاں کیا کام۔'' ان کا لہجہ تلخ تھا۔

''ٹھیک ہے۔ نبیل زندہ نہیں رہا اور آپ کا میرے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے مگر نبیل کے بچے کے ساتھ......''

ممی نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ''نبیل کا کوئی بچہ نہیں ہے اور کسی ہونے والے بچے سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس لیے تم مجھے رشتے یاد دلانے کی کوشش نہ کرو۔ ہماری فیملی کو ایسے بچوں کی ضرورت نہیں ہے۔''

وہ یہ کہہ کر وہاں سے چلی گئی تھیں۔ وہ بے بسی کے عالم میں انہیں جاتا دیکھتی رہی۔ ''تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اوپر جاؤ اور اپنی ساری چیزیں لے آؤ، کچھ چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

خالہ نے اسے تسلی دی تھی اور اس نے تشکر آمیز نظروں سے انہیں دیکھا تھا پھر وہ اوپر چلی آئی تھی۔ اس کے پاس اتنے کپڑے اور دوسرے لوازمات تھے کہ ان سب کو لے جانے کے لیے کم از کم ایک درجن بیگز کی ضرورت تھی۔ لیکن اسے ان چیزوں کو لے جانے کی خواہش نہیں تھی، ان سب چیزوں کی ضرورت اسے نبیل کی زندگی میں تھی۔ اب اسے کس کے لیے بناؤ سنگھار کرنا تھا۔ برستی آنکھوں کے ساتھ ایک بیگ میں اس نے اپنے چند سادہ جوڑے اور دوسری چیزیں رکھیں اور ایک آخری نظر اس کمرے پر ڈال کر باہر نکل آئی۔ خالہ نے اسے ایک بیگ کے ساتھ آتے دیکھ کر اعتراض کیا تھا۔

''خالہ! میرے پاس اور کوئی بیگ نہیں ہے جس میں باقی کپڑے لے آؤں اور اگر میں ممی سے بیگ مانگوں گی تو وہ کبھی نہیں دیں گی۔

اس لیے جھگڑا کرنے کا فائدہ نہیں ہے۔'' خالہ نے کچھ پس و پیش کی تھی مگر پھر بادل نخواستہ وہ چل پڑی تھیں۔

پچھلے کئی سالوں سے وہ خالہ کے گھر رہتی رہی تھی وہ گھر اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ مگر اس بار وہاں جاتے ہوئے اسے جتنا برا لگا تھا کبھی پہلے نہیں لگا۔ گھر آنے کے بعد خالہ کافی دیر تک اس کے سسرال والوں کے خلاف بولتی رہی تھیں پھر انھوں نے اس سے کہا تھا۔

''رومیصہ! تم اپنا زیور اور فلیٹ کی رجسٹری مجھے دے دینا میں کل صبح بینک میں رکھوا دوں گی۔ تمھیں پتا ہے آج کل زمانہ کتنا خراب ہے۔''

''خالہ! میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ سب چیزیں ممی نے کل لے لی تھیں۔''

اس نے دھیمے لہجے میں ان سے کہا تھا اور چند لمحوں میں خالہ کا ہمدردانہ رویہ بدل چکا تھا۔ وہ یک دم طیش میں آ گئی تھیں اور جو ان کے منہ میں آیا انھوں نے اسے کہہ ڈالا۔ وہ سر جھکائے سب کچھ سنتی رہی، اس کے علاوہ اور کیا کر سکتی تھی۔ لیکن بہرحال یہ اندازہ اسے ہو گیا تھا کہ خالہ اسے نہیں لائی تھیں۔ اپنے زعم میں سونے کی چڑیا لے کر آئی تھیں۔

سکندر علی کو قطعاً علم نہیں تھا کہ فاخرہ رومیصہ کو گھر سے نکال چکی ہیں۔ نہ انھوں نے ان سے مشورہ لیا تھا نہ بتانے کی زحمت کی تھی۔ اس رات حسب معمول سب گھر والے کھانے کی میز پر اکٹھے تھے۔ ذیشان بھی ویک اینڈ پر گھر آیا ہوا تھا، جب کھانا کھاتے کھاتے اچانک سکندر علی نے کھانا سرو کرتے ہوئے ملازم سے پوچھا۔

''رومیصہ بی بی! کھانا کھا چکی ہیں؟'' نبیل کی موت کے بعد سے رومیصہ اپنے کمرے میں ہی کھانا کھایا کرتی تھی۔ اور سکندر علی کے اصرار کے باوجود وہ کھانے کی میز پر آنے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔ ملازم نے کچھ حیرانی سے انھیں دیکھا تھا۔ شاید اسے ان کی لاعلمی پر حیرت ہوئی تھی لیکن وہ خاموش رہا۔ اس سے پہلے کہ سکندر علی دوبارہ سوال کرتے۔ فاخرہ نے ملازم کو جانے کا اشارہ کیا تھا۔

''اسے میں نے آج بھیج دیا ہے۔'' بے حد اطمینان سے انھوں نے سلاد کھاتے ہوئے کہا تھا۔ سکندر علی کا پانی کے گلاس کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا۔ ذیشان نے بھی حیرت سے ماں کو دیکھا تھا۔ باقی لوگ اطمینان سے کھانا کھاتے رہے۔ ان کے لیے یہ خبر نئی نہیں تھی۔

''کہاں بھیج دیا ہے؟'' سکندر علی کچھ نہیں سمجھے تھے۔

''جہاں سے وہ آئی تھی اور جہاں اسے چلے جانا چاہیے تھا۔'' بے حد سرد مہری سے جواب دیا گیا تھا۔

''پاپا! کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر آج میں مر جاؤں تو آپ لوگ تو مجھے دفن کرنے سے بھی پہلے رومیصہ کو دھکے دے کر اس گھر سے نکال دیں گے۔ آپ لوگ تو ایک بار بھی نہیں سوچیں گے کہ میں نے اس سے کتنی محبت کی تھی۔ آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی اس پر ترس نہیں آئے گا۔''

سکندر علی کو لگا تھا کسی نے ان کا دل مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ نبیل کی آواز ان کے کانوں میں گونج رہی تھی اور کچھ یہی حال ذیشان کا تھا۔

''ممی! آپ نے کس سے پوچھ کر بھابھی کو گھر سے نکالا ہے؟'' بے حد تلخ آواز میں ذیشان نے فاخرہ سے پوچھا تھا۔

''ذیشان! تمھیں اس بارے میں بات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' فاخرہ نے اسے بری طرح

جھڑک دیا تھا۔

''میرا تعلق تو ہے نا اور یہی سوال میں تم سے پوچھتا ہوں۔ تم اسے یہاں سے نکالنے والی کون ہو؟'' اس بار سکندر علی نے تیز آواز میں کہا تھا۔

''یہ میرا گھر ہے مجھے حق ہے کہ میں رومیصہ جیسے لوگوں کو یہاں نہ رہنے دوں۔''

''ہاں، یہ تمہارا گھر ہے مگر یہ صرف تمہارا گھر نہیں ہے۔ یہ نبیل کا بھی گھر ہے اور رومیصہ نبیل کی بیوی ہے۔'' سکندر علی بے تحاشہ غصے میں تھے۔

''وہ نبیل کی بیوی تھی اس کے مرنے کے بعد......'' فاخرہ کے لہجے میں ابھی بھی پہلے والی سرد مہری تھی۔ مگر سکندر علی نے ان کی بات مکمل نہیں ہونے دی۔

''کل کو اگر میں مر جاؤں تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ میری اولاد تمہیں اس گھر سے نکال دے؟'' انھوں نے تیکھے لہجے میں فاخرہ سے پوچھا تھا جو ان کی بات پر بھڑک گئی تھیں۔

''تم مجھے رومیصہ کے برابر لانے کی کوشش مت کرو۔''

''میں تم سے مزید بحث نہیں چاہتا۔ صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ میں رومیصہ کو واپس لا رہا ہوں۔'' سکندر علی اپنی کرسی سے اٹھ گئے تھے۔

''تم اسے یہاں نہیں لا سکتے۔ میں یہ کبھی نہیں ہونے دوں گی۔''

''فاخرہ! یہ گھر میرے روپے سے بنا ہے اور میرے نام ہے رومیصہ کو بھی یہاں رہنے کا پورا حق ہے اور اگر وہ یہاں نہیں رہ سکتی تو پھر کوئی بھی نہیں رہ سکتا۔'' وہ اپنی کرسی سے کھڑے ہو گئے تھے۔ سب لوگ ہاتھ روکے انھیں دیکھ رہے تھے۔

''ذیشان! تم میرے ساتھ آؤ۔'' انھوں نے ذیشان سے کہا تھا اور وہ بڑی فرمانبرداری سے اپنی کرسی سے اٹھنے لگا تھا۔

''سکندر! تم کیا کرنے لگے ہو؟'' فاخرہ نے اس سوال کا جواب جانتے ہوئے بھی پوچھنا ضروری سمجھا تھا۔

''میں اسے ابھی اور اسی وقت واپس لانے جا رہا ہوں۔''

وہ یہ کہہ کر باہر کی طرف بڑھ گئے تھے۔ ذیشان ان کے پیچھے تھا، ان دونوں نے اپنے پیچھے فاخرہ کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنی تھیں مگر اس کی پروا کیے بغیر وہ باہر آ گئے۔

رات نو بجے وہ خالہ کے گھر اسے لینے گئے تھے اور خالہ جو یہ جاننے کے بعد کہ وہ بالکل خالی ہاتھ ہے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے طریقے سوچ رہی تھیں۔ انھوں نے ایک بار بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگر وہ ایسا کرتیں بھی تو بھی وہ کبھی وہاں نہ رکتی۔ ان چند گھنٹوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب اس گھر میں اس کے لیے گنجائش نہیں رہی۔ گھر میں تو شاید نکل آتی مگر دلوں میں کبھی نہیں۔ وہ سکندر علی اور ذیشان کے ساتھ واپس آ گئی۔ سکندر علی سارا راستہ اسے دلاسہ دیتے رہے تھے۔ اور اسے اس وقت اسی چیز کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ ذیشان خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا تھا۔ اسے رومیصہ کی حالت پر افسوس ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا نبیل نے اس سے بے تحاشا محبت کی تھی بلکہ شاید محبت کی ہی اس سے تھی اور اب وہ یوں در بدر ہو گئی تھی۔

''اور اگر کہیں یہ نبیل کی زندگی میں ہوا ہوتا تو وہ گھر میں قیامت برپا کر دیتا اور سارا فرق نبیل کی زندگی کا ہی تو ہے اگر وہ ہوتا تو یہ سب کبھی نہ ہوتا۔''

وہ گاڑی چلاتے ہوئے افسردہ ہو گیا تھا۔ واپسی میں نیچے ہال میں کوئی نہیں تھا۔ شاید وہ اب کوئی ہنگامہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے اور حیرت کی بات تو یہ تھی کہ فاخرہ بھی وہاں نہیں تھیں ورنہ سکندر علی کو توقع تھی کہ وہ رومیصہ اور ان کے زبردست استقبال کے لیے ضرور وہاں موجود ہوں گی، بہر حال ان کی عدم موجودگی پر انھوں نے شکر ادا کیا تھا رومیصہ کو انھوں نے اوپر بھیج دیا تھا۔

''ذیشان! تم ذرا اپنی ماں کو سمجھاؤ۔ تمہاری بات وہ سن لیتی ہے، تم ہی اس کا دماغ ٹھیک کرنے کی کوشش کرو۔'' انھوں نے ذیشان سے کہا تھا اور وہ ترحم بھری نظروں سے انھیں دیکھنے لگا تھا، جو بے حد تھکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ باپ کے کوئی زیادہ قریب نہیں تھا اور نہ ہی ان دونوں کے درمیان انڈر اسٹینڈنگ نام کی کوئی چیز تھی بلکہ کچھ عرصہ پہلے تک تو ذیشان کی جاب کی وجہ سے دونوں کے درمیان خاصا تناؤ تھا مگر اب نبیل کی موت نے یک دم دونوں کو قریب کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا نبیل ان کا لاڈلا تھا۔ اپنی غلط حرکتوں کے باوجود وہ ہمیشہ ان کا چہیتا ہی رہا تھا۔ شاید کسی دوسرے بیٹے کی موت کا ان پر وہ اثر نہ ہوتا جو نبیل کی موت کا ہوا تھا۔ وہ خود بھی نبیل کے عشق میں گرفتار رہا تھا۔ دونوں کی کیفیات ایک جیسی تھیں، دونوں نے اسے کھویا تھا جسے وہ کبھی کھونا نہیں چاہتے تھے۔

''میں بات کرتا ہوں ان سے۔ آپ پریشان نہ ہوں وہ بھابھی کو قبول کر ہی لیں گی۔''

اس نے انھیں تسلی دینے کی کوشش کی تھی مگر سکندر علی فاخرہ کو اس سے زیادہ جانتے تھے۔ وہ کتنی ضدی اور منتقم مزاج عورت تھیں۔ یہ ان سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ مگر پھر بھی انھوں نے سر ہلا دیا تھا۔

ذیشان ان کے ساتھ ہی ان کے بیڈ روم میں چلا گیا تھا اور وہاں فاخرہ نے ان دونوں کو دیکھتے ہی چلانا شروع کر دیا تھا۔ سکندر علی بالکل چپ رہے تھے اور ذیشان نے ماں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ مگر فاخرہ پر تو جیسے جنون سوار تھا۔ انھوں نے ذیشان کو بھی بے بھاؤ کی سنائی تھیں۔ انھیں اس کے باپ کے ساتھ جانے پر اعتراض تھا۔ انھیں منانے اور سمجھانے کی اس کی ساری کوششیں بری طرح ناکام رہی تھیں۔ وہ کچھ سننے پر تیار ہی نہیں تھیں۔ اسے ممی کی کوئی خاص پروا نہیں تھی بالکل ویسے ہی جیسے ذیشان کو باپ کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ نبیل کو بحث کی بھی عادت نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ اپنی بات منوایا کرتا تھا، لیکن بحث میں الجھے بغیر وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا۔

''مجھے کوئی قائل نہیں کر سکتا پھر میں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کیوں کروں۔ میں تو وہی کرتا ہوں جو کرنے کا فیصلہ کرتا ہوں۔''

نبیل کے ساتھ ممی کا اکثر کسی نہ کسی بات پر جھگڑا ہو جاتا تھا۔ وہ اس کی شادی اپنی بھانجی سے کرنا چاہتی تھیں مگر نبیل کو شادی سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی اور جب دلچسپی ہوئی تو وہ ایک ایسی لڑکی بیاہ لایا جو ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ مگر وہ اسے مجبور نہیں کر سکتی تھیں ہاں مگر اپنا غصہ رومیصہ پر ضرور نکال سکتی تھیں اور اب وہ یہی کر رہی تھیں۔ نافرمان بیٹے کی بیوی کتنی بھی اچھی کیوں نہ ہو۔ وہ ممی جیسی عورتوں کو بری ہی لگتی ہے۔ جب تک نبیل زندہ تھا وہ اسے گھر میں رکھنے پر مجبور تھیں مگر اب جب وہ نہیں رہا تھا تب بھی وہ اسے گھر پر رکھنے پر مجبور کر دی گئی تھیں مگر انھوں نے بھی طے کر لیا تھا کہ وہ اس گھر میں اس کا جینا دوبھر کر دیں گی اور انھوں نے یہی کیا تھا۔

یک دم ہی انھوں نے گھر کا پورا کام اس کے سر تھوپ دیا تھا۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ ماں بننے والی تھی اور ابھی جس حادثے سے گزری تھی اس کے بعد اسے مکمل ذہنی اور جسمانی آرام و سکون چاہیے تھا۔ رومیصہ نے کسی کام پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اب کون سا نبیل تھا جو اس کی مدد کے لیے آتا۔ اب تو اسے اس گھر میں اپنے لیے جگہ بنانی تھی۔ دلوں میں نہ سہی مگر گھر میں تو ہو۔ بڑے صبر سے وہ سارا دن کام میں لگی رہتی۔

پہلے جب ممی اسے کام کے لیے کہا کرتی تھیں تو تب وہ صرف کام کی نگرانی کیا کرتی تھی مگر اب وہ خود نوکروں کے ساتھ سارے کام کروایا کرتی تھی۔ صبح سے رات تک کام میں جتے رہنے کے باوجود ممی خوش نہیں ہوتی تھیں۔ وہ معمولی بات پر نوکروں کے سامنے اسے ذلیل کر دیتیں۔ مگر اسے ان سے کوئی گلہ، کوئی شکوہ نہیں تھا۔ اس کے لیے بس یہی کافی تھا کہ وہ اسی گھر میں ہے جہاں نبیل اسے لایا تھا اور نبیل کا بچہ بھی اپنے خاندان میں ہی پلے گا۔

رات کو گیارہ بجے وہ فارغ ہو کر اوپر اپنے کمرے میں آتی اور اتنی تھکی ہوئی ہوتی کہ اس کے پاس اتنی فرصت بھی نہیں ہوتی تھی کہ وہ نبیل کے بارے میں سوچ پائے۔ کبھی کبھی جب اسے نیند نہ آتی تو وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا بیٹھتی اور اپنا وجود اسے اتنا اجنبی لگتا کہ وہ اسے پہچاننے کی جستجو کرنے لگتی۔ اس کے چہرے پر کچھ بھی تو پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ وہ آنکھیں جن پر نبیل بہت ملائمت سے گھنٹوں انگلیاں پھیرتا رہتا تھا۔ اب سیاہ حلقوں کی قید میں تھیں۔ دودھیا رنگت کملا چکی تھی۔ کئی کئی دن بالوں میں کنگھی کیے بغیر گزر جاتے اور اسے احساس بھی نہ ہوتا اور کبھی جب اسے خیال آتا تو وہ ہاتھ سے ہی بال سنوار لیتی۔ ایک عجیب سی بے نیازی آ گئی تھی اس میں۔ ماضی، حال، مستقبل تینوں میں اسے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ تینوں اس کے لیے ایک جیسے تکلیف دہ تھے۔

''ممی! میں ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤں۔'' اس دن اس نے بہت جھجکتے اور ڈرتے ڈرتے فاخرہ سے پوچھا تھا۔ نبیل کی موت کے بعد سے وہ ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے نہیں گئی تھی۔ مگر اب کچھ دنوں سے اس کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی تھی اور ڈاکٹر بھی اسے دو تین دفعہ چیک اپ کے لیے فون کر چکی تھی۔ ممی کچھ دیر تک بہت عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھیں۔

''کیا کرو گی اس بچے کو رومیصہ؟ کیا کرو گی۔ کیسے پالو گی اسے۔ اس خاندان کا نام تو اسے نہیں ملے گا۔ کیونکہ آج نہیں تو کل تمھیں یہاں سے جانا ہی ہے، پھر کیوں اپنے پیروں میں زنجیر ڈال رہی ہو۔ تم ابارشن کروالو۔ ایک دو سال بعد آرام سے کہیں بھی شادی کر سکتی ہو۔ مگر بچے کے ساتھ تمھیں کوئی قبول نہیں کرے گا۔ اس سے اپنی جان چھڑالو۔ یہ تمھارے حق میں بہتر ہوگا۔'' ممی نے پہلی بار کچھ نرم لہجے میں اس سے کہا تھا۔ وہ گم صم سی ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔

''ممی! مجھے اب کبھی شادی نہیں کرنی ہے۔ کبھی بھی نہیں۔ مجھے بس اپنے بچے کے ساتھ رہنا ہے آپ خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں میرے پاس اس بچے کے علاوہ اور ہے کیا۔ اسے کیسے ماردوں میں۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''بہت بڑی ایکٹریس ہوتی ہو تم مڈل کلاس لڑکیاں۔ بڑے ہتھیار ہوتے ہیں تمھارے پاس۔ ساری زندگی چہرے پر ماسک لگائے گزار دیتی ہو۔ پارسائی کا ماسک، شرافت کا ماسک، وفاداری کا ماسک، قربانی کا ماسک حالانکہ ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوتا تمھارے پاس اور رومیصہ عمر! تم بھی مڈل کلاس کی لڑکی ہو۔ کیا سوچتی ہو کہ ہر کوئی نبیل سکندر ہوتا ہے جو اس ماسک کے پار نہ دیکھ پائے، نہیں ایسا نہیں ہے۔ نبیل بے وقوف تھا۔ میں نہیں ہوں۔ اگر تمہاری تمنا صرف نبیل کے بچے کے ساتھ رہنے کی ہے تو اس گھر سے چلی جاؤ۔ کہیں بھی چلی جاؤ۔ بس دوبارہ کبھی ہماری زندگی میں نہ آنا۔ میں تمھیں اتنا روپیہ دے دوں گی کہ تمھارے سر چھت اور دو وقت کی روٹی آجائے۔ بس تم یہ گھر چھوڑ دو؟

''ممی! آپ مجھے یہاں رہنے دیں۔ میں کبھی آپ سے کوئی مطالبہ نہیں کروں گی نہ ہی آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہوگی مگر مجھے یہاں رہنے دیں۔''

''اگر تم یہاں رہنا چاہتی ہو تو پھر میری بات مان لو۔ ابارشن کروالو۔ تمھارے لیے اس گھر میں جگہ نکل سکتی ہے مگر تمھارے بچے کے لیے نہیں۔''

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، اسے اپنے پیچھے ہلکی سی آہٹ سنائی دی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تھا اس سے چند قدموں کے فاصلے پر دروازے کے قریب ذیشان کھڑا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنے بھیگے ہوئے چہرے کو چھپاتے ہوئے کمرے سے چلی گئی۔ فاخرہ کچھ گھبرا گئی تھیں انھیں ایک دم ذیشان کے وہاں آجانے کی توقع نہیں تھی اور ذیشان کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ ان کی باتیں سن چکا تھا۔ رومیصہ کے باہر نکلتے ہی اس نے تیز آواز میں ماں سے کہا تھا۔

''آپ جانتی ہیں آپ بھابھی سے کیا کہہ رہی تھیں؟''

''ذیشان! تم اس معاملے میں مت پڑو۔ اس مسئلے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' انھوں نے اسے جھڑک کر چپ کروانے کی کوشش کی تھی مگر ذیشان پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''اگر میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے تو آپ کا بھی نہیں ہے۔ ممی! مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آپ نبیل کے بچے کو مارنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ آپ یہ کیسے کر سکتی ہیں۔ بھابھی سے آپ کا رشتہ نہ سہی مگر نبیل کے بچے سے تو ہے۔ مگر آپ اسے پیدا ہونے سے پہلے ہی مار دینا چاہتی ہیں۔ آپ نبیل کا نام، اس کی نسل ہی ختم کر دینا چاہتی ہیں۔ ممی! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب میں نے آپ کی زبان سے سنا ہے۔''

اس کی آواز کی تیزی ختم ہو گئی تھی۔ لہجے میں بے یقینی تھی۔

''میں تمہاری طرح جذباتی نہیں ہوں۔ عقل سے کام لیتی ہوں۔ وہ نبیل کا بچہ نہیں رومیصہ کا بچہ ہوگا اور وہ وہی کرے گا جو اس کی ماں چاہے گی۔ کل کو وہ نبیل کا حصہ لینے اٹھ کھڑا ہوگا پھر تم لوگ ہی روؤ گے۔''

فاخرہ نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔

''ممی! اگر جائیداد میں سے حصہ چاہے گا تو ٹھیک ہے دے دیں گے آفٹر آل یہ اس کا حق ہوگا۔ مگر آپ کو اس کی جان لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور آپ دوبارہ بھابھی سے ایسی بات نہیں کریں گے۔'' ذیشان نے فاخرہ کو سخت لہجے میں روکا تھا۔

''تم بہت بے وقوف ہو ذیشان! بے حد احمق ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آپ کے بقول بے وقوف اور احمق ہوں تو مجھے بے وقوف ہی رہنے دیں۔ مجھے ایسی عقل نہیں چاہیے جو مجھے خون کے رشتے بھلا دے۔''

وہ یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا تھا اور اس نے صرف ماں کو ہی خبردار نہیں کیا تھا بلکہ اسی رات اس نے سکندر علی کو بھی فاخرہ کے خیالات کے بارے میں واقف کر دیا تھا۔ فاخرہ اور سکندر علی کے درمیان اس رات شدید جھڑپ ہوئی اور وجہ وہ بچہ تھا جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ بحث کا نتیجہ صرف یہ نکلا تھا کہ فاخرہ کے دل میں رومیصہ کے خلاف نفرت کچھ اور زیادہ ہو گئی تھی۔ ہر صورت میں اس سے جان چھڑانا چاہتی تھیں اور اب یہ کام انہیں مشکل نظر آ رہا تھا۔ اس جھگڑے سے جہاں فاخرہ کی نفرت میں اضافہ ہو گیا تھا وہاں سکندر علی کی توجہ اور محبت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ انھوں نے اگلے دن رومیصہ کو کچھ روپے دیے تھے اور اس سے کہا تھا کہ اسے جب بھی کہیں جانا ہو وہ ان کے ڈرائیور سے کہہ دیا کرے اور وہ اسے لے جایا کرے گا اور اس سلسلے میں اسے ممی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

پھر یونہی ہونے لگا تھا وہ ہر ہفتے ڈرائیور کے ساتھ ہاسپٹل چلی جاتی۔ نبیل نے پتا نہیں کیا سوچا تھا۔ امریکہ جانے سے پہلے وہ ڈیلوری تک کے لیے ہاسپٹل میں ایک خاصی بڑی رقم جمع کروا چکا تھا۔ اس کی موت کے بعد جب وہ پہلی بار ہاسپٹل چیک اپ کروانے کے لیے گئی تو چیک اپ کے بعد اس نے واپس آ کر سیکرٹری کو کچھ روپے دینے کی کوشش کی تھی جو سکندر علی نے اسے دیے تھے۔

''ایک منٹ میڈم میں ذرا پہلے آپ کا اکاؤنٹ چیک کر لوں پھر آپ اس بل کو پے کیجئے گا۔'' سیکرٹری نے کمپیوٹر کے کچھ Keys دباتے ہوئے کہا تھا۔ وہ سر جھکائے دیکھتی رہی۔

''رومیصہ سکندر وائف آف نبیل سکندر آپ کا نمبر اناسی ہے نا'' وہ لڑکی کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے تصدیقی لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ اس نے

اثبات میں سر ہلا دیا۔

''نہیں میڈم! آپ کو بل پے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کے ہسبینڈ ڈلیوری تک کے ڈیوز پہلے ہی پے کر چکے ہیں۔''

اس لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ رومیصہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ کاؤنٹر پر رکھے ہوئے روپے اٹھا کر وہ باہر آ گئی تھی۔ پارکنگ کی طرف جانے کے بجائے وہ لان میں آ کر بیٹھ گئی تھی اور پتا نہیں کتنی دیر وہ وہیں بیٹھی رہی۔ یہ ایک پرائیویٹ ہاسپٹل تھا، ایک درخت کے نیچے لکڑی کے بینچ کی پشت سے ٹیک لگائے وہ ہاسپٹل کے اندر جاتے اور باہر آتے ہوئے جوڑوں کو دیکھتی رہی۔ چند ماہ پہلے وہ بھی تو نبیل کے ساتھ ہی آیا کرتی تھی مسکراتے جگمگاتے چہرے کے ساتھ، اپنے بچے کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے، مستقبل کی پلاننگ کرتے ہوئے۔

''یار! بندے کو ہر کام سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ زندگی کو اچھے طریقے سے گزارنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ میں اپنے ہر آنے والے سال کو پہلے ہی پلان کر لیتا ہوں۔ بہت آسانی ہو جاتی ہے اس سے اور صرف خود کو ہی نہیں اپنے اردگرد کے لوگوں کو بھی۔''

''لیکن میرے لیے اب کیا آسانی ہوگی؟'' نبیل کی بات اسے یاد آئی اور اس کے گال بھیگنے لگے تھے۔ ایک بار پھر اسے بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ کبھی واپس اس گھر میں نہ جائے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا اس کی زندگی سے یہ چھ سات ماہ غائب ہو جائیں۔ ذہ کبھی کوئی نبیل سکندر اس کی زندگی میں آیا ہو۔ نہ وہ کبھی جاب کے لیے اس آفس میں گئی ہو بس وہ آنکھیں بند کر کے کھولے اور وہ دوبارہ وہیں کھڑی ہو۔ جہاں وہ جاب کرنے سے پہلے کھڑی تھی مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ آنکھیں بند کرنے سے منظر غائب ہو جاتا ہے زندگی نہیں، نبیل نہیں، بچہ نہیں۔ وہ تھکے قدموں کے ساتھ اٹھ کر پارکنگ کی طرف چلی گئی۔

گھر میں سب کچھ ویسے ہی تھا وہی ممی کی تیکھی نظریں، زہریلی باتیں باقی سب کی بے رخی، بے پروائی۔

''پتا نہیں وہ لوگ کیسے ہوتے ہیں جو دوسروں کو بدل لیتے ہیں۔ میں تو کچھ بھی بدل نہیں پا رہی۔''

وہ اکثر سوچتی۔ اب نبیل کی طرح اسے بیٹی کی خواہش بھی نہیں رہی تھی جو واحد دعا وہ ان دنوں خدا سے کرتی رہتی تھی، وہ بیٹے کی تھی۔ بیٹی کے سر پر اگر باپ نہ ہو تو اس کا کیا حال ہوتا ہے یہ وہ دیکھ چکی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایک بار پھر اس کی کہانی اس کی بیٹی کے ساتھ دہرائی جائے۔

''بیٹی کو میں کیا دے سکتی ہوں۔ کچھ بھی نہیں۔ بیٹے کو کچھ نہ بھی ملا تب بھی وہ اپنے لیے کچھ نہ کچھ کر ہی لے گا۔''

اس کے ذہن میں پتا نہیں کیا کیا آتا رہتا۔ کبھی کبھی اسے یہ سوچ کر بھی وحشت ہونے لگتی کہ اگر بیٹی پیدا ہو گئی تو کیا ہوگا وہ کیا کرے گی۔

وہ رات کو جاگتی رہتی کئی کئی گھنٹے ٹیرس پر بے مقصد چکر لگاتی رہتی۔

''اللہ مجھے اب کوئی صدمہ نہ پہنچانا۔ میری دعا قبول کر لینا۔ آج تک تم مجھے چیزوں سے محروم کرتے آئے ہو مگر کم از کم اب تو ایک ایسی چیز مجھے دے دینا جو میں چاہتی ہوں جو میری خواہش ہے۔''

وہ دعا مانگنے پر آتی تو بیٹے کے لیے کئی کئی گھنٹے دعائیں مانگتی رہتی۔

مگر کوئی دعا قبول نہیں ہوئی تھی۔ وہ ڈاکٹر کے منہ سے بیٹی کی پیدائش کی خبر سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

''خدا کیوں میرے ساتھ یہ سب کچھ کر رہا ہے آخر کیوں۔'' وہ بے اختیار کہتی جاتی۔ ڈاکٹر نے اسے بمشکل چپ کروایا تھا اور پھر اس کے اعصاب کو پرسکون کرنے کے لیے خواب آور انجکشن دے دیا تھا۔ دوبارہ ہوش میں آنے پر اس نے خود کو ایک کمرے میں اکیلا پایا تھا۔ آنکھیں کھولے چت لیٹی ہوئی وہ کتنی ہی دیر چھت کو دیکھتی رہی۔ انیس سال کی عمر میں اس کی شادی ہوگئی تھی۔ انیس سال کی عمر میں وہ بیوہ ہوگئی تھی اور اسی عمر میں وہ ایک بچی کی ماں بن گئی تھی۔ بچپن گزار کر اس نے یک دم بڑھاپے میں قدم رکھ دیا تھا۔ جوانی تو شاید کہیں آئی ہی نہیں تھی۔ اس کے دل میں اپنی بچی کو دیکھنے کی خواہش پیدا نہیں ہو رہی تھی۔

''دیکھنا یار! میری بیٹی دنیا کی Most wanted بچی ہوگی۔ جتنا انتظار مجھے اس کا ہے شاید دنیا کے اور کسی باپ کو اپنی اولاد کا نہ ہو۔'' ایک بار پھر وہی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا۔

''اور اگر نبیل ہوتا تو کیا میں اس وقت یہاں یوں اکیلی پڑی ہوتی۔ کیا اس کمرے میں اتنی خاموشی ہوتی۔''

ایک سوچ اس کے دماغ میں لہرائی تھی۔ وہ ایک دن پہلے ہاسپٹل آئی تھی اور تب سے لے کر بچی کی پیدائش تک وہ وہاں اکیلی ہی تھی۔ کوئی اس کے ساتھ آیا تھا نہ اس کی خبر گیری کے لیے آیا تھا۔ شام کو نرس اس کی بچی کو لے کر اس کے پاس آئی تھی۔ بجھے ہوئے دل کے ساتھ اس نے کمزور و نحیف وجود کو دیکھا تھا جو اسے تھمایا گیا تھا۔ وہ اسے گود میں لیے بیٹھی رہی۔ ممتا جیسے کوئی جذبات اسے محسوس نہیں ہو رہے تھے۔ پتا نہیں دل اتنا بنجر کیوں تھا۔ وہ ننھا سا وجود اپنی آنکھوں کو بڑی جدوجہد سے پورا کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ بے دماغی کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اس کے نقوش بہت شناسا سا، بہت مانوس سے تھے، وہ نبیل کا چہرہ تھا۔ بہت دیر بعد اسے محسوس ہوا تھا اور پتا نہیں کچھ بے اختیار سی ہو کر وہ اس کے چہرے پر اپنی انگلیاں پھیرنے لگی تھی۔ ہونٹ، ناک، آنکھیں، ماتھا، گال، وہ نرمی سے ہر چیز کو چھوتی گئی پھر پانی کے قطرے اس ننھے وجود کے چہرے پر گرنے لگے تھے۔ پہلے ایک پھر دو پھر تین اور پھر جیسے جھڑی لگ گئی تھی۔

''میری بیٹی دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی ہوگی۔ تم سے بھی زیادہ خوبصورت ہوگی رومی! تم دیکھ لینا۔'' پھر کسی نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی تھی۔

''ہاں خوبصورت ہے۔ خوش قسمت نہیں۔ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ مجھ سے زیادہ بدقسمت ہے۔'' بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہ بڑبڑانے لگی تھی۔

اس شام سکندر علی بھی آئے تھے۔ بچی کو گود میں لیتے ہوئے ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔ ''بہت خوبصورت ہے، ہے نا رومیصہ؟''

انھوں نے آنسو چھپاتے ہوئے دل جوئی کرنے والے انداز میں رومیصہ سے پوچھا تھا۔ وہ خاموش انھیں دیکھتی رہی۔ سکندر علی نے کچھ روپے نکال کر بچی کے ہاتھ کے پاس رکھے تھے اور پھر اسے چوم کر رومیصہ کو تھما دیا۔ اس نے سر اٹھا کر انھیں دیکھا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی

آنکھ میں چھپے ہوئے آنسو دیکھ لیے تھے۔ سکندر علی نے اس کا سر تھپتھپایا تھا۔

''بیٹا! گھبراؤ مت۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' انھوں نے اسے تسلی دی۔ اس نے سر جھکا لیا تھا۔

تین دن بعد وہ گھر آ گئی تھی۔ سکندر علی کے علاوہ کوئی ہاسپٹل نہیں آتا رہا تھا۔ ذیشان کی پوسٹنگ شیخوپورہ میں تھی، اس لیے وہ بھی نہیں آیا تھا۔ اسے بچی کی پیدائش کا علم بھی نہیں تھا۔ پندرہ دن بعد وہ ویک اینڈ پر گھر آیا تھا تو اسے پتا چلا تھا اور تب وہ سیدھا رومیصہ کے پاس آیا تھا۔ کافی دیر تک بچی کو اٹھائے وہ رومیصہ کے کمرے میں بیٹھا رہا تھا۔ پھر وہ بچی کو کچھ روپے تھما کر افسردگی کے عالم میں کمرے سے باہر آ گیا تھا۔ نبیل کو بیٹی کی بے حد خواہش تھی اور یہ بات وہ بھی جانتا تھا اور اب یہ خواہش پوری ہو چکی تھی مگر نبیل نہیں تھا۔ نبیل کی موت کا زخم جیسے نئے سرے سے ہرا ہو گیا تھا۔

بچی کا نام اس نے ماہم رکھا تھا۔ یہ وہ نام تھا جو نبیل نے منتخب کیا اور رومیصہ نے اپنی بیٹی کو وہی نام دیا تھا۔ ماہم جسمانی طور پر بہت کمزور تھی اور یہ ایک قدرتی سی بات تھی۔ اس کی پیدائش سے پہلے جس حادثے کا سامنا رومیصہ کو کرنا پڑا تھا اور اس کے بعد نہ اس نے خوراک پر دھیان دیا تھا اور نہ ہی اپنی صحت کی اتنی پروا کی تھی اور ظاہر ہے ان سب چیزوں کا اثر ماہم پر ہی ہونا تھا۔ ماہم کی پیدائش کے بعد رفتہ رفتہ رومیصہ دوبارہ گھر گھر کے کاموں میں جت گئی تھی۔ کام کیے بغیر اس گھر سے دو وقت کا کھانا حاصل کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ فاخرہ کی نکتہ چینیوں اور طعنوں کا سلسلہ ایک بار پھر وہیں سے شروع ہو گیا تھا اور رومیصہ اب خود کو پہلے سے بھی زیادہ غیر محفوظ خیال کرتی تھی۔ خود کو محفوظ کرنے کے لیے جو واحد طریقہ اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ وہ کام کر کے فاخرہ کو خوش کرنا تھا اور یہ وہ کام تھا جو کوئی معجزہ ہی کروا سکتا تھا۔ وہ ان سے بے حد خائف رہتی تھی۔ جس قدر وہ ان کی خدمت کرتی، ان کے آگے پیچھے پھرتی، وہ اتنی ہی شیر ہوتی جا رہی تھیں۔ روز بروز ان کی زبان کے زہر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور وہ بالکل بے بس تھی، اس گھر میں کم از کم وہ اور اس کی بیٹی محفوظ تو تھے۔ اس گھر سے نکل کر وہ کیا کرتے۔ پھر مسئلہ دو وقت کے کھانے کا نہیں تھا۔ کل کو ماہم نے بڑا ہونا تھا۔ اسے تعلیم دلوانا تھی۔ اس کی شادی کرنا تھی اور یہ سب کام وہ خود کیسے کر سکتی تھی۔ اس کے پاس تو اتنی تعلیم بھی نہیں تھی کہ وہ کوئی موزوں جاب ہی کر کے اپنی بچی پال لیتی۔ اسی لیے وہ فاخرہ کی ساری باتیں بے حد صبر کے ساتھ سن لیتی تھی۔

''بیٹھو ذیشان۔'' سکندر علی نے ذیشان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

وہ اپنے اس غیر متوقع بلاوے پر حیران تھا۔ سکندر علی نے اسے شیخوپورہ سے ضروری کام کا کہہ کر بلایا تھا اور وہ اپنے سارے کام چھوڑ کر قدرے پریشانی کے عالم میں لاہور آیا تھا۔ سکندر علی نے فون پر اسے کام کی نوعیت نہیں بتائی تھی اور یہ پہلی بار تھا کہ سکندر علی نے اسے یوں بلوایا تھا۔ اور اب وہ سوالیہ نظروں سے انھیں دیکھتے ہوئے ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ سکندر علی بہت سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ اور پتا نہیں کیوں لیکن ذیشان کو ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس سے نظریں چرا رہے ہوں۔ اسٹڈی میں کچھ دیر تک عجیب سی خاموشی چھائی رہی تھی۔ پھر ایک گہری سانس لے کر سکندر علی نے اسے دیکھا تھا۔

''جو بات میں تم سے کہنے والا ہوں، اسے بہت سکون سے سننا، اس پر غور کرنا اور پھر مجھے اپنا ردعمل بتانا۔ کسی فوری ردعمل کا اظہار کرنے کی

ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں جو بات میں کرنے والا ہوں وہ معمولی بات نہیں ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس سے تمہاری زندگی متاثر ہوگی مگر پھر بھی ذیشان! میں چاہتا ہوں کہ تم رومیصہ سے شادی کرلو۔"

ذیشان کو لگا تھا۔ کسی نے اسے پہاڑ کی چوٹی سے دھکیل دیا تھا۔ سن سے اعصاب کے ساتھ وہ سکندر علی کا چہرہ دیکھتا رہ گیا تھا۔

"زندگی میں ہر کام ہم اپنے لیے کرتے ہیں کچھ کام دوسروں کے لیے بھی کرنا چاہیے۔ تم نبیل سے بہت محبت کرتے تھے۔ اگر کوئی رومیصہ اور ماہم کو تحفظ دے سکتا ہے تو وہ تم ہی ہو۔ تم اس بارے میں اچھی طرح سوچ لو پھر مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا۔"

وہ دھیمے لہجے میں اس سے کہتے گئے تھے اور آہستہ آہستہ وہ اس شاک سے باہر آ گیا تھا۔

"مجھے اس بارے میں کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میرا جواب سوچنے سے پہلے بھی انکار میں ہے اور سوچنے کے بعد بھی انکار میں ہی ہوگا۔ میں حیران ہوں کیا سوچ کر آپ نے مجھ سے ایسی بات کی ہے۔ نبیل بے شک مر گیا ہے مگر میرے لیے رومیصہ آج بھی اس کی بیوی ہے اور میں اسی حوالے سے اس کی عزت کرتا ہوں۔ اور وہ اور اس کی بچی دونوں اس گھر میں محفوظ ہیں اور کسی نئے رشتے کے بغیر وہ زیادہ خوش رہیں گے۔ مگر آپ پتا نہیں پاپا! آپ کیوں ایسی بات سوچ رہے ہیں؟ آپ کیوں ہر ایک کی زندگی میں ایک نیا طوفان لانا چاہتے ہیں۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ذیشان! تم جذباتی ہو رہے ہو۔" سکندر علی نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی اور اس نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

"ہاں میں جذباتی ہو رہا ہوں اور یہ معاملہ ہے ہی جذبات کا۔ آپ نے اس لڑکی کے بارے میں کیا سوچا ہے جو میری منکوحہ ہے۔ آپ نے میرے بارے میں کیا سوچا ہے جو ربیعہ سے محبت کرتا ہے۔ آپ نے رومیصہ کے بارے میں کیا سوچا ہے، جس کے شوہر کو مرے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا، آپ ہر فیصلہ خود کرتے ہیں۔ آپ ہر فیصلہ غلط کرتے ہیں۔" ذیشان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"میں نے تم سے ربیعہ کو طلاق دینے کا نہیں کہا نہ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے طلاق دو۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم رومیصہ سے نکاح کرلو۔ وہ یہیں رہے گی ہمارے پاس اس گھر میں۔ اور ربیعہ کو تم اپنے پاس رکھ سکتے ہو۔ جہاں بھی تم رہو۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم رومیصہ کو اپنا نام دے دو۔"

سکندر علی کا لہجہ اب پرسکون تھا۔

"پاپا! میں ربیعہ، ماہم اور رومیصہ تاش کے پتے نہیں ہیں جنہیں آپ اپنی مرضی سے Shuffle کر سکتے ہیں ہم انسان ہیں جیتے جاگتے انسان، جذبات اور احساسات والے انسان۔ رومیصہ کے لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ مجھے نبیل کی جگہ دے دے۔ میرے لیے کیسے ممکن ہے کہ میں اسے بھابھی سے بیوی بنالوں۔ ربیعہ اپنے شوہر کو کیوں کسی دوسرے کے ساتھ شیئر کرے گی۔ شاید آپ نے سوچا ہی نہیں ہے کہ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ نبیل کے مرنے سے صرف رومیصہ کا گھر تباہ ہوا تھا لیکن اب آپ میری اور ربیعہ کی زندگی کیوں برباد کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے تو ابھی اپنا گھر بنایا بھی نہیں۔"

"کتنے دعوے کرتے تھے تم نبیل سے محبت کے۔ اب اس کے لیے کچھ کرنے کا وقت آیا ہے تو تم میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ تم ایک قدم بھی آگے بڑھا سکو۔ دنیا میں تم واحد آدمی نہیں ہو جسے یہ قربانی دینے کا کہا گیا ہے۔ تم سے پہلے بھی بہت سے آدمی یہ قربانی دیتے رہے ہیں۔ تم کوئی

ایسا کام نہیں کرنے جا رہے جو تم سے پہلے کسی نے کیا ہی نہ ہو۔'' سکندر علی کا لہجہ ایک دم سخت ہو گیا تھا۔

''ان لوگوں کو قربانی کا شوق ہو گا۔ مجھے نہیں ہے۔ مجھے ایک زندگی ملی ہے کوئی دس بارہ نہیں میں اسے اپنے لیے اور صرف اپنے لیے گزارنا چاہتا ہوں۔ دوسروں کے لیے سولی پر چڑھنے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ آپ کو شوق ہے ہر نارمل چیز کو ابنارمل کرنے کا آپ دوسروں کی زندگی پر مکمل اختیار چاہتے ہیں۔''

''تم بکواس مت کرو۔'' سکندر علی کو اس کی بات سے زیادہ اس کے لہجے پر طیش آیا تھا۔

''میں بکواس نہیں کر رہا پاپا۔ میری خوشیاں چھین کر آپ کو خوشی ہوتی ہے۔ اشعر، احمر، فراز، ولیدان میں سے کسی کو کہیں وہ رومیصہ سے شادی کر لیں آخر میں ہی کیوں کروں۔''

''تم نبیل کے لیے جو احساسات رکھتے تھے وہ نہیں رکھتے۔ تم رومیصہ اور اس کی بچی کے لیے جتنی ہمدردی رکھتے ہو وہ ان کے پاس نہیں ہے۔''

''میں نہیں جانتا تھا کہ یہ احساسات یہ ہمدردی میرے گلے کا پھندہ بن جائے گی۔ اگر مجھے رومیصہ اور ماہم سے ہمدردی ہے تو اس ہمدردی کو باقی رہنے دیں۔ کوئی نیا رشتہ بنا کر اسے ختم کرنے کی کوشش نہ کریں۔ مجھے رشتے نبھانے نہیں آتے ہیں پھر آپ کیوں زبردستی یہ طوق میرے گلے میں ڈال رہے ہیں۔''

تم بہت خود غرض ہو ذیشان تم بے حد خود غرض ہو۔''

''ہاں میں ہوں ہر ایک ہوتا ہے۔ کیا آپ نہیں ہیں؟'' وہ بے حد تلخی سے بات کر رہا تھا۔ سکندر علی اسے صرف دیکھ کر رہ گئے تھے۔ اس کا ردعمل ان کی توقعات کے بالکل برخلاف تھا۔

''ہاں میں بھی ہوں اور اسی لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے اگر تم میری بات نہیں مانتے تو پھر تمھیں میری جائیداد میں سے کچھ نہیں ملے گا۔''

ان کا لہجہ بے حد سرد تھا۔ ذیشان ہکا بکا سا ان کا چہرہ دیکھتا رہا۔ انھوں نے بات جاری رکھی تھی۔

''میں نے تمھیں بیرون ملک بزنس ایڈمنسٹریشن کی تعلیم دلوانے پر ڈھیروں روپیہ خرچ کیا مگر تم نے واپس آ کر کاروبار میں میرا ہاتھ بٹانے کے بجائے سول سروس جوائن کر لی۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ لیکن اب میرا خیال ہے کہ تمھیں اپنے پیروں پر بھی کھڑا ہو جانا چاہیے۔ تمھیں اپنے اخراجات اپنی تنخواہ میں پورے کرنے چاہئیں۔ جیسے سب ملازمت پیشہ لوگ کرتے ہیں۔ جس کاروبار کے چلانے میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔ اس کے منافع میں بھی تمہارا کوئی حصہ نہیں ہونا چاہیے۔ آئندہ میں تمھارے اکاؤنٹ میں کوئی رقم جمع کرواؤں گا اور نہ ہی میری وصیت میں تمھارے لیے کچھ ہوگا۔''

''آپ مجھے بلیک میل کر رہے ہیں۔'' وہ بولا تھا۔

''ہاں بلیک میل کر رہا ہوں۔ کتنی دیر تمھیں پالوں گا۔ دوسروں کی محنت کتنی دیر تمھیں کھلاتا رہوں گا۔ نہیں ذیشان صاحب! اب یہ نہیں ہوگا اگر تم اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنا چاہتے ہو تو گزارو اور اسے گزارنے کے لیے اپنے وسائل پر انحصار کرو۔''

وہ باپ کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔ "پاپا! آپ میرے ساتھ یہ نہیں کر سکتے۔ میں اپنے حق کے لیے کورٹ میں جاؤں گا۔ جو حصہ جائیداد میں میرا ہے وہ تو رہے گا۔ چاہے میں کاروبار میں حصہ لوں یا نہ لوں۔ آپ مجھے اس سے محروم نہیں کر سکتے۔ میں اپنے حقوق سے اچھی طرح واقف ہوں اور انھیں Defend کرنا بھی جانتا ہوں۔"

"بہت اچھی بات ہے اب تم کورٹ کے ذریعے ہی مجھ سے اپنا حصہ لینا۔ میں ویسے تو تمھیں کچھ نہیں دوں گا۔" سکندر علی نے حتمی لہجے میں کہا تھا وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ کچھ دیر تک انھیں دیکھتے رہنے کے بعد وہ زور سے دروازہ پٹختے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔

.........✿.........

اس رات گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ فاخرہ جہاں حیران تھیں وہاں بے حد مشتعل بھی تھیں۔ انھیں لگا جیسے سکندر علی کا دماغ خراب ہو گیا ہے اور انھوں نے برملا اس کا اظہار کیا تھا۔ مگر سکندر علی پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا تھا اور کوئی بھی انھیں اپنے فیصلے سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہر ایک اس فیصلے کی شدید مخالفت کرے گا۔ اسی لیے وہ اس ہنگامے سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے فاخرہ کو بھی اس بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ذیشان کو اپنی جائیداد میں سے کچھ نہیں دیں گے اور فاخرہ کا خون کھول کر رہ گیا تھا۔ ربیعہ ان کی بھانجی تھی اور ان ہی کی خواہش پر ذیشان نے ایک سال پہلے اس سے نکاح کیا تھا اور اگر نبیل کی موت نہ ہوئی ہوتی تو اب تک ربیعہ کی رخصتی ہو چکی ہوتی۔ فاخرہ جانتی تھیں کہ صرف تنخواہ ذیشان کا شادی سے پہلے گزارہ نہیں ہوتا تو شادی کے بعد کیسے ہوگا اور اگر اسے جائیداد لینی تھی تو رومیصہ سے شادی کرنی تھی۔

اور یہ بات ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ جو لڑکی نبیل کی ضد پر ان کے گھر آئی تھی اور جسے وہاں سے نکالنے کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں۔ وہ ایک بار پھر سے ان کے گھر پر جڑ پکڑ جائے یہ وہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں۔ اور مخالفت کرنے والی صرف وہ نہیں تھی اس گھر میں کوئی ایسا فرد نہیں تھا جو سکندر علی کی حمایت کر رہا ہو اور یہ مخالفت کھلے عام ہو رہی تھی حتیٰ کہ ستارہ اور عالیہ بھی خاموش نہیں رہی تھیں۔ مگر وہ اپنی بات پر قائم رہے تھے بلکہ اگلی صبح انھوں نے وکیل کو بھی گھر بلوا لیا تھا۔ اور وکیل نے ان کی پہلے سے تیار شدہ وصیت پڑھ کر سنا دی تھی باقی سب کو ان کا حصہ دیا گیا تھا ماسوائے ذیشان کے۔ اور اسی وجہ سے ذیشان کے بڑے اور چھوٹے بھائیوں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ کم از کم ان سے کسی قسم کی حق تلفی نہیں کی گئی تھی۔ مگر وصیت میں ذیشان کے بارے میں سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔

وہ وصیت ختم ہونے پر سرخ چہرے کے ساتھ ایک لفظ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا تھا۔ مگر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ اسے بھی حقیقت کا سامنا کرنا تھا۔ ربیعہ کو اس نے اس سارے مسئلے سے آگاہ کر دیا تھا اور اس کے گھر والے اتنے مشتعل ہو گئے تھے کہ انھوں نے ذیشان سے خلع کا مطالبہ کر دیا تھا۔ اس نے ربیعہ سے کہا تھا کہ وہ اپنی جائیداد سے دستبردار ہونے کو تیار ہے لیکن وہ رومیصہ سے شادی نہیں کرے گا مگر یہ بات ربیعہ کو قابل قبول نہیں تھی۔

"آخر تم کس جرم کی سزا بھگتو گے؟ آخر کیوں اپنا حصہ چھوڑو۔ نہیں ذیشان! قطعی نہیں۔ تمھیں اپنے فادر سے اس معاملے میں جھگڑنا ہوگا۔

ان سے کہنا ہوگا کہ وہ تمہاری حق تلفی نہ کریں۔ وہ کیوں یہ سب کر رہے ہیں۔ کیا ہو گیا ہے انھیں؟''

ربیعہ کے پاس ان باتوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا اور یہ بیان، تقریریں اور مطالبے ذیشان کا مسئلہ حل نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ربیعہ کے رویے سے کچھ مایوس ہو گیا تھا، گو دونوں کے درمیان روایتی قسم کے عہد و پیمان تو نہیں ہوئے تھے کیونکہ یہ رشتہ فاخرہ کی مرضی سے طے پایا تھا۔ مگر پھر بھی قدرتی طور پر ذیشان نے اس سے کچھ توقعات وابستہ کر لی تھیں جنھیں بری طرح ٹھیس لگی تھی۔

''اگر میں صرف اس سے شادی کرنے کے لیے اپنا حصہ چھوڑنے پر تیار ہوں تو یہ کیوں تھوڑی قربانی نہیں دے سکتی، اسے اپنی خواہشات کو ہی کسی حد تک کنٹرول کرنا ہوگا۔ کیا یہ میرے لیے یہ بھی نہیں کر سکتی۔ آخر اس کے نزدیک آسائشات مجھ سے زیادہ اہم کیوں ہیں؟ اسے میری ضرورت ہے مگر باقی سب کچھ بھی چاہیے اور اس ''باقی سب کچھ'' کے بغیر اس کے نزدیک میری کیا اہمیت ہے؟''

اس سے ہر ملاقات یا فون پر ہونے والی ہر گفتگو کے بعد ذیشان کا ذہن سوالوں میں الجھتا جاتا تھا۔ وہ ربیعہ پر دل و جان سے فدا نہیں تھا۔ لڑکیوں میں اس کی دلچسپی شروع سے نہیں تھی۔ اس کے اور مشاغل تھے اور اس معاملے میں وہ اور نبیل ایک دوسرے کے بالکل برعکس تھے۔ نبیل کو لڑکیوں میں جتنی دلچسپی تھی وہ لڑکیوں سے اتنا ہی دور بھاگتا تھا۔ شادی کے معاملے میں شروع سے ہی اس کی رائے یہ تھی کہ وہ ارینج میرج کرے گا کیونکہ وہ ہی سب سے بہتر ہوتی ہے۔ نبیل اکثر اس کی اس بات کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔

''اگر تمہاری ارینج میرج نہ ہوئی تو کبھی شادی ہوگی ہی نہیں کیونکہ تمھیں کبھی کسی لڑکی سے عشق نہیں ہو سکتا۔''

وہ نبیل کی بات سنتا اور بس مسکرا دیتا۔ ربیعہ سے نکاح کے بعد دونوں اکثر ملتے رہتے تھے اور زندگی میں پہلی اور اپنی طرف سے آخری بار اس کے دل میں کسی لڑکی کے لیے نرم گوشہ پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ مگر اب وہ عجیب صورت حال میں گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ دوسری شادی کو ہی سرے سے مناسب نہیں سمجھتا تھا اور کہاں یہ کہ نبیل کی بیوی سے شادی۔ وہ رومیصہ کے بارے میں نبیل کے جذبات اور احساسات سے بہت اچھی طرح آگاہ تھا اور اب اس لڑکی سے سکندر علی اس کی شادی کروانا چاہتے تھے۔

سکندر علی سے اس کے تعلقات پہلے بھی کوئی زیادہ خوشگوار نہیں تھے۔ اور تعلقات میں اس کشیدگی کا آغاز تب ہوا تھا جب اس نے بی بی اے کے لیے باہر جانے سے انکار کر دیا تھا اس نے تب صاف صاف سکندر علی سے کہہ دیا تھا کہ اسے بزنس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی وہ اسے کیریئر بنانا چاہتا تھا۔ مگر سکندر علی اس کی بات پر بے حد ناراض ہوئے تھے وہ باقی بیٹوں کی طرح اسے بھی بزنس میں لانا چاہتے تھے۔ نبیل نے اس وقت ذیشان کو سمجھا بجھا کر امریکہ آنے پر رضامند کر لیا تھا۔

''بعد میں تم بے شک بزنس نہ کرنا۔ مگر فی الحال اس میں تعلیم حاصل کرنے میں کیا حرج ہے؟''

اس نے ذیشان کو قائل کر لیا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے بی بی اے کر لیا تھا۔ مگر تعلیم مکمل کرنے کے بعد بزنس جوائن کرنے کے بجائے وہ سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے پولیس سروس میں آ گیا تھا اور سکندر علی نے اس بار ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ انھوں نے اس کی تعلیم پر روپیہ اس لیے خرچ کیا تھا کہ بعد میں وہ بزنس میں ان کا ہاتھ بٹائے مگر وہاں تو معاملہ ہی الٹ ہو گیا تھا۔ وہ نہ صرف ان کے بزنس میں نہیں آنا چاہتا تھا

بلکہ اس نے ان کی کھلم کھلا حکم عدولی کرتے ہوئے جاب کر لی تھی اور یہ بات انھیں ہضم نہیں ہوئی تھی۔ ایک بار پھر نبیل اس کی مدد کو آیا تھا اور اس نے باپ اور ذیشان کے درمیان نہ صرف صلح کروائی تھی بلکہ سکندر علی کو اس بات پر منا لیا تھا کہ وہ ذیشان کو جاب کرنے دیں گے۔

بظاہر دونوں کے درمیان تعلقات نارمل ہو گئے تھے، مگر سکندر علی اب بھی اس کی جاب کو پسند نہیں کرتے تھے اور ان کی یہ ناپسندیدگی اسے ناپسند تھی۔ نبیل کی موت نے اور رومیصہ کے لیے ہمدردی نے وقتی طور پر دونوں کے پرانے اختلافات نہ صرف ختم کر دیے تھے بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کے کافی قریب کر دیا تھا۔ مگر اب سکندر علی کے اس مطالبے نے ایک بار پھر دونوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا تھا۔

***

رومیصہ کو اس سارے معاملے کے بارے میں بالکل علم نہیں تھا۔ سکندر علی نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن فاخرہ اور گھر کے دوسرے افراد کے رویے کی بڑھی ہوئی تلخی نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ فاخرہ جس طرح اب اسے طعنے دینے لگی تھیں۔ پہلے نہیں دیتی تھیں عالیہ اور ستارہ نے بھی اب اسے جھڑکنا شروع کر دیا تھا۔ جبکہ اس سے پہلے اگر وہ اس سے بات نہیں کرتی تھیں تو اسے جھڑکتی بھی نہیں تھیں۔ اس تلخی کی وجہ زیادہ دیر تک اس سے پوشیدہ نہ رہ سکتی تھی۔ گھر کی ایک ملازمہ نے جب سکندر علی اور گھر کے دوسرے افراد کے درمیان ہونے والے جھگڑے کی وجہ اسے بتائی تھی تو وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''کیا مجھ پر آنے والے عذاب کبھی ختم نہیں ہوں گے؟'' اس نے بے بسی سے سوچا تھا۔ اس رات وہ ماہم کو گود میں لیے بے تحاشا روئی تھی۔

''پاپا! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' وہ پہلی بار بڑے حوصلے اور ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اگلی شام سکندر علی کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ چند لمحوں تک اس کا چہرہ دیکھتے رہنے کے بعد انھوں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔ شاید وہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ کیا بات کرنا چاہتی ہے۔

''پاپا! مجھے ذیشان سے شادی نہیں کرنی ہے۔'' اس نے بیٹھتے ہی کہہ دیا تھا۔

وہ اس کی بات پر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بڑے پرسکون انداز میں بولے تھے۔ ''کیوں؟''

''مجھے اب کسی سے بھی شادی نہیں کرنی اور ذیشان تو میرے لیے بھائیوں کی طرح ہے۔''

''لیکن وہ تمہارا بھائی نہیں ہے۔'' وہ اب بھی بے حد پرسکون تھے۔

''پاپا وہ نبیل کا بھائی ہے اور میں نے بھی اسے ہمیشہ بھائی ہی سمجھا ہے۔''

''رومیصہ! تمھارے سمجھنے سے رشتے نہیں بنیں گے۔ رشتہ وہی ہوتا ہے جو اصل میں ہے۔ تمہارا بھا ئین وہ پہلے تھا نہ اب ہے۔''

''پاپا! مجھے شادی کرنا ہی نہیں ہے۔ شادی ایک دفعہ ہی ہوتی ہے اور میری شادی ہو چکی ہے، اب اگر نبیل نہیں رہا تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں دوسری شادی کر لوں۔ نبیل کیا سوچے گا میرے بارے میں۔'' وہ بات مکمل نہیں کر سکی اور رونے لگی۔

''جو لوگ مر جاتے ہیں ان کی پسند ناپسند کا خیال رکھنے کے بجائے زندہ لوگوں کی خواہشات کا خیال رکھنا چاہیے۔ تم کم عمر ہو۔ جذباتی ہو۔ بہت سی باتیں ابھی تمھارے دماغ میں نہیں آئیں گی۔ کچھ عرصہ کے بعد سوچو گی۔ ساری زندگی تم نبیل کے نام کے سہارے نہیں گزار سکتیں۔ گزارنا

چاہو گی تب بھی نہیں گزار سکو گی۔'' سگار سلگاتے ہوئے وہ کہتے گئے تھے۔

''پاپا! میں گزار سکتی ہوں۔'' اس نے بڑے یقین سے کہا تھا۔

''نہیں تم نہیں گزار سکتیں۔ یہ چند مہینوں یا چند سالوں کی بات نہیں ہے۔ یہ ساری زندگی کی بات ہے۔

''میرے پاس ماہم ہے۔ میں اس کے سہارے زندگی گزار لوں گی۔''

''اور ماہم کس کے سہارے زندگی گزارے گی؟ تمہارا سہارا تو اتنا مضبوط ہے نہیں اور زندگی میں بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ سہارے کی بیساکھیوں کے علاوہ بھی۔ ماہم کو تم کیا دو گی؟ باپ نہیں ہوگا۔ بہن بھائی نہیں ہوگا۔ اچھی جگہ شادی کیسے کرو گی؟ اور فرض کیا اس کی کہیں شادی کر دیتی ہو تو پھر تم کہاں رہو گی؟'' ان کے انداز میں عجیب سی سرد مہری تھی۔

''پاپا! آپ ہیں نا۔''

''ہاں میں ہوں مگر کب تک؟ میرے مرنے کے بعد تم کیا کرو گی۔ میری زندگی میں اس گھر میں تمہاری کوئی اہمیت ہے نہ عزت۔ میرے مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ وہ تمھیں اس گھر سے نکال دیں گے۔ پھر ماہم کو لے کر کہاں جاؤ گی؟ تمھارے کون سے ماں باپ ہیں جو تمھیں سر چھپانے کو جگہ دیں گے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو تمھارے پاس نہیں ہے۔ پھر دنیا میں کیسے مقابلہ کرو گی۔''

وہ بڑی بے رحمی سے حقیقت بتاتے گئے تھے۔

''پاپا! میں ذیشان سے شادی نہیں کر سکتی۔ میں اس کی زندگی برباد نہیں کر سکتی۔ مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ میں اس کی اور ربیعہ کی زندگی میں زہر گھولوں۔ پاپا! میں یہ نہیں کر سکتی۔ آخر انھیں کیوں سزا ملے۔'' وہ بے چارگی سے کہہ رہی تھی۔

''اس شادی سے کسی کی زندگی برباد نہیں ہوگی بلکہ تمہاری اور ماہم کی زندگی سنور جائے گی۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تمھیں اور ماہم کو ذیشان کا نام مل جائے۔ کم از کم پھر تمھیں اس گھر سے کوئی نہیں نکال پائے گا اور ماہم کا مستقبل بھی محفوظ ہو جائے گا اور ذیشان اور ربیعہ کی زندگی میں کوئی زہر نہیں گھولے گا۔ وہ دونوں اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ میں اس سے یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ وہ ربیعہ کو طلاق دے دے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ تم سے بھی نکاح کر لے اور یہ ایسا کون سا انوکھا کام ہے جو پہلے کبھی کسی آدمی نے نہیں کیا۔ مرد چار چار شادیاں بھی کرتے ہیں اور اچھی زندگی گزارتے ہیں۔ تم لوگ بھی خوش رہ سکتے ہو۔''

''پاپا میں......''

''رومیصہ! اس بارے میں جو تم نے کہنا تھا وہ میں نے سن لیا ہے۔ اس سے زیادہ بحث کی گنجائش نہیں ہے، زندگی کے بارے میں تمہاری اپروچ حقیقی نہیں ہے۔ بیٹی کے بجائے اگر تمہارا بیٹا ہوتا تو شاید میں اس شادی پر اصرار نہ کرتا مگر تم ایک بیٹی کی ماں ہو۔ جو باتیں تمھیں میں سمجھا رہا ہوں اگر تمھارے ماں باپ ہوتے تو وہ سمجھاتے پھر تمھیں یہ خیال بھی نہ آتا کہ شاید میں تم پر ظلم کر رہا ہوں۔ زندگی ایک حقیقت کا نام ہے۔ اسے تصورات کے سہارے نہیں گزارا جا سکتا۔ جو شخص اب زندہ نہیں ہے اس کے بارے میں مت سوچو، تمہارا کوئی اقدام اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ لیکن

تمھاری بیٹی جو زندہ ہے، اس کے بارے میں سوچو، جس کی پوری زندگی، پورے مستقبل کا دارو مدار تمھارے فیصلوں پر ہے اب تم جاؤ اور نبیل کو ذہن سے نکال کر ان سب باتوں کے بارے میں سوچو اور ایک بات ضرور یاد رکھنا اگر تم مر جاتیں تو نبیل بھی دوسری شادی کر لیتا۔ تمھارے تصورات کے سہارے زندگی نہیں گزارتا۔''

انھوں نے اسے کچھ کہنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ ان کے پاس دلائل تھے۔ وزنی دلائل، دل جو نہیں مانتا تھا وہ باتیں اس نے سن لی تھیں۔ بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہ اٹھ کر وہاں سے آ گئی تھی۔

....

پہلے ذیشان مہینے میں دو تین بار گھر آ جایا کرتا تھا۔ مگر اس بار وہ پورا مہینہ گھر نہیں آیا تھا، فاخرہ اسے فون کر کر کے تنگ آ گئی تھیں اور پھر وہ خود اس کے پاس شیخوپورہ گئی تھیں۔

''پاپا نے میرا اکاؤنٹ فریز کروا دیا ہے۔'' انھیں دیکھتے ہی رسمی سلام دعا کے بعد اس نے اطلاع دی تھی۔ وہ کیا دیکھنا چاہتے ہیں یہ کہ میں گڑگڑاتا ہوا ان کے پاس آؤں۔ ان سے کہوں کہ وہ مجھ پر یہ ظلم نہ کریں۔ ان سے پیسوں کی بھیک مانگوں۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔

''تم گھبراؤ مت تمھیں جتنے روپوں کی ضرورت ہو۔ تم مجھ سے لے لیا کرو۔'' فاخرہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی مگر وہ ان کی بات پر بھڑک اٹھا تھا۔

''آپ سے کیوں لوں؟ ان سے کیوں نہیں۔ میں بھیک تو نہیں مانگ رہا۔ اپنا حصہ چاہتا ہوں۔ کیا باقیوں کو نہیں دیتے وہ؟ کیا انھیں بھی آپ دیتی ہیں۔''

''تو مجھے بتاؤ۔ میں کیا کروں، جتنا انھیں سمجھا سکتی تھی سمجھا چکی ہوں مگر وہ شخص تو دل میں ٹھان کے بیٹھا ہے کہ جو اس نے کہا ہے وہی ہوگا۔ آخر میں کیا کروں تم خود ایک بار پھر ان سے بات کرو۔'' فاخرہ نے بے چارگی سے کہا تھا۔

''میں کیا بات کروں اور آخر کیوں کروں وہ آخر کیوں میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں، انھوں نے جیسے تہیہ کر لیا ہے کہ مجھے وہ کبھی چین سے نہیں رہنے دیں گے۔''

اس پر ان کی بات کا اثر نہیں ہوا تھا۔ مگر فاخرہ تو اسے قائل کرنے آئی تھیں۔ اسی لیے انھوں نے کئی گھنٹے بحث کر کے ایک بار پھر اسے اس مسئلے پر باپ سے بات کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔

اگلی صبح وہ ماں کے ساتھ ہی لاہور آیا تھا۔ دونوں نے ایک بار پھر سکندر علی کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اور اس بحث و مباحثہ کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ سکندر علی نے اعلان کیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تم اس سے شادی نہ کرو، تب پھر میں نبیل اور اپنے حصے کی جائیداد ماہم کے نام لکھوا دیتا ہوں۔ آخر مجھے بھی تو اس کا تحفظ چاہیے۔''

فاخرہ اس اعلان پر سکتے میں آ گئی تھیں اور ذیشان سرد نظروں اور بے تاثر چہرے کے ساتھ انھیں دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ مزید کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گئے تھے۔

''دیکھا آپ نے۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ کبھی اپنی سوچ بدلتے ہیں نہ فیصلہ۔ مگر آپ کو شوق تھا کہ میں اپنا وقت ضائع کروں۔''

وہ بھی یہ کہہ کر اٹھ کر چلا گیا تھا۔ یک دم فاخرہ کو خطرے کا احساس ہونے لگا تھا۔ پہلی بار انھوں نے کچھ سنجیدگی اور تحمل سے اس معاملے پر غور کیا تھا۔ پہلے اگر ذیشان کو حصہ نہیں ملتا تھا تو بھی وہ جائیداد سکندر علی کے نام ہی رہنی تھی اور وہ انھیں کے پاس رہتی، لیکن اب سکندر علی کے اس اعلان نے انھیں پریشان کر دیا تھا۔ نبیل اور ذیشان کے ساتھ ساتھ انھیں سکندر علی کی جائیداد بھی ہاتھ سے جاتی ہوئی دکھائی دی تھی۔

اس معاملے کے اس نئے رخ پر انھوں نے اپنے باقی بیٹوں سے بات کرنا بہتر سمجھا اور پہلی دفعہ وہ بھی حقیقی طور پر پریشان ہو گئے تھے۔ کئی دن تک اس مسئلے پر گھر میں زبردست قسم کی بحث ہوتی رہی اور پھر سب نے ہار مان لی تھی۔ انھوں نے اب ذیشان پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ سکندر علی کی بات مان لے۔ تھوڑی قربانی دے دے اور وہ اس مطالبے پر پہلے سے اکھڑ گیا تھا۔

''آخر ہر ایک مجھ سے ہی کیوں کہہ رہا ہے۔ خود کوئی ایثار کیوں نہیں کرتا۔ خود کسی کو قربانی کا خیال کیوں نہیں آتا۔ میری زندگی کیوں خراب کرنا چاہتے ہیں سب لوگ۔'' وہ ہر بار ان کے اصرار پر یہی کہتا۔

''ذیشان! تمہاری تھوڑی سی بے وقوفی اور جلد بازی نہ صرف تمھیں نقصان پہنچائے گی بلکہ ہم بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔ جذبات سے نہیں ہوش سے کام لو۔ دماغ کو استعمال کرو، روپے کے بغیر تم زندگی کیسے گزارو گے اپنی فیملی کو کس طرح رکھو گے۔ چند ہزار روپے میں ان کے لیے کیا کرو گے۔ پولیس کی اس جاب میں عزت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اور اگر یہ فرض کر بھی لیں کہ چلو تم اپنی تنخواہ میں گزارہ کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہو تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ربیعہ تمہارا ساتھ دے گی۔ وہ مشکلات برداشت کر لے گی۔ کچھ عقل سے کام لو۔ رومیصہ سے شادی کر لو، اسے پڑا رہنے دینا یہاں جیسے وہ اب ہے۔ تم ربیعہ کو ساتھ رکھنا۔ پاپا کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے وہ بھی خوش ہو جائیں گے اور یہ سارا مسئلہ بھی ختم ہو جائے گا۔''

اشعر اور احمر وقتاً فوقتاً اسے فون پر سمجھاتے رہتے تھے۔ ذہنی طور پر وہ بے حد ڈسٹرب ہو کر رہ گیا تھا۔ صرف سکندر علی کا دباؤ ہوتا تو شاید وہ کبھی ان کے سامنے نہ جھکتا لیکن اب دباؤ ڈالنے والا صرف ایک نہیں تھا پورا گھر اسے اس شادی پر مجبور کر رہا تھا۔

دوسری طرف ربیعہ تھی جو کسی صورت اس بات پر تیار نہیں تھی کہ وہ رومیصہ سے شادی کر لے یا اپنی جائیداد کا حصہ چھوڑ دے۔ فاخرہ نے بھی اس معاملے میں اس کی مدد نہیں کی تھی شاید وہ کر بھی نہیں سکتی تھیں ربیعہ ان کی بات سننے پر تیار تھی نہ اس کے گھر والے اور فاخرہ رشتوں کی خاطر دولت کو قربان نہیں کر سکتی تھیں۔

انھوں نے ربیعہ کے گھر والوں سے کہہ دیا تھا کہ اگر ربیعہ رومیصہ کو ذیشان کی دوسری بیوی کے طور پر قبول کرنے کو تیار نہیں تو پھر وہ طلاق

لے لے اور ربیعہ کے گھر والے یہی چاہتے تھے۔ لیکن اب مسئلہ ذیشان کا تھا جو کسی طور اسے طلاق دینے پر تیار نہیں تھا وہ کسی کو قائل نہیں کر پا رہا تھا نہ گھر والوں کو نہ ربیعہ اور اس کے گھر والوں کو۔

ربیعہ نے خلع کے لیے کورٹ میں کیس کر دیا تھا۔ اور نہ چاہنے کے باوجود اس نے طلاق دے دی تھی۔ اسے اب یہ گوارا نہیں ہوا کہ وہ ربیعہ کی ناپسندیدگی کے باوجود اسے بیوی بننے پر مجبور کرے۔

کورٹ میں کیس لڑنے کے بجائے اس نے بے حد خاموشی سے اسے طلاق اور حق مہر کا چیک بھجوا دیا تھا۔ مگر اپنی پوری فیملی کے لیے اس کے دل میں ہمیشہ کے لیے گرہ پڑ گئی تھی۔ پھر ایک شام بڑی سادگی سے اس کا نکاح رومیصہ سے ہو گیا تھا۔ نکاح نامے پر دستخط کرتے ہوئے وہ شرمندگی اور طیش کی انتہا پر تھا۔ گھر کے سب افراد اسے تماشائی لگ رہے تھے۔ نکاح کے پیپرز سائن کرتے ہی وہ سب کے روکنے کے باوجود سیدھا شیخوپورہ آ گیا تھا۔

⁂

اس شرمندگی اور افسردگی کو محسوس کرنے والا وہ واحد نہیں تھا۔ رومیصہ بھی اتنی ہی شرمسار تھی۔ وہ مرد تھا۔ اختیارات رکھتا تھا۔ مجبور نہیں تھا۔ خود مختار تھا پھر بھی وہ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا تھا اور وہ تو بہرحال ایسی عورت تھی جس کے پاس کوئی اختیار نہیں تھا نہ اپنی پسند بتانے کا نہ اپنی بات منوانے کا۔ سکندر علی نے نکاح سے ایک ہفتہ قبل رسمی طور پر اسے اطلاع دے دی تھی اور وہ جیسے سر کے بل ہوا میں معلق ہو گئی تھی۔ انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ شادی ذیشان کی مرضی کے خلاف ہو رہی ہے۔

وہ ربیعہ کی طلاق کے بارے میں بھی جانتی تھی اور اس کی ندامت تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ نکاح کے بعد ستارہ نے سرد مہری سے اسے نبیل کا کمرہ چھوڑ کر ذیشان کے کمرے میں منتقل ہو جانے کو کہا تھا۔ کمرے کو چھوڑنے سے پہلے وہ بڑی دیر تک ایک ایک چیز کو دیکھتی رہی۔ یہ وہ کمرہ تھا جہاں ایک سال پہلے کوئی اسے بڑی چاہ سے لایا تھا۔ جہاں انھوں نے ایک دوسرے سے بے پناہ وعدے کیے تھے لاتعداد خواب دیکھے تھے، بے شمار منصوبے بنائے تھے۔ ابھی بھی جیسے فضا میں نبیل کی باتوں اس کی آواز کی بازگشت تھی۔

نبیل کے کمرے سے ذیشان کے کمرے تک آتے آتے اسے جیسے صدیاں لگ گئی تھیں۔ ہر قدم جیسے پل صراط پر پڑ رہا تھا۔

نبیل اور ذیشان کے کمرے میں اتنا ہی فرق تھا جتنا ان کی فطرت میں۔ نبیل کے کمرے کے کارپٹ سے لے کر لہراتے ہوئے پردوں تک سے اس کے اچھے ذوق کا اظہار ہوتا تھا۔ ہر چیز میں ایک نفاست، نزاکت، ایک دلکشی تھی۔ ذیشان کا کمرہ آسائشات کے اعتبار سے تو نبیل کے کمرے جیسا ہی تھا مگر وہاں پڑی ہوئی کسی چیز سے بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس چیز کے انتخاب میں ذاتی دلچسپی لی گئی تھی اور شاید دلچسپی لی بھی نہیں گئی تھی۔ ہوسکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بہت کم ہی وہاں آیا کرتا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اسے جنت سے زمین پر پھینک دیا گیا تھا اور دنیا میں اب بھی کوئی نہیں تھا۔

⁂

شیخوپورہ جا کر بھی ذیشان کی بے چینی میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک ہفتے کی چھٹی لے کر مری چلا گیا تھا۔ سکون یہاں بھی نہیں تھا مگر کم از کم یہاں اس تک کوئی آ نہیں سکتا تھا۔ وہ شروع سے ہی بہت کم گو تھا۔ نبیل کے برعکس وہ بہت کم باتیں کرتا تھا اور جب کرتا تھا تو دلائل کے ساتھ سنجیدگی اس کے مزاج کی ایک اور خصوصیت تھی۔ ہر بات کے بارے میں اس کا اپنا انداز فکر تھا۔ باپ سے اسے ہمیشہ بے توجہی کی شکایت رہی اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے لاشعوری طور پر بزنس کے بجائے جاب کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ اپنی ذات کو نوٹ کمانے والی مشین بنانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ جاب کا انتخاب کرتے ہوئے وہ اس جاب کا انتخاب کر بیٹھا جس میں نو سے پانچ والی کوئی روٹین نہیں تھی مگر پھر بھی وہ ناخوش نہیں تھا، وہ پولیس کی جاب کو انجوائے کر رہا تھا۔

جاب اگرچہ اس کی مالی ضروریات پوری کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ مگر اسے اس کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ سکندر علی اس کے اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم جمع کرواتے رہتے تھے اور باپ سے چھوٹے موٹے اختلافات کے باوجود اس کی زندگی بہت سکون سے گزر رہی تھی اور اب سکون نام کی کوئی چیز اس کے پاس نہیں رہی تھی۔ مسئلہ صرف یہ نہیں تھا کہ رومیصہ کی وجہ سے اسے ربیعہ کو طلاق دینی پڑی تھی نہ ہی مسئلہ یہ تھا کہ وہ نبیل کی بیوی تھی۔

پرابلم یہ تھا کہ وہ اس کے بارے میں نبیل کے سارے احساسات اور جذبات سے واقف تھا۔ اسے پہلی بار دیکھنے سے لے کر شادی کے بعد تک نبیل اس کے بارے میں اپنے ہر احساس کو اس کے ساتھ شیئر کرتا رہا تھا اور اب...... اب وہ اس کی بیوی تھی اور اس کے بارے میں نبیل کی کہی گئی ہر بات اسے یاد آنے لگی تھی اور اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ خودکشی کر لے۔ وہ اس کے لیے اب بھی نبیل کی بیوی تھی جسے وہ چند ماہ پہلے تک بھابھی کہتا رہا تھا۔

مری میں ایک ہفتہ رہنے کے دوران وہ سارا دن آوارہ پھرتا رہتا تھا اور ذہن میں آنے والی سوچیں بھی اتنی ہی آوارہ تھیں۔ جس چیز کے بارے میں وہ نہ سوچنا چاہتا، وہ اس کے دماغ سے چپک کر رہ جاتی اور جس چیز کے بارے میں وہ سوچنا چاہتا اسے دماغ میں لانے میں کئی گھنٹے لگ جاتے۔

پہلے اسے صرف سکندر علی سے شکایت تھی اب اسے وہ سب ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے لگتے۔ گھر والوں کے خلاف اس کے دل میں ایک عجیب سی کدورت پیدا ہو گئی تھی۔ اسے یوں لگتا جیسے سب نے مل کر اس کے ساتھ فراڈ کیا ہے۔ اسے دھوکا دیا ہے اور یہ احساس دن بدن شدت اختیار کرتا گیا تھا۔

ایک ہفتہ مری میں رہنے کے بعد وہ وہاں سے سیدھا لاہور آیا تھا اور آتے ہی اس نے سکندر علی سے اپنے حصے کی جائیداد کا مطالبہ کر دیا تھا، سکندر علی کو شاید اس کا اندازہ تھا اس لیے انھوں نے پہلے ہی کاغذات تیار کروا رکھے تھے۔ وہ بڑی سرد مہری سے کاغذات ان سے لے آیا تھا۔ واپس شیخوپورہ جانے سے پہلے وہ اپنے بیڈروم میں آیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک کونے میں پڑے ہوئے بے بی کاٹ نے کمرے میں ہونے والی تبدیلی کے بارے میں اسے بتا دیا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا وہ ماہم کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دے وہ نہ ہوتی تو شاید یہ سب بھی نہ ہوتا۔ اسے یوں قربانی کا بکرا نہ بنایا جاتا۔ جلتی آنکھوں کے ساتھ وہ ہونٹ بھینچے ہوئے ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔

کپڑے بدلنے کے بعد جب وہ کمرے میں آیا تھا تو اس نے رومیصہ کو کاٹ پر جھکے ہوئے دیکھا تھا ڈریسنگ کے دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ سیدھی ہو گئی تھی۔ دونوں کی نظریں جس تیزی سے ملی تھیں اسی تیزی سے چرا لی گئی تھیں۔ وہ واپس جانے سے پہلے اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا

اور یہ مرحلہ بے حد مشکل تھا۔

''میں نے اسے دیکھا اور میں اس کا تھا بس۔ اسے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔''

ایک بار نبیل نے اسے بتایا تھا اور وہ...... اور وہ اس کا ہونا نہیں چاہتا تھا۔

''کچھ باتیں ہیں جو میں کلیئر کر دینا چاہتا ہوں تم جانتی ہو، یہ شادی میری مرضی سے نہیں ہوئی۔ مجھے مجبور کر دیا گیا تھا۔ کوئی دوسرا راستہ میرے پاس تھا ہی نہیں۔ میرے دل میں تم دونوں کے لیے پہلے جگہ تھی، اب نہیں ہے۔ میرے لیے، بہت مشکل ہے کہ میں تم دونوں کو اپنی زندگی میں شامل کروں۔ بہر حال میں کوشش کروں گا لیکن تم مجھ سے کوئی توقعات وابستہ نہ کرنا۔ میں ماہم کے باپ کا رول بھی ادا نہیں کر سکتا اور نہ ہی اچھا شوہر بن سکتا ہوں۔ لیکن مجھے اچھا شوہر بننے کے لیے کہا بھی نہیں گیا۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ تمھیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔'' وہ اس کے چہرے پر نظر ڈالے بغیر بولتا رہا تھا اور اپنی بات کے اختتام پر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ سر جھکائے بیڈ کے ایک کونے پر بیٹھ گئی اور کتنی ہی دیر بیٹھی رہی۔ پچھلے ڈیڑھ سال میں اس کی شادی ہوئی تھی، وہ بیوہ ہوئی تھی، ماں بنی تھی۔ ایک بار پھر شادی ہو گئی تھی، زندگی میں اب آگے کیا تھا؟ زندگی کو اس سے جلدی کس نے برتا ہوگا اور اب وہ کہہ رہا تھا وہ کوشش کرے گا کہ اسے شکایت نہ ہو۔

رومیصہ عمر کی شکایت کہاں ہوتی ہے اسے تو بس سمجھوتا کرنا آتا ہے کل، آج اور کل۔ بس اسے سمجھوتے ہی تو کرنے ہیں۔'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے سوچا تھا۔

''تمھیں کیا ضرورت تھی آنے کی دنیا میں تمھارے لیے کیا رکھا تھا۔ جس طرح میں زندگی گزار رہی ہوں۔ تمھیں بھی ویسے ہی گزارنی تھی پھر کیوں...... اللہ میں کیا کروں جو میری راہ کے کانٹے اس کے رستے میں نہ آئیں۔ کیوں پیدا کیا اسے تم نے؟ کیوں پیدا کیا؟ اس کی کیا ضرورت تھی؟ میں کافی تھی نا آزمائشوں کے لیے۔ پھر یہ کیوں میری بیٹی ہی کیوں۔''

وہ ماہم کے پاس آکر اسے دیکھتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ سوچ رہی تھی۔

وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ زندگی اپنی ڈگر پر آتی جا رہی تھی۔ آزمائشوں میں اضافہ ہوا تھا نہ کمی بس ان کی عادت ضرور ہو گئی تھی۔ اسے کسی کی بات پر اعتراض ہوتا تھا نہ شکوہ جب تک اسے سر پر چھت جسم پر لباس اور کھانے کے لیے روٹی ملتی اسے اس بات سے قطعاً کوئی غرض نہیں تھی کہ کون اسے کیا کہتا ہے اور کیا نہیں۔

وہ صبح سے شام تک مشین کی طرح گھر والوں کی خدمت میں لگی رہتی۔ اکثر اسے یہ بھی پروا نہیں ہوتی تھی کہ ماہم کس حال میں ہے اسے دودھ ملا ہے یا نہیں۔ وہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے۔ وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ گھر والے خوش رہیں۔ ان کا کوئی کام خراب نہ ہو۔ انھیں ہر چیز وقت پر مل جائے۔ ماہم کا کیا تھا وہ تو پل ہی رہی تھی۔

ذیشان مہینے میں ایک دو بار آیا کرتا تھا۔ کبھی صرف چند گھنٹے گزار کر چلا جاتا۔ کبھی ایک رات کے لیے ٹھہر جاتا۔ اس کا اشتعال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ختم ہو گیا تھا اور اس کی جگہ افسردگی اور پچھتاوے نے لے لی تھی اس کے دل میں رومیصہ کے لیے جگہ تھی یا نہیں مگر اس نے اسے بیوی کی حیثیت ضرور دے دی تھی۔ اگرچہ یہ سب دونوں کے لیے بہت مشکل، بہت تکلیف دہ تھا۔

نبیل زندہ نہ ہونے کے باوجود ان دونوں کی تنہائی میں موجود رہتا تھا جہاں رومیصہ کو لگتا کہ وہ نبیل سے بے وفائی کر رہی ہے وہاں ذیشان کو یوں لگتا جیسے وہ اپنے بھائی کو دھوکا دے رہا ہے۔ شروع میں اس بیڈروم میں رات گزارنا اسے قیامت سے کم نہیں لگتا تھا۔ وہ سوتے سوتے نیند سے اٹھ جاتا۔ اسے یوں لگتا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو۔ وہ کمرے کی کھڑکیاں کھول دیتا مگر تب بھی اسے سکون نہیں ملتا پھر وہ ٹیرس پر نکل جاتا اور بعض دفعہ صبح تک وہیں سگریٹ پھونکتا رہتا۔ وہ بے خبر نہیں تھی۔ وہ سمجھتی تھی مگر وہ بے بس تھی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اسے اپنے وجود سے شدید نفرت ہوتی۔

''نہ میں ہوتی نہ دوسروں کے لیے یوں عذاب بنتی۔'' وہ سوچتی اور سر پکڑ لیتی۔

........✿........

جوں جوں وقت گزرتا گیا ذیشان کی آمد کم ہوتی گئی۔ اب وہ مہینے میں صرف ایک بار آتا تھا۔ ایک خاموشی تھی جو اس پر طاری رہتی تھی۔ وہ سنجیدہ پہلے بھی تھا مگر اتنا چپ کبھی بھی نہیں تھا۔ مگر اب تو گھر آ کر جیسے وہ بات کرنا بھول جاتا تھا۔ رومیصہ کے ساتھ تو وہ ضرورت سے زیادہ کبھی بات نہیں کرتا تھا۔ مگر اب باقی لوگوں کے ساتھ بھی اس کی گفتگو بہت کم ہو گئی تھی۔ اسے ماہم سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

جب تک سکندر علی نے اسے رومیصہ سے شادی کرنے کے لیے نہیں کہا تھا تب تک وہ ماہم کو ہر دفعہ گھر آنے پر ضرور دیکھنے آیا کرتا تھا اور کچھ دیر کے لیے اٹھا بھی لیتا تھا۔ مگر شادی کے بعد اس نے ماہم کو اٹھانا تو در کنار کبھی اس پر نظر بھی نہیں دوڑائی تھی۔ بلکہ بعض دفعہ جب وہ رونے لگتی تو اسے بے تحاشا غصہ آیا اور وہ رومیصہ سے کہتا کہ وہ اسے کمرے سے باہر لے جائے۔

ماہم جب رونے پر آتی تو روتی ہی جاتی پھر اسے چپ کروانا بے حد مشکل ہو جاتا اور ذیشان کا پارہ آسمان سے باتیں کرنے لگتا۔ اس دن بھی یہی ہوا تھا۔ ماہم نیند سے اٹھ کر یک دم رونے لگی تھی وہ اس وقت خود سونے کے لیے بیڈ پر لیٹنے کو تھی۔ ذیشان کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر ماہم کو چپ کروانے کی کوشش کی۔ مگر وہ چپ ہونے کے بجائے اور زور سے رونے لگی۔ کچھ دیر تک وہ یہ شور شرابا برداشت کرتا رہا مگر پھر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

''اسے چپ کرواؤ ورنہ میں اسے اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا۔''

اس نے بڑے درشت لہجے میں کہا تھا اور وہ اس کی بات پر خوفزدہ ہو گئی تھی۔ ماہم کو اٹھا کر وہ کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ اور باہر نکل کر اسے چپ کروانے کے بجائے وہ خود بھی رونے لگی تھی۔ ماہم کچھ دیر تک روتے رہنے کے بعد خاموش ہو گئی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر اسے لیے سیڑھیوں پر بیٹھی رہی۔ اس واقعہ کے بعد یہ ہوتا تھا کہ جب ذیشان کمرے میں ہوتا تو وہ ماہم کو وہاں نہ چھوڑتی۔ اگر اسے کام کرنا ہوتا تو وہ ماہم کو اپنے پاس ہی لٹا

لیتی اور خود کام میں مصروف رہتی۔ کبھی ماہم سوجاتی۔ کبھی وہ اٹھ کر خود ہی کھیلتی رہتی اور اگر ذیشان کی موجودگی میں وہ کبھی رات کو رونے لگتی تو وہ فوراً اس کو لے کر کمرے سے باہر ٹیرس پر نکل جاتی۔ اس کے موڈ کو بگڑنے سے بچانے کا جو واحد حل اسے نظر آتا تھا۔ وہ یہی تھا۔

جب ذیشان نہ ہوتا تب وہ اسے سارا دن کمرے میں ہی رکھتی۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ ماہم کمرے میں رو رو کر ہلکان ہو جاتی اور اسے پتا ہی نہ چلتا اور پھر جب خیال آنے پر وہ اوپر جاتی تو وہ زور و شور سے رو رہی ہوتی پتا نہیں کیوں لیکن وہ پھر اسے نیچے لے کر نہ آتی، شاید وہ خوفزدہ تھی کہ کہیں گھر والوں کو یہ بات بھی ناگوار نہ لگنے لگے۔

شروع میں ماہم نے اسے کچھ تنگ کیا تھا مگر آہستہ آہستہ وہ بھی جیسے حالات سے سمجھوتہ کرنا سیکھ گئی تھی۔ جہاں رومیصہ اسے ڈال دیتی وہ وہیں پڑی رہتی۔ جو وہ اسے کھانے کو دیتی وہ خاموشی سے کھا لیتی۔ رومیصہ کے پاس روپے نہیں ہوتے تھے۔ جن سے وہ اس کے لیے اچھی خوراک یا کپڑے خریدتی، ستارہ اسے اپنی بیٹی کے استعمال شدہ کپڑے دے دیتی اور رومیصہ وہی کپڑے ماہم کو پہناتی رہتی۔ کھانے کے لیے وہ اسے دودھ دیتی تھی یا پھر روٹی کا ایک ٹکڑا تھما دیتی اور کبھی نرم سے چاول پکا کر اسے کھلا دیتی۔

جب ستارہ اور عالیہ اپنے بچوں کو طرح طرح کے سیریلز دیتی تو بعض دفعہ اس کا دل چاہتا کہ وہ بھی ایسی ہی کوئی اچھی سی چیز اسے کھلائے۔ اسے جوس پلائے، بسکٹ دے، اسے کوئی پھل کھلا سکے مگر ہر بار وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔ وہ کچن سے اس کے لیے کچھ بھی چرا کر نہیں لینا چاہتی تھی اور اگر وہ ممی سے کسی چیز لینے کی اجازت مانگتی تو وہ کبھی اسے اجازت نہ دیتیں۔ انھوں نے شروع ہی سے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو سادہ خوراک کھلائے تاکہ اس کی عادتیں نہ بگڑیں اور اسے اپنی اوقات یاد رہے اور وہ وہی کر رہی تھی جو ممی چاہتی تھیں۔

سکندر علی نے شادی سے پہلے دو تین بار اسے کچھ روپے دیے تھے مگر پھر انھوں نے اسے روپے نہیں دیے تھے۔ شاید وہ سوچتے ہوں گے کہ اب ذیشان اسے روپے دیتا ہوگا اور ذیشان نے شاید یہ سوچا ہوگا کہ اسے روپوں کی کیا ضرورت ہوگی، شاید اسے کبھی یہ خیال ہی نہیں آیا ہوگا کہ اسے اب مالی طور پر رومیصہ کو سپورٹ کرنا چاہیے اور رومیصہ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس سے روپے مانگتی۔ اسے لگتا تھا کہ اس نے شادی کر کے ہی اس پر بہت بڑا احسان کر دیا۔ اب وہ اور کیا مطالبہ کرے۔ جب تک نبیل زندہ تھا، اسے کبھی روپے مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ نہ صرف وہ اس کے اکاؤنٹ میں ہر ماہ روپے جمع کرواتا تھا بلکہ اس کی دراز میں بھی وقتاً فوقتاً روپے رکھتا رہتا تھا۔ اور اب اس کے پاس اتنے روپے نہیں ہوتے تھے کہ وہ ماہم کے لیے دودھ کا ایک ڈبہ ہی خرید لے۔

پھر بھی اسے کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اب اسے اتنی فرصت بھی نہیں ملتی تھی کہ وہ نبیل کو یاد کرتی پھرے۔ صبح سے لے کر رات گئے تک وہ اتنی مصروف رہتی کہ جب رات کو سونے کے لیے لیٹتی تو چند منٹوں میں سو جاتی۔ کئی کئی دن اسے نبیل کا خیال ہی نہ آتا اور اگر کبھی آتا تو پھر سب کچھ یاد آتا۔ اس کی ہنسی، اس کی باتیں، اس کی آنکھیں، اس کے خواب، اس کی خواہشات، ہر چیز اور پھر جیسے ایک دھواں سا اس کے وجود کو اپنے حصار میں لے لیتا۔ ”اگر وہ نہ مرتا تو آج میں اور ماہم کہاں ہوتے، اگر وہ ہوتا تو زندگی کیسی ہوتی۔“ وہ سوچتی اور اس کی آنکھیں جلنے لگتیں۔

”تم اس قدر خوبصورت ہو رومی! کہ اگر کوئی تمھیں میری نظر سے دیکھے تو شاید کہہ دے کہ اب میں کچھ اور دیکھنا نہیں چاہتا۔“

بعض دفعہ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھتی تو نبیل کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگتی۔

"اور اب اگر تم مجھے دیکھو تو شاید کہو۔ میں دوبارہ تمھیں دیکھنا نہیں چاہتا۔"

وہ شیشے میں اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے سوچتی۔ جب خواب ٹوٹتے ہیں تو نہ چاند چہرے، چاند رہتے ہیں نہ ستارہ آنکھیں ستارہ زندگی بس تاریک آسمان بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

⁂

ماہم آہستہ آہستہ بڑی ہو رہی تھی اور سارا دن کمرے میں رہنے کی وجہ سے یہ ہوا تھا کہ جب بھی رومیصہ اس کو نیچے لے کر جاتی وہ حیرانی سے ہر چیز کو دیکھتی رہتی۔ گھر میں موجود دوسرے بچوں کو دیکھتی اور خوفزدہ ہو جاتی اور رومیصہ کو اس بات کا احساس بھی نہیں تھا کہ اس طرح سے اکیلے کمرے میں چھوڑ دینا اس کے ذہن کے لیے کتنا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ وہ چاہتی ہی یہی تھی کہ ماہم کسی کے پاس نہ جائے تاکہ کسی کو اس سے شکایت نہ ہو، نہ ہی وہ کوئی نقصان کرے۔

گھر میں موجود ستارہ کی دو بیٹیاں اور عالیہ کا بیٹا اور بیٹی ماہم کو دیکھتے تھے، مگر انھوں نے بھی کبھی اس کے پاس آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہاں گھر کے نوکر بعض دفعہ اسے اٹھا لیتے۔ قدرتی طور پر انھیں رومیصہ سے ہمدردی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ وہ بے شک سارا دن ان کے ساتھ کام کرتی رہتی ہے اور اس کا حلیہ بھی ان سے زیادہ مختلف نہیں ہے پھر بھی وہ ملازمہ نہیں تھی، صرف حالات کا شکار تھی۔

اس دن ذیشان گھر آیا ہوا تھا۔ ویک اینڈ تھا اور اگلی صبح جب وہ نیچے آنے لگی تو وہ ماہم کو بھی نیچے اٹھا لائی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ جاگ کر رونا شروع کرے اور ذیشان کو بھی جگا دے۔ اس نے کچن کے سامنے والی راہداری میں بٹھا دیا تھا۔ پھولوں کی ایک شاخ اس نے کھیلنے کے لیے اسے دی تھی۔ کافی دیر تک وہ اسی شاخ کے ساتھ کھیلتی رہی اور رومیصہ کچن میں دوسرے ملازموں کے ساتھ کام میں مصروف تھی۔

پھر پتا نہیں کب ماہم وہاں سے رینگتی ہوئی ہال میں چلی گئی تھی اور وہیں اس نے ٹیلی فون کے تار سے کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ عالیہ کا بیٹا سفیان باہر سائیکل چلا رہا تھا اور جب وہ سائیکل چھوڑ کر اندر آیا تو اس نے ماہم کو فون کا تار کھینچتے ہوئے دیکھا تھا۔ کچھ غصے میں وہ اس کے پاس آیا تھا۔ اور اس سے تار کھینچنے لگا جب سفیان اس کے ہاتھ سے تار نہیں چھڑا سکا تو جھنجھلاہٹ میں اس نے ماہم کو زور سے دھکا دیا تھا اور وہ منہ کے بل دیوار سے ٹکرائی تھی۔ ایک زور کی چیخ اس کے حلق سے نکلی تھی اور رومیصہ جس تک اس کے رونے کی آواز نہیں آئی تھی اس آواز پر چونک پڑی تھی اور جب اس نے کچن سے باہر آ کر دیکھا تو وہ دھک سے رہ گئی تھی وہ اپنی جگہ پر نہیں تھی اور اس کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی ہال میں گئی تھی۔

آٹھ سالہ سفیان اب فاتحانہ نظروں سے تار ہاتھ میں لیے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ زمین پر اوندھی پڑی ہوئی تھی وہ بھاگ کر اس کے پاس آئی تھی اور اسے سیدھا کرتے ہی اس کا سانس رک گیا تھا۔ اس کا منہ خون سے تر تھا۔ اس نے بنا سوچے سمجھے سفیان کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا اور وہ روتا ہوا وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ وہ اسے گود میں اٹھا کر واش روم میں لے آئی تھی اور وہاں اس نے اس کے ہونٹوں پر لگا ہوا خون صاف کرنا

شروع کیا تھا مگر صرف اس کے ہونٹ ہی زخمی نہیں تھے اس کے منہ کے اندر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے ماہم کا منہ کھول کر اندر دیکھنے کی کوشش کی تھی اور یک دم اس نے خود بھی پھوٹ کر رونا شروع کر دیا تھا۔

ماہم کے اوپر والے جبڑے میں صرف ایک دانت نکلا ہوا تھا اور اب وہ بھی معمولی سے گوشت کے ساتھ لٹک رہا تھا اور جس جگہ پہلے دانت تھا وہاں سے بے تحاشا خون نکل رہا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ اس لٹکتے ہوئے دانت کو کھینچ کر الگ کر دیتی یا خون روکنے کی کوشش کرتی۔ وہ روتی ہوئی ماہم کو لے کر واش روم سے باہر نکل آئی تھی، وہ ماہم کا اکلوتا دانت تھا۔ اور جب یہ دانت نکلنا شروع ہوا تھا تو وہ بے تحاشا خوش ہوئی تھی۔ وہ روز کتنی بار اس دودھیا دھبے کو دیکھتی اور اس کے لیے وہ چاند ہی کی طرح تھا اور اب جب دانت مکمل ہوا تھا جیسے اسے دنیا کی ساری دولت مل گئی ہو۔ اس کے دانت کو دیکھنا اسے چھونا اور ہنسنا ان دنوں اس کی واحد تفریح تھی اور اب وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔

وہ اوپر جانے والی سیڑھیوں میں اسے لے کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے سینے سے لپٹائے چپ کروانے کے بجائے وہ خود بھی بلک بلک کر رو رہی تھی چند لمحوں بعد قدموں کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ نائٹ گاؤن میں ملبوس عالیہ اس کے سر پر کھڑی شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ شاید سفیان اسے نیند سے اٹھا کر لایا تھا۔ اس لیے وہ بالکل آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ وہ جب بولنا شروع ہوئی تھی تو بولتی ہی چلی گئی تھی۔ اس نے روتی ہوئی ماہم کو دیکھا تھا نہ رومیصہ کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو۔ بس وہ بلند آواز میں دھاڑتی رہی تھی۔ گھر کے سارے ملازم ایک ایک کر کے وہاں آ گئے تھے۔ اس نے کوئی وضاحت پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس میں بات کی ہمت ہی نہیں تھی۔ تھوڑی دیر میں ممی بھی وہاں پہنچ گئی تھیں اور جو کسر رہ گئی تھی انھوں نے پوری کر دی تھی۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ رومیصہ کو بچی سمیت دھکے دے کر باہر نکال دیتیں۔

شور کی آواز پر گھر کے مردوں میں سب سے پہلے باہر نکلنے والا ذیشان تھا۔ اس کی آنکھ بھی انھیں آوازوں سے کھلی تھی۔ کمرے سے باہر نکل کر اس نے نیچے ہال میں جھانکا تھا اور سیڑھیوں میں ماہم کو لیے بیٹھی ہوئی رومیصہ کو دیکھا تھا اور ہال میں ہی اس نے عالیہ اور ممی کو چنگھاڑتے سنا تھا۔ گھر کے نوکروں کا جھمگھٹا بھی اس نے دیکھ لیا تھا۔ جھگڑا کس بات کا ہے وہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کیونکہ اس وقت عالیہ اور ممی رومیصہ کے خاندان کے قصیدے پڑھنے میں مصروف تھیں۔ وہ بڑی خاموشی سے ریلنگ کے پاس کھڑا بازو لپیٹے ہوئے یہ سب دیکھتا رہا۔ اس نے مداخلت کی کوشش نہیں کی تھی۔

کافی دیر تک گرجنے برسنے کے بعد ممی اور عالیہ وہاں سے چلی گئی تھیں اور نوکر بھی وہاں سے غائب ہو گئے تھے۔ ماہم کے رونے کی آواز ابھی تک آ رہی تھی اور رونے سے زیادہ اب وہ کراہ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا تھا۔ قدموں کی آواز پر اس نے جھکے ہوئے سر کو اٹھایا تھا۔ ماہم کو ابھی بھی اس نے سینے سے لگایا ہوا تھا۔ ذیشان نے اس کی سوجی ہوئی آنکھوں میں عجیب سی وحشت دیکھی تھی۔

''کیا ہوا ہے؟'' وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ صرف ماہم کو ہال کے فرش پر اچھال دیا تھا اور تقریباً بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی، اگر ہال میں فرش پر کارپٹ نہ ہوتا تو جتنی شدت سے اس نے ماہم کو پٹخا تھا ضرور اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ جاتی مگر چوٹ اسے اب بھی لگی تھی کچھ دیر تک وہ بے حس و حرکت وہیں پڑی رہی پھر وہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگی تھی۔

ذیشان جو بھونچکا کھڑا تھا وہ بے اختیار اس کی طرف آیا تھا۔ اور پہلی دفعہ خون سے لتھڑے ہوئے ہونٹ اس کی نظر میں آئے تھے اور جب اس نے اس کے منہ کے اندر جھانکا تو وہ اٹکا ہوا دانت بھی اس کی نظر میں آ گیا تھا۔ اس کے دل کو بے اختیار کچھ ہونے لگا تھا۔ وہ اسے کندھے سے لگائے ہوئے اوپر کمرے میں گیا تھا۔ رومیصہ وہاں نہیں تھی اور ڈریسنگ روم کا دروازہ بند تھا۔ اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل سے اپنی گاڑی کی چابی اٹھائی اور نیچے آ گیا۔

آواز دے کر اس نے خانساماں کی بیوی کو بلوایا تھا اور ماہم کو اسے تھما کر اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہہ کر وہ گاڑی کے پاس آ گیا۔ ہاسپٹل جا کر اس نے ڈاکٹر سے یہ کہا تھا کہ وہ سیڑھیوں سے گر گئی ہے اور پھر اس کے ایکسرے کروائے تھے۔ رومیصہ کے پھینکنے کی وجہ سے اس کے دائیں کندھے کی ہڈی کو ہلکی سی ضرب آ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کا دانت نکال دیا تھا اور خون روکنے کے لیے وہ برف کو استعمال کرتا رہا۔ وہ خاموشی سے پورا عمل دیکھتا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے ایک انجکشن دیا تھا اور ایک دو سیرپ لکھ دیے تھے۔

واپسی پر اس نے خانساماں کی بیوی سے اس کے زخمی ہونے کی داستان بھی سن لی تھی۔ ماہم اس قدر تھک چکی تھی یا پھر اس انجکشن کے زیر اثر تھی کہ گھر واپس آنے تک وہ سو چکی تھی۔ وہ جب تک گاڑی لاک کر کے اوپر پہنچا تھا تب تک خانساماں کی بیوی اسے کمرے میں پہنچا چکی تھی، اور جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس نے رومیصہ کو اس کے پاس کھڑے دیکھا تھا۔ اس نے سیرپ اور کار کی چابی ٹیبل پر رکھ دی اور شوز اتار کر پھر لیٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ آنکھیں بند کرتا۔ وہ یک دم اس کی طرف پلٹی تھی۔

''دوبارہ دانت نکل آئے گا نا؟'' اس نے پوچھا تھا اور اس کے چہرے پر پتا نہیں کیا تھا کہ وہ زیادہ دیر اسے نہیں دیکھ پایا۔

''ہاں۔'' بہت دھیمی آواز میں اس نے کہا تھا۔

''کب؟'' وہ پتا نہیں کون سی تسلی چاہتی تھی۔

''بہت جلدی۔'' اس بار بھی اس کا جواب مختصر تھا۔ وہ دوبارہ ماہم کے کاٹ کی طرف پلٹ گئی تھی وہ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر بری طرح ناکام رہا۔ ایک عجیب سی شرمندگی اور خجالت اسے گھیرے ہوئے تھی۔

''اگر نبیل ہوتا اور یہ سب کچھ اس کے سامنے ہوا ہوتا تو اس وقت گھر میں طوفان آ چکا ہوتا۔''

وہ آنکھیں بند کیے سوچ رہا تھا۔ وہ بڑی دیر تک آنکھیں بند کیے سوچتا رہا۔

''نبیل ہاں نبیل کیا کرتا؟ مگر میں نبیل نہیں ہوں اور پھر میں جو کر سکتا تھا وہ کر چکا ہوں اب اور کیا کروں؟''

وہ ان سب سوچوں سے جھنجلا گیا تھا اور اس نے انہیں ذہن سے جھٹک دیا کچھ دیر بعد وہ سونے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

اس وقت دوپہر کا وقت تھا جب وہ دوبارہ بیدار ہوا تھا۔ ایک عجیب سی تھکن اس کے اعصاب پر سوار تھی۔ سر جھٹکتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔ رومیصہ کمرے میں نہیں تھی۔ باتھ روم کی طرف بڑھتے بڑھتے پتا نہیں اس کے دل میں کیا آیا کہ وہ ماہم کی طرف بڑھ آیا۔ وہ ابھی بھی سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی عجیب سا تاسف اس کے دل میں پیدا ہوا تھا اس کے ہونٹ صبح سے زیادہ سوجے ہوئے تھے اور نیلگوں ہو رہے تھے،

کچھ دیر تک وہ اسے دیکھتا رہا پھر وہ سر جھکا کر باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ اس دن ان دونوں کے درمیان مزید گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ رات کو وہ واپس شیخوپورہ چلا گیا تھا۔

....

رومیصہ اس واقعہ کے بعد پہلے سے زیادہ محتاط ہوگئی تھی اب وہ اسے بالکل ہی نیچے نہیں لاتی تھی اور اگر لاتی بھی تو اسے اپنی نظروں کے سامنے رکھتی۔ آہستہ آہستہ ماہم کے زخم مندمل ہوتے گئے تھے اور اس کے ہونٹ پہلے کی طرح ہوگئے تھے۔ مگر وہ اس واقعے سے بہت ڈر گئی تھی وہ سمجھ تو نہیں پائی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے اور کیوں ہوا ہے مگر اس کے لیے جو واحد احساس تھا وہ درد اور تکلیف کا تھا اور اس تکلیف نے اسے بے تحاشا خوفزدہ کر دیا تھا۔ رومیصہ رات کو جب اوپر جاتی تو بعض دفعہ وہ جاگ جاتی اور پھر رومیصہ اسے گود میں لے کر ٹیرس پر ٹہلتی رہتی اس سے باتیں کرتی۔ وہ نبیل سے بے حد مشابہت رکھتی تھی اور رومیصہ بعض دفعہ بہت دیر تک اس کا چہرہ دیکھتی رہتی۔

وہ اس رات بھی اسے لے کر ٹیرس پر پھرتی رہی تھی۔ پھر جب ماہم اونگھنے لگی تو وہ اسے لے کر اندر آ گئی۔ اس نے اسے کاٹ میں لٹانے کے بجائے اپنے پاس بیڈ پر لٹا لیا تھا۔ وہ خود بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ لیکن پتا نہیں کیوں وہ اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ اور اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پھر اچانک کسی کے قدموں کی آواز اسے سنائی دی تھی کوئی اس کے دروازے کے سامنے سے گزر کر آگے گیا تھا اور آگے والے کمرے کا دروازہ بجانے لگا تھا۔ دستک کی آواز میں عجیب سی بوکھلاہٹ تھی جیسے کوئی بہت تیزی میں ہو۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک عجیب سے خوف نے اس کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دستک کی آواز اب بند ہوگئی تھی اور تھوڑی دیر بعد ایک بار پھر کوئی اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے سے گزرا تھا۔ وہ سانس روکے باہر سے ابھرنے والی آوازوں کو سنتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد کوئی دو افراد ایک بار پھر بڑی تیزی سے اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے سے گزرے تھے۔

''یہ یقیناً اشعر اور سارہ ہوں گے۔ اس نے اندازہ لگایا تھا۔ مگر یہ اس وقت نیچے کیوں گئے ہیں؟'' اس کی بے چینی میں اور اضافہ ہوگیا تھا۔ کچھ دیر بعد نیچے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تھی۔ پھر ایک اور گاڑی اسٹارٹ ہوئی تھی وہ بے اختیار بیڈ سے اٹھ کر دروازہ کھول کر باہر آ گئی تھی۔ ہال کی ساری لائٹس آن تھیں۔ اس نے نیچے جھانکا۔ ہال میں کوئی نہیں تھا، گھر میں خاموشی طاری تھی۔ وہ تیز قدموں سے نیچے آئی اور پھر بیرونی دروازے کی طرف آ گئی۔ ایک ملازم ستے ہوئے چہرے کے ساتھ اندر آ رہا تھا۔ شاید وہ دروازہ بند کرنے گیا تھا۔ ''غفور! یہ سب کہاں گئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ذیشان صاحب کو کسی نے گولیاں ماردی ہیں۔ ابھی فون آیا تھا انہیں لاہور لائے ہیں مگر ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے نظر چراتے ہوئے کہا تھا۔ وہ جیسے برف بن گئی تھی۔

''کیا ایک بار پھر......؟'' وہ آگے نہیں سوچ سکی تھی اپنے وجود کو بمشکل گھسیٹتے ہوئے وہ اوپر کمرے میں آ گئی تھی۔

''میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ صرف میرے ساتھ ہی کیوں؟ کیا دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔'' وہ سوچ رہی تھی اور گم صم سی بیڈ پر

سوتی ہوئی ماہم کو دیکھتی جا رہی تھی۔

''اب کیا ہوگا؟ میں کیا کروں؟ ہر سوال ایک راستہ تھا ہر راستہ جیسے بند ہوتا جا رہا تھا۔ کسی نے مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ مجھے ساتھ لے لیتا۔ مجھے بتا دیا جاتا۔ کیا میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔

''اس کی افسردگی بڑھتی جا رہی تھی۔ کمرے میں یک دم بے حد گھٹن ہو گئی تھی وہ اٹھ کر باہر ٹیرس پر آ کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

وہ بہت کچھ سوچتی رہی تھی اپنا ماضی، حال، مستقبل سب بدصورت تھا سب بھیانک تھا کہیں پر کوئی رنگ نہیں تھا کہیں پھر کوئی روشنی نہیں تھی وہ خاموشی سے اندر کے سناٹے کو سنتی رہی۔ محسوس کرتی رہی۔ پتا نہیں کتنی دیر وہ اسی طرح بیٹھی رہی تھی۔ آسمان آہستہ آہستہ رنگ بدلنے لگا تھا۔ پرندوں نے چہچہانا شروع کر دیا تھا وہ وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ کمرے میں آنے کے بعد وہ زیادہ دیر وہاں نہیں رہ سکی اور نیچے آ گئی۔ گھر میں نوکروں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ ہر ایک اس حادثے سے باخبر تھا۔ ہر ایک کی آنکھوں میں اس کے لیے ترحم تھا۔

وہ ہال کے ایک صوفے پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ نو بجے اشعر اور احمر اپنی بیویوں اور فاخرہ کے ساتھ گھر آ گئے تھے۔ ممی کی آنکھیں سوجی ہوئیں تھیں۔ وہ حلق میں اٹکے ہوئے سانس کے ساتھ ان کے سامنے گئی تھی۔ ممی اسے دیکھتے ہی چلانا شروع ہو گئی تھیں۔

''یہ سب اس کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ یہ مار ڈالے گی، یہ کھا جائے گی ہر ایک کو کھا جائے گی اسے نکالو۔ اسے یہاں سے نکالو۔''

اسے برا نہیں لگا۔ کوئی لفظ برا نہیں لگا۔ انھوں نے کچھ کہا تھا اسے کچھ کہا تو تھا۔ ستارہ اور عالیہ انھیں زبردستی بیڈروم میں لے گئی تھیں۔

''ذیشان کیسے ہیں؟'' پتا نہیں اس نے کتنی مشکل سے پوچھا تھا۔ اشعر اپنے کمرے کی طرف جاتا جاتا رک گیا۔

''اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اسے تین گولیاں لگی ہیں ابھی آئی سی یو میں ہے۔'' وہ ستے ہوئے چہرے کے ساتھ اسے بتا کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

''مگر زندہ تو ہے بہر حال زندہ تو ہے۔'' ایک عجیب سا سکون ملا تھا اسے۔

وہ اس رات پیٹرولنگ پر تھا جب ایک ناکے پر ایک گاڑی رکے بغیر گزر گئی تھی تو اس نے موبائل میں پیچھے جانے کی کوشش کی تھی بار بار کی وارننگ کے بعد اس گاڑی کی اسپیڈ ہلکی ہونی شروع ہوئی تھی۔ موبائل میں اس سمیت بیٹھے ہوئے لوگ مطمئن تھے کہ وہ گاڑی کو روکنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ لیکن جب وہ اور دوسرے کانسٹیبل موبائل سے اترے تھے تو اس گاڑی سے یک دم فائرنگ شروع کر دی گئی تھی اسے دو گولیاں سینے میں لگی تھیں اور ایک ٹانگ میں لگی تھی ایک دو اور کانسٹیبل بھی بری طرح زخمی ہوئے تھے اور کچھ نے موبائل کے پیچھے چھپ کر خود کو بچایا تھا۔ بعد میں وہ ان لوگوں کو موبائل میں ڈال کر مقامی ہاسپٹل لائے تھے باقی دونوں کانسٹیبلز کو تو وہیں طبی امداد دی گئی تھی۔ لیکن اس کے زخم زیادہ گہرے اور خطرناک تھے اور وہ مسلسل غشی کی حالت میں تھا۔ تھوڑی بہ تطبی امداد دینے کے بعد ڈاکٹرز نے اسے لاہور لے جانے کے لیے کہا تھا اور اسے لاہور لایا گیا تھا۔

آپریشن سے تینوں گولیاں نکال دی گئی تھیں لیکن سینے میں لگی ہوئی دونوں گولیوں کے زخم بہت گہرے تھے اور ان سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ ایک ہفتے تک وہ اسی طرح نیم غشی کی حالت میں رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھلنے لگی تھی اور وہ ہوش میں آ گیا تھا۔

مزید ایک ہفتے کے بعد اسے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ پورا دن اسے کوئی نہ کوئی ملنے آتا رہتا کبھی کوئی آفیسر کبھی کوئی دوست اور کبھی گھر کے افراد۔ وہ بستر پر پڑے پڑے لوگوں کے تبصرے اور باتیں سن سن کر تنگ آ گیا تھا۔ اسے زندگی میں کبھی کوئی چھوٹی بڑی بیماری لاحق نہیں ہوئی تھی۔ اور اب جو مصیبت اس پر آئی تھی وہ اس کی برداشت سے باہر تھی۔ گھر والے روز آتے اسے تسلی دیتے اس کا حوصلہ بڑھاتے اور وہ خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھتا باتیں سنتا رہتا۔

چند ماہ وہ ہاسپٹل رہا تھا اور اس پورے ماہ میں رومیصہ ایک بار بھی اسے دیکھنے نہیں جا سکی تھی۔ کسی نے اسے ساتھ لے جانے کی آفر ہی نہیں کی تھی۔ حتیٰ کہ سکندر علی نے بھی نہیں ان کا رویہ بھی اس واقعہ کے بعد سے بے حد عجیب ہو گیا تھا۔ وہ حتیٰ الامکان اسے نظر انداز کرتے اور وہ بے حد حیران ہوتی وہ تو ایسے نہیں تھے انھیں کیا ہو گیا تھا۔

وہ ذیشان کو دیکھنے نہیں جا سکی اور ذیشان کو بھی اس کے آنے کا احساس نہیں ہوا۔ شاید اسے اس کی تسلیوں کی ضرورت ہی نہیں تھی ایک ماہ بعد وہ ضد کر کے گھر شفٹ ہوا تھا۔ ڈاکٹرز ابھی اسے ڈسچارج نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر وہ ہاسپٹل کے ماحول سے بیزار ہو چکا تھا، اس لیے ڈاکٹرز کو اس کی ضد کے سامنے سر جھکانا ہی پڑا۔

گھر آنے کے بعد رومیصہ نے پہلی بار اس کی خیریت دریافت کی تھی اور اس نے ''میں ٹھیک ہوں'' کہہ کر آنکھیں موند لی تھیں، یعنی وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ مزید کچھ پوچھے اور رومیصہ کے پاس کچھ اور پوچھنے کے لیے الفاظ بھی نہیں تھے۔

وہ ہاسپٹل سے گھر آ کر پرسکون ہو گیا تھا۔ لوگ اب بھی اس کی خیریت دریافت کرنے آتے رہتے تھے مگر اب پہلے کی طرح ان کا ہجوم نہیں رہتا تھا۔

دو ہفتے تک تو گھر والے بھی دن میں دو تین مرتبہ اس کے پاس آتے تھے اور کافی دیر تک بیٹھے رہتے تھے مگر آہستہ آہستہ یہ دورانیہ کم ہوتا گیا۔ ہر چیز اپنی روٹین پر آتی جا رہی تھی۔ سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوتے جا رہے تھے۔ اب صرف سکندر علی اور فاخرہ تھے جو روز

کچھ دیر کے لیے اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ باقی لوگ ایک دو دن بعد کھڑے کھڑے آ کر اس کا حال پوچھتے اور چلے جاتے۔ رومیصہ بھی ماہم کو ساتھ لے کر سارا دن نیچے کام میں مصروف رہتی تھی۔ وہ بھی صرف اس وقت آتی تھی جب ذیشان کے کھانے کا وقت ہوتا یا اسے دوا دینی ہوتی یا پھر ماہم کو سونا ہوتا ورنہ وہ بھی نیچے ہی رہتی تھی۔

وہ سارا دن کمرے میں اکیلا پڑا رہتا۔ ٹانگ میں زخم گہرا نہیں تھا وہ سہارا لے کر چل سکتا تھا لیکن وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے نہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی زیادہ دیر بیٹھ سکتا تھا۔ کبھی وہ ٹیرس پر کچھ دیر کے لیے چلا جاتا مگر زیادہ تر وہ تکیوں کے سہارے بیڈ پر نیم دراز ٹی وی کے چینل بدلتا رہتا تھا اخبار دیکھتا رہتا۔ لیکن صبح سے لے کر شام تک کی تنہائی نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

ڈاکٹر نے ابھی دو ماہ تک اسے آرام کرنے کے لیے کہا تھا اور وہ بے حد چڑچڑا ہو گیا تھا۔ معمولی سی بات اس کے مزاج کے خلاف ہو جاتی تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔ جب وہ بولنے پر آتا تو بولتا ہی چلا جاتا اور بعض دفعہ خاموش ہوتا تو سارا دن ایک لفظ بھی نہ کہتا۔

⁂

اس دن بھی وہ اس کا ناشتہ لے کر آئی تھی۔ اس کے بیڈ کے پاس ٹیبل پر چیزیں رکھنے کے بعد وہ کسی کام سے ڈریسنگ روم میں چلی گئی تھی۔ ذیشان نے بے دلی سے ٹیبل پر نظریں دوڑائی تھیں۔ وہ چیزیں جو وہ روز کھاتا تھا۔ آج بھی اس کے سامنے تھیں۔ فرائیڈ انڈے، بوائلڈ انڈے، بریڈ، سوپ، جیم، کوئی بھی نئی چیز نہیں تھی۔ بے دلی سے اس نے ناشتہ شروع کیا تھا۔

وہ سر جھکائے دل پر جبر کیے ہوئے ٹیبل پر جھکے چمچ سے سوپ پی رہا تھا جب اچانک ایک ننھا سا ہاتھ اس کے سامنے آ گیا تھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ ٹیبل کو ایک ہاتھ سے تھامے دوسرا ہاتھ اس کے سامنے پھیلائے ماہم کھڑی تھی۔ وہ اپنی موٹی کالی گہری آنکھیں اس پر جمائے ہوئے تھی۔ پتا نہیں کس وقت وہ رینگتے رینگتے وہاں آ گئی تھی۔ اس نے کچھ ناگواری سے سر جھکا لیا مگر ہاتھ اب بھی اس کے سامنے تھا۔ مطالبہ واضح تھا۔ وہ کچھ کھانے کو مانگ رہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر ڈریسنگ روم کی طرف دیکھا۔ رومیصہ ابھی بھی باہر نہیں آئی تھی۔ کچھ سوچ کر اس نے ٹیبل پر نظر دوڑائی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے کیا دے۔ پھر اس نے ابلے ہوئے انڈے کا ایک ٹکڑا کچھ جھجکتے ہوئے اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اب وہاں سے چلی جائے گی مگر جانے کی بجائے وہ وہیں کھڑی ہو کر انڈا کھانے لگی، وہ آرام سے ناشتہ نہیں کر پا رہا تھا۔ کن اکھیوں سے وہ اسے انڈا کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہاں بلا کا سکون تھا۔

چند لمحوں کے بعد ہاتھ پھر اس کے سامنے تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اس بار بریڈ کا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ رومیصہ اسی وقت ڈریسنگ روم سے باہر آئی تھی اور ماہم کو اس کے پاس کھڑے دیکھ کر وہ کچھ گھبرا گئی تھی۔ تیزی سے اس کے پاس آ کر اس نے ماہم کو اٹھا لیا تھا اور پیشتر اس کے کہ وہ بریڈ کے پیس کو منہ میں ڈالتی اس نے اس کے ہاتھ سے وہ پیس لے کر پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔ پھر اسے لے کر وہ اسی تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں لیکن اس کی یہ حرکت اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے اس نے بریڈ کا پیس پلیٹ میں نہیں رکھا۔ ڈسٹ بن میں پھینک دیا ہے۔ اس کی تنہائی کا احساس اور بڑھ گیا تھا۔

دوپہر تک وہ ننھا سا ہاتھ بار باراس کے سامنے آتا رہا۔ دوپہر کو رومیصہ ماہم کو سلانے کے لیے لائی تھی۔ اسے کاٹ میں لٹانے کے بعد وہ حسب معمول اس کا لنچ لے کر آئی تھی۔ پھر وہ نیچے چلی گئی تھی۔ ماہم سونے کے بجائے کاٹ کو پکڑ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔ رومیصہ اسے تھپک کر چلی جاتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد وہ کاٹ کو پکڑ کر کھڑی ہو جاتی۔ منہ سے آوازیں نکالتی اور پھر خود ہی تھک کر بیٹھتی اور سو جاتی۔

اس سے پہلے ذیشان نے کبھی اس پر دھیان نہیں دیا تھا۔ مگر آج جب ماہم کھڑی ہوئی تھی تو وہ اسے دیکھنے لگا تھا۔ وہ بھی اس کی طرف متوجہ تھی۔ وہ لنچ سامنے رکھے گردن موڑے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے لنچ پر نظر دوڑائی تھی۔ وہی لنچ تھا جو روز ہوتا تھا۔ سوپ، بریڈ، کالی مرچ میں پکی ہوئی سبزی، سلاد، دہی، پھل وہ کچھ دیر ان چیزوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے بریڈ کا ایک پیس لیا تھا اور ماہم کے پاس چلا گیا تھا اس نے حیرانی سے اسے اپنے پاس آتے دیکھا تھا۔

ذیشان نے بریڈ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ اس نے ایک قلقاری ماری تھی اور پیس پکڑ لیا تھا۔ ذیشان کو ایک عجیب سا فخر ہوا۔ لنچ کرتے ہوئے وہ وقتاً فوقتاً اسے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ کھا رہی تھی کچھ نیچے پھینک رہی تھی۔ مگر وہ خوش تھی۔ لنچ کرنے کے بعد ذیشان اٹھ کر اس کے پاس آ گیا اور اس نے ٹشو سے۔ اس کے ہاتھ اور منہ صاف کیا اور بڑی احتیاط سے کارپٹ پر گرے ہوئے بریڈ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو کافی تکلیف برداشت کرتے ہوئے اٹھایا اور ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ پتا نہیں کیوں لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ رومیصہ کو یہ سب پتا چلے۔ رومیصہ کچھ دیر کے بعد برتن اٹھانے آئی تھی اور تب تک وہ بیڈ پر دراز ہو چکا تھا۔ اس نے جاگتی ہوئی ماہم کو ایک بار پھر لٹا کر تھپکا تھا اور برتن لے کر نیچے چلی گئی تھی۔

پھر روز یونہی ہونے لگا تھا۔ وہ لنچ میں اسے ضرور کچھ نہ کچھ کھلاتا کم از کم لنچ میں اسے تنہائی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ اس سے مانوس ہوتی گئی تھی۔ اب اگر وہ اسے کچھ نہ دیتا تو وہ خود زور زور سے آوازیں نکالتی اور چیخیں مار کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔

اس دن بھی وہ فرش پر رینگتے ہوئے ناشتے کے وقت اس کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ رومیصہ نے بال باندھتے ہوئے اسے اس کے پاس جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ذیشان کے پاس آ کر جب وہ اسے اٹھانے لگی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

''اسے رہنے دو یہیں پر۔'' اس کی طرف دیکھے بغیر اس نے کہا تھا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ کچھ دیر تک وہ کچھ نہیں بول پائی پھر اس نے کہا تھا۔

''مجھے اسے نیچے لے کر جانا ہے۔''

''تم جاؤ۔ اسے میرے پاس رہنے دو۔'' وہ اسے انڈے کا ایک ٹکڑا تھماتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ بے حد حیرانی کے عالم میں نیچے آئی تھی۔

***

بہت آہستہ آہستہ ہی سہی مگر اس کے وجود پر جمی برف پگھلنے لگی تھی۔ وہ ماہم سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ اس وہ ماہم کو اپنے پاس ہی بٹھا کر کھانا کھلایا کرتا تھا۔ یہ اس کی سب سے بڑی تفریح تھی۔ بعض دفعہ وہ اسے کیلا چھیل کر تھما دیتا اور وہ خود کھاتی پھر اس کے منہ کی طرف بڑھا دیتی۔ وہ تھوڑا سا کھاتا پھر وہ خود کھاتی پھر اس کی طرف بڑھا دیتی یہ جیسے اس کے لیے کوئی دلچسپ کھیل تھا۔ اب وہ تقریباً سارا دن اس کے پاس ہی رہتی تھی اور بعض دفعہ وہ اس کی گود میں بھی آ جاتی۔

پہلے پہل جب اس نے اس کی گود میں چڑھنے کی کوشش کی تھی تو اسے بے حد عجیب لگا تھا۔ مگر وہ اس طرح اس کا کندھا پکڑے اس کی گود میں آنے کی جدوجہد کر رہی تھی کہ وہ اسے روک نہیں سکا اور پھر تو جیسے یہ روٹین ہو گئی تھی وہ اس کے پاس آ کر پہلے کی طرح کھڑے ہونے یا بیٹھنے کے بجائے اس کی گود میں آنا چاہتی تھی اور وہ اس کو اٹھا لیا کرتا تھا حالانکہ اسے گود میں اٹھانے کی وجہ سے بعض دفعہ اس کے زخموں میں تکلیف شروع ہو جاتی تھی۔

پھر پہلی دفعہ اسے محسوس ہوا تھا کہ ماہم کے پاس کوئی کھلونا نہیں ہے۔ اس نے رومیصہ سے اس بارے میں پوچھا تھا اور وہ ٹال گئی تھی۔ مگر اس کے بار بار اصرار پر اس نے کہہ دیا تھا۔

''کھلونے خریدنے کے لیے روپوں کی ضرورت ہوتی ہے۔'' وہ اس کی بات پر کچھ دیر تک اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

''نبیل نے حق مہر میں جو پانچ لاکھ روپے تمہیں دیے تھے وہ کہاں ہیں؟''

''وہ ممی کے پاس ہیں۔''

وہ اس کے جواب پر حیران ہو گیا۔ ''ممی کے پاس کیوں ہیں؟''

''نبیل کی موت کے بعد گھر سے مجھے نکالنے سے پہلے ممی نے ساری چیزیں لے لی تھیں۔'' وہ اس کی بات پر خاموش ہو گیا۔

''تمہارے پاس روپے نہیں ہوتے تھے تو تمہیں مجھ سے کہنا چاہیے تھا۔'' کچھ دیر کے بعد اس نے کہا تھا۔

''مجھے کبھی روپوں کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔'' پتا نہیں اس کے لہجے میں کیا تھا کہ وہ قدرے بے چین ہو گیا۔

کچھ دیر بعد اٹھ کر وہ اندر ڈریسنگ روم میں گیا تھا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کچھ رقم تھی۔ اس نے رومیصہ کے پاس بیڈ پر رکھ دی۔ وہ بیٹھے بیٹھے چونک گئی۔

''تم کل بازار جاؤ اور اپنے اور ماہم کے لیے کچھ چیزیں خرید لاؤ۔ میں ڈرائیور کو کہہ دوں گا۔'' وہ دوبارہ بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔

''لیکن مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کچھ بے قرار ہو کر کہا تھا۔

''ماہم کو تو ہے نا۔'' اس نے آنکھوں پر بازو رکھتے ہوئے کہا۔

وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

''تو اسے احساس ہو گیا ہے کہ ماہم کو بھی کسی چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے۔''

اگلے دن وہ بازار گئی تھی اور تقریباً ساری رقم خرچ کر آئی تھی جو جو چیز وہ ماہم کے لیے خریدنے کے خواب دیکھتی تھی اس نے خریدی تھی اور وہ بے تحاشا خوش تھی۔ اس خوشی کو ذیشان نے بھی محسوس کیا تھا۔ جب وہ ماہم کے سامنے کھلونوں کا ڈھیر رکھ رہی تھی تو پہلی بار اس نے رومیصہ کو ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے زرد اور مرجھائے ہوئے چہرے پر ایک عجیب سی چمک تھی۔ وہ عجیب سا سکون محسوس کر رہا تھا۔

دن آہستہ آہستہ گزر رہے تھے اور بہت سی دیواریں گرتی جا رہی تھیں۔ ان دونوں کے درمیان چھوٹی موٹی گفتگو ہونے لگی تھی۔ کبھی موضوع گفتگو ماہم ہوتی اور کبھی وہ ویسے ہی بات کرتے جاتے۔ بعض دفعہ اسے حیرانی ہوتی۔

کیا یہ وہی ذیشان تھا جسے ماہم کی آواز تک ناپسند تھی؟ آخر اب ایسا کیا ہوا ہے؟

وہ سوچتی تبدیلی کیسے آئی تھی؟ کیوں آئی تھی اسے اس سے غرض نہیں تھی اس کے لیے تو یہی کافی تھا کہ بہرحال وہ بدل گیا تھا۔ اب کبھی کبھی جب وہ زیادہ تنہائی محسوس کرتا تو وہ رومیصہ کو اپنے پاس رہنے کے لیے کہتا۔

دو ماہ بعد جب وہ پہلی دفعہ واپس شیخوپورہ گیا تھا تو ایک عجیب سی اداسی تھی جو وہ دونوں محسوس کر رہے تھے۔ اس رات رومیصہ کو پہلی بار شدید قسم کی تنہائی کا احساس ہوا تھا پچھلے ڈھائی ماہ سے وہ اس کمرے میں تھا۔ وہ دن میں کئی بار اس کو دیکھتی تھی۔ اس کی آواز سنتی تھی۔ اب یک دم وہ سب کچھ خواب کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ اس نے ذیشان سے کوئی توقعات وابستہ نہیں کی تھیں پھر بھی اسے خوف تھا کہ کہیں واپس جا کر وہ پھر پہلے کی طرح نہ ہو جائے۔ پتا نہیں کیوں لیکن اب نبیل کے بارے میں سوچنے سے وہ گھبرانے لگی تھی۔ وہ اس کی کوئی بات یاد نہیں رکھنا چاہتی تھی وہ ان چار ماہ کو اپنے ذہن سے نکال دینا چاہتی تھی۔

تنہائی کا احساس صرف اسے ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ذیشان بھی اتنا ہی بے چین تھا۔ رات کو سونے سے پہلے بار بار ماہم کی آوازیں اس کے کانوں میں گونجتی رہتی۔ رومیصہ سے اسے محبت نہیں تھی مگر ماہم سے تھی کیوں تھی؟ وہ وجہ نہیں جانتا تھا شاید اس لیے کہ وہ اس کی تنہائی کی ساتھی تھی۔ یا شاید اس لیے کہ وہ نبیل کی بیٹی تھی اور نبیل وہ تھا۔ جو اس کا ہم راز تھا۔ جو اس کی خوبیوں، خامیوں سے واقف تھا۔ جس نے زندگی میں بہت دفعہ اس کی مدد کی تھی اس کا ہاتھ تھاما تھا بعض باتوں کے بارے میں سوچنے میں جتنا وقت لگتا ہے فیصلہ کرنے میں اتنا وقت نہیں لگتا تھا۔

❁

''آپ کو اعتراض کس بات پر ہے، اگر میں ان دونوں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں؟''

وہ ویک اینڈ پر گھر آیا تھا اور جب اس نے فاخرہ اور سکندر علی سے رومیصہ اور ماہم کو ساتھ لے جانے کی بات کی تھی تو دونوں نے شدید مخالفت کی تھی۔ اسے فاخرہ کی مخالفت پر حیرانی نہیں ہوئی تھی مگر سکندر علی کے رویے پر وہ ضرور حیران تھا۔

''تم بے وقوف ہو، اسے ساتھ کیوں لے جانا چاہتے ہو۔ وہ یہیں ٹھیک ہے۔'' انھوں نے اس سے کہا تھا۔

''جب آپ کے کہنے پر شادی کر لی ہے تو پھر ساتھ لے جانے میں کیا حرج ہے؟''

''میں نے تمھیں صرف شادی کرنے کے لیے کہا تھا۔ یہ نہیں کہا کہ اسے ساتھ رکھو۔ تم کسی اچھی لڑکی سے دوسری شادی کروا سے اپنے ساتھ رکھو۔ رومیصہ اور ماہم یہیں رہ سکتے ہیں۔''

وہ بولتے جا رہے تھے، کہتے جا رہے تھے۔ ایک کے بعد ایک دلیل دے رہے تھے۔ اسے سمجھا رہے تھے کہ اس کا مستقبل کتنا تابناک ہے اس کے آگے ایک طویل سفر ہے۔ ساری زندگی وہ اپنے بھائی کی بیوہ اور بچی کے ساتھ تو نہیں گزار سکتا۔ اسے اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔ وہ ان کا

چہرہ دیکھتا جا رہا تھا۔

چہرے کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ راز ہوتے ہیں جب انھیں پڑھنے لگیں تو یوں لگتا ہے جیسے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں۔ دوسری دفعہ نظر ڈالیں تو دوبارہ شروع سے پڑھنا پڑتا ہے یوں جیسے کتاب کا ورق الٹ گیا ہو۔ اس نے بھی سکندر علی کے چہرے کی کتاب کے پلٹے ہوئے ورق کو دیکھا تھا۔ سیاق وسباق وہی تھا موضوع نیا تھا۔ وہ پرسکون انداز میں ان کی باتیں سنتا رہا جب انھیں یقین ہوگیا کہ وہ قائل ہو چکا ہے تو وہ بولنے لگا۔

''پاپا! میں آپ کو کبھی نہیں سمجھ سکا، نہ کبھی سمجھ سکوں گا، شاید وجہ یہ ہو کہ میں نے کبھی آپ کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بعض لوگوں کے نزدیک رشتوں سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا بعض کے نزدیک بہت سی چیزیں رشتوں سے بڑھ کر ہوتی ہیں آپ دوسری کیٹیگری میں آتے ہیں۔ جب آپ نے رومیصہ سے میری زبردستی شادی کروائی تھی تو میں آپ سے بے حد ناراض تھا۔ پھر بھی مجھے یوں لگتا تھا کہ کم از کم آپ رومیصہ اور ماہم کے ساتھ مخلص ہیں۔ ان کی بھلائی چاہتے ہیں۔ میرے حقوق ضرور غصب کر رہے ہیں مگر بہرحال کسی دوسرے کو اس کے حقوق سے بھی زیادہ دے رہے ہیں۔ مگر یہ میری غلط فہمی تھی۔ پچھلے ایک سال میں آپ کو جس طرح دیکھ رہا ہوں۔ وہ روپ بے حد حیران کن ہے۔ مجھے کہنے دیں پاپا! کہ بنیادی طور پر آپ ایک بے حد خود غرض انسان ہیں۔ آپ میں اور ممی میں پتا ہے کیا فرق ہے؟''

وہ دونوں رنگ بدلتے چہروں کے ساتھ گم صم اس کی باتیں سن رہے تھے۔

''آپ کو اپنے جذبات اور احساسات چھپانے میں کمال حاصل ہے۔ ممی کو یہ فن نہیں آتا۔ آپ ہر چیز پلان کر کے کرتے ہیں۔ ممی بغیر سوچے سمجھے۔ مقصد دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے اور نتیجہ بھی۔ آپ دوسرے کی زندگی تباہ کر دیتے ہیں بڑی خوبصورتی، بڑی ہوشیاری بڑی چالاکی سے۔ ممی نے رومیصہ سے نبیل کی دی ہوئی ہر چیز چھین لی۔ زیورات، فلیٹ کے کاغذات، حق مہر کے روپے ہر چیز، آپ نے اس سے بڑا کمال کیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں رومیصہ نبیل کے حصے کی جائیداد نہ مانگنے لگے آپ نے اسے مجھ سے بیاہ دیا۔ اس کے دو فائدے تھے۔ رومیصہ ساری عمر آپ کا احسان مانتی کبھی آپ کے سامنے اپنے حق کے لیے آواز نہ اٹھا سکتی، اور دوسرے یہ کہ اس کی بیٹی آرام سے یہاں پلتی رہتی جب بڑی ہوتی تو آپ تھوڑا بہت جہیز دے کر اپنی مرضی کے کسی گھرانے میں اس کی شادی کر دیتے۔ نبیل کی جائیداد آپ کے پاس ہی رہتی۔ میرا انتخاب آپ نے اس لیے کیا کیونکہ میرا نکاح ہو چکا تھا۔ آپ نے سوچا ہوگا کہ میں آرام سے یہ سب قبول کر لوں گا۔ یہ سوچ کر کہ نبیل میرا سب سے بہترین دوست تھا اور یہ سوچ کر کہ آپ یہ سب اس کی بیوی اور بچی کی بھلائی کے لیے کر رہے ہیں پھر دوسری طرف ایک اچھے خاندان کے ساتھ بھی میرا تعلق رہتا۔ ممی کی مس ہینڈلنگ کی وجہ سے ربیعہ اور میری طلاق ہوگئی آپ کی پلاننگ کچھ خراب ہوگئی۔ مگر آپ نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ میں رومیصہ کو بے حد ناپسند کرتا ہوں تو ضرور کسی اچھے خاندان میں دوسری شادی کر لوں گا۔ کتنی حیرانی کی بات ہے پاپا! میں آپ کا بیٹا ہوں پھر بھی یہ سب جاننے اور سمجھنے میں مجھے اتنا وقت لگ گیا۔ آپ کی پلاننگ میں میری ایک شادی تو کہیں بھی نہیں تھی نہ رومیصہ کا میرے ساتھ جانا تھا۔ مگر پاپا مجھے ان دونوں کو اپنے ساتھ ہی رکھنا ہے اور مجھے آپ دونوں سے ہر وہ چیز چاہیے جو کبھی نبیل کی ملکیت تھی یا جو کبھی رومیصہ کے پاس تھی۔ ان چیزوں پر آپ کا حق ہے نہ میرا نہ کسی اور کا۔ اگر کسی کا ان پر حق ہے تو ماہم کا یا پھر رومیصہ کا۔ میرا ارادہ اتنی لمبی چوڑی تقریر کا نہیں تھا مگر کیا کیا جائے بعض دفعہ بہت سی باتیں ان سے کہنا پڑتی ہیں

جن سے آپ کبھی ایک تلخ لفظ بھی نہیں کہنا چاہتے۔ میرے ساتھ آپ نے جو کیا میں آپ کو معاف کرتا ہوں اس کے باوجود کہ آپ دونوں نے مل کر مجھے منہ کے بل زمین پر گرایا ہے۔ آپ نے میری زندگی کا سب سے اہم فیصلہ آنکھیں بند کر کے کیا ہے۔ پھر بھی میں وہ سب بھلانے کی کوشش کروں گا۔ میں چاہتا ہوں آپ کسی دوسرے کی زندگی کے ساتھ نہ کھیلیں۔ کسی دوسرے کے بارے میں فیصلہ نہ کریں ماہم اور رومیصہ کے بارے میں تو بالکل بھی نہیں۔ اس لیے میں ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں، امید کرتا ہوں آپ میرے لیے واقعی دعا کریں گے۔''

انہیں بت بنا چھوڑ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ سکندر علی اور فاخرہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ شرمندگی اصلیت کھلنے پر تھی اس بات پر نہیں کہ وہ کیا تھے۔

❁

اس نے کھڑکی کھول دی۔ نرم بھیگی ہوئی ہوا سے اس کے بال اڑنے لگے تھے۔ بارش آہستہ آہستہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ کھڑکی سے باہر پھیلا دیے۔ بارش کی پھوار اس کے ہاتھوں کو بھگونے لگی تھی۔ پتہ نہیں کتنے عرصے بعد اس نے یوں بارش کو چھوا تھا۔ محسوس کیا تھا۔ اس نے گہرے سانس لینا شروع کر دیے۔

''سب کچھ کتنا خوبصورت لگ رہا ہے۔ بارش ہوا، پودے، پھول اور زندگی۔''

''مجھے زیادہ باتیں کرنا نہیں آتی ہیں نہ ہی مجھے یہ پتا ہے کہ کسی عورت کو اپنی بات کیسے سمجھائی جاتی ہے۔ پھر بھی میں کوشش کر رہا ہوں کہ تمہیں بتا سکوں کہ میں تمہارے ساتھ کیسی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔''

وہ کل شیخوپورہ آ گئے تھے اور رات کو اسی کھڑکی میں کھڑا وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

''میں نبیل جتنا خوبصورت نہیں ہوں۔ نہ ہی اتنا گلیمرس ہوں میں بہت سادہ ہوں اور مجھے خوبصورتی کے بجائے کوالٹیز زیادہ اٹریکٹ کرتی ہیں۔ میں جانتا ہوں نبیل تم سے بہت محبت کرتا تھا۔ شاید میں کبھی بھی تمہیں اتنی محبت نہ دے سکوں لیکن بہرحال میں تمہاری عزت ضرور کروں گا، میں نے تم سے کبھی نفرت نہیں کی۔ میرا ذہن صرف اس شاک کو قبول نہیں کر پا رہا تھا جو اس زبردستی کے رشتے نے مجھے پہنچایا تھا۔ بہرحال اب کوشش کر رہا ہوں کہ اس ذمہ داری کو نبھاؤں۔ ربیعہ سے مجھے محبت تھی، بے تحاشا نہیں مگر محبت تھی اور اب بھی ہے۔ میرے دل میں اس کے لیے بہت خاص فیلنگز تھیں شاید وہ میں کبھی بھی تمہارے لیے محسوس نہ کر پاؤں لیکن رومیصہ یہ دانستہ طور پر نہیں ہوگا میں ماضی پرست آدمی نہیں ہوں۔ کمپرومائز کر لیا کرتا ہوں اور ان پر کبھی پچھتاتا نہیں ہوں۔ مجھے لگتا ہے تمہارے ساتھ میری زندگی اچھی گزر جائے گی کیونکہ تم میں بہت سی کوالٹیز ہیں۔ بہت صبر ہے۔ برداشت ہے، حوصلہ ہے۔''

اب وہ کھڑکی سے ٹیک لگائے بازو سینے پر باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اتنی برداشت اور اتنا صبر ہے کہ جس نے تمہیں بے حد کمزور بنا دیا ہے۔ جیسی ستی ساوتری قسم کی بیویاں ہوتی ہیں، ویسی ہی ہو تم۔''

''کسی زمانے میں ایسی عورتوں کی بہت ڈیمانڈ ہوتی ہوگی۔ اب نہیں ہے۔ اپنے حق کے لیے بولنا چاہیے۔ نہ بولیں تو ہم صرف اپنے حق

سے محروم نہیں ہوتے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کو بھی ان کے حقوق سے محروم کر دیتے ہیں جیسے تم نے ماہم کو کر دیا تھا۔تمہارا کیا خیال تھا تم چپ رہو گی تو ایک دن دلوں میں اتر جاؤ گی۔ تمہارے صبر اور قربانی کو سب سراہیں گے۔تمہاری عظمت کے پورا زمانہ گیت گائے گا،نہیں رومیصہ !ایسا کبھی نہیں ہوتا کم از کم آج کے زمانہ میں نہیں۔ ہاں اچھی بات ہے، تھوڑی بہت برداشت اور صبر رکھنا مگر صرف تھوڑا بہت، زیادہ نہیں ورنہ دوسرے لوگ اسے آپ کی عادت اور مجبوری بنا دیتے ہیں۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں نبیل سکندر سے کبھی شادی نہ کرتا۔میرا خیال ہے تم اچھی طرح جانتی ہو گی کہ وہ ایک فلرٹ ہے ایسے بندے زیادہ اچھے شوہر ثابت نہیں ہوتے اور خاص طور پر تم جیسی لڑکیوں کے لیے جن کا تعلق مڈل کلاس فیملیز سے ہو اور جن کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو یہ زیادہ بہتر ہوتا اگر تم اپنی جیسی کسی مڈل کلاس فیملی میں شادی کر لیتیں۔ مگر تم نے بہت بڑا رسک لیا چلو میں فرض کر لیتا ہوں کہ تم اچھی زندگی گزارنا چاہتی تھیں اور یہ واحد راستہ تھا اور کون ہے جو اچھی زندگی نہیں گزارنا چاہتا ہر اچھے چانس کو Avail کرنا چاہیے تم نے بھی کیا۔''

وہ پرسکون انداز میں یوں بات کر رہا تھا جیسے اس کی نہیں کسی دوسری لڑکی کی داستان ہو، وہ نم آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں یہ سب میں نے بعد میں سوچا تھا۔'' دل نے اعتراف کیا تھا۔

''پھر نبیل کی ڈیتھ ہو گئی۔تم نے ممی کے کہنے پر سب کچھ ان کے حوالے کر دیا حالانکہ وہ سب کچھ تمہارا تھا کوئی تم سے کسی طرح بھی وہ سب کچھ چھین نہیں سکتا تھا تم نے خود کو ملازمہ بنا دیا کیوں؟ اس گھر کے باقی لوگوں جتنا حق تھا تمہارا، ہر چیز پر تم نے پاپا سے نبیل کی جائیداد کے بارے میں کیوں نہیں پوچھا؟ تمہیں پوچھنا چاہیے تھا۔وہ کسی طرح بھی تمہیں نبیل کے حصے سے بے دخل نہیں کر سکتے تھے لیکن تم نے کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی پھر مجھ سے شادی کا مسئلہ سامنے آ گیا تب بھی تم احتجاج یا اعتراض نہیں کر سکیں حالانکہ تمہیں کرنا چاہیے تھا۔پھر مجھ سے شادی کے بعد تم نے سوچا کہ میں نے تم پر بہت بڑا احساس کر دیا ہے اور تم ایک زر خرید غلام کی طرح میری خدمت کرتی رہی۔ ناز نخرے اٹھاتی رہیں تم یقین کرو رومیصہ !تمہاری کسی خدمت نے مجھے متاثر نہیں کیا۔آج کے مرد کو یہ خاموش آنسو اور بے لوث خدمت پسند نہیں آتی ہے اور میں آج کا مرد ہوں۔ پھر تم نے کبھی مجھ سے نہیں کہا کہ میں تمہیں اخراجات کے لیے روپے دوں آخر یہ شوہر کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ایسے مرد آج کی دنیا میں کم ہی ملتے ہوں گے جو بیوی کے مانگے بغیر بھی اس کی ہر خواہش اور ذمہ داری پوری کرتے رہیں۔ مرد سے روپے نہیں مانگو تو وہ کبھی نہیں دے گا اور یہ بات بھی اسے کبھی متاثر نہیں کرے گی کہ بیوی تو روپے بھی نہیں مانگتی، اس سے اچھی عورت دنیا میں کہاں ہے۔''

وہ اب کارپٹ کو دیکھنے لگی تھی۔

''ماہم تم سے زیادہ بہادر اور مضبوط ہے اور شاید سمجھدار بھی۔تم نے کبھی کوشش نہیں کی کہ اس سارے مسئلے پر مجھ سے بات کرو تا کہ سب کچھ ٹھیک ہو سکے لیکن ماہم نے مجھے اگنور نہیں کیا نہ مجھ سے خوفزدہ ہوئی۔''

وہ اس کا چہرہ دیکھنے پر مجبور ہو گئی کوئی ایسی ہی بات تھی اس میں۔

''میں کھانا کھاتا تھا وہ میرے پاس آ کر ہاتھ پھیلا دیتی مجھے اسے دینا ہی پڑتا تھا۔ میں نے اسے کبھی گود میں اٹھانے کی کوشش نہیں کی، مگر وہ میری گود میں آنا چاہتی تھی اور میری اجازت لینے کے بجائے وہ میری گود میں آ جاتی ہے، اس نے کبھی پروا نہیں کی کہ مجھے یہ اچھا لگتا ہے یا نہیں اس

کے نزدیک اہم بات یہ ہے کہ میری گود میں بیٹھنا اسے اچھا لگتا ہے۔ مجھے اس کے لیے بہر حال روپے خرچ کرنے پڑے کیونکہ اس کو بہت سی چیزوں کی ضرورت تھی اس نے مجھے پاپا کہنا شروع کر دیا اسے اس لفظ کا مطلب نہیں آتا لیکن مجھے آتا ہے اور ہر بار جب وہ پاپا کہتی ہے تو میری ذمہ داری میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ نبیل کی بیٹی ہے نا اسے اپنی بات منوانا اپنا حق لینا آتا ہے۔"

وہ اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی جس پر ایک عجیب سا رنگ تھا۔

"شاید موی نہ ہوتی تو۔" وہ بات کرتے کرتے رک گیا اور غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ "شاید آج میری بہت سی باتوں سے تمھیں تکلیف پہنچی ہوگی حالانکہ میں تمھیں تکلیف پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ سب میں تم سے آج پہلی اور آخری دفعہ کہہ رہا ہوں دوبارہ کبھی نہیں کہوں گا ہم اچھے دوستوں کی طرح زندگی گزاریں گے۔ تم جب چاہو مجھ سے نبیل کے بارے میں بات کر سکتی ہو۔ مجھے برا نہیں لگے گا۔ میں جانتا ہوں وہ تمہاری زندگی کا ایک حصہ تھا۔ ماہم جب بڑی ہوگی تو اس سے بھی نبیل کے بارے میں بات کر سکتی ہو مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

وہ نہیں جانتی، اسے کیا ہوا تھا بس وہ اٹھ کر اس کے پاس آ گئی تھی اور اس کے سینے سے سر لگا کر رونے لگی تھی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنے وجود کے گرد اس کے بازوؤں کی گرفت محسوس کی تھی۔

بارش آہستہ آہستہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ محل سے واپسی کا سفر آزادی کا سفر تھا۔ آزادی کے سفر کے بعد کہیں کوئی تھکن نہیں ہوتی۔ نبیل کی زندگی میں وہ ایک بڑے گھر کی چاہ میں آئی تھی۔ ذیشان کی زندگی میں وہ صرف ایک گھر کے لیے آئی تھی۔ وہ چار ماہ رہی تھی پھر کاش شروع ہو گئی تھی۔ وہ آسمان سے منہ کے بل نیچے گری تھی۔ ذیشان کے ساتھ وہ زمین پر رہی تھی۔ مگر قدم جما کر کھڑا ہونا سیکھ گئی تھی، ہر چیز دھل کر صاف نظر آنے لگی تھی۔ راستہ بھی، منزل بھی۔ اس نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر بازو پھیلا دیے تھے۔ دونوں ہاتھوں کی مٹھی بنا کر اس نے بارش کا پانی جمع کرنا شروع کر دیا۔

"لوگ کہتے ہیں سردیوں کی بارش بہت رلاتی ہے ایسا ہر بار تھوڑی ہوتا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

⁂

آؤ ہم پہلا قدم دھرتے ہیں

وہ آہستہ سے دروازہ بجا کر اس کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ وہ بیڈ کے پاس کرسی پر بیٹھا ہوا کچھ پیپرز دیکھ رہا تھا۔ وہ انھیں اس وقت اپنے کمرے میں آتے دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو وہ اپنی نانی کے کمرے میں امی کو سلام کر کے آیا تھا۔

''کیا بات ہے امی! آپ سوئی نہیں؟'' اس نے پوچھا تھا۔

امی کوئی جواب دیے بغیر اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

''کیا بات ہے امی؟'' اس نے پہلی بار ماں کا چہرہ غور سے دیکھا تھا۔ ان کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ شاید وہ روئی بھی تھیں۔ یہ چیز اس نے نانی کے کمرے میں نوٹ نہیں کی تھی اور یہ نوٹ کرتے ہی اس کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''امی! کیا ممانی سے کوئی جھگڑا ہوا ہے؟'' اس نے ماں کی خاموشی پر ایک اور سوال کیا تھا۔

''نہیں۔ کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ تم اس دن بات کر رہے تھے کہ کوئی گھر لے سکتے ہو۔ الگ رہنے کے لیے؟''

''ہاں تو؟' معیز نے کھوجتی ہوئی نظروں سے ماں کے چہرے کو دیکھا تھا۔

''تو پھر لے لو، میرا خیال ہے۔ اب ہمیں الگ ہی رہنا چاہیے اور پھر اس طرح تمھیں بھی سہولت ہو جائے گی۔'' ان کے لہجے میں عجیب سی شکست خوردگی تھی۔

''یہ اچانک آپ جانے پر راضی کیسے ہو گئی ہیں، پہلے تو آپ مان نہیں رہی تھیں۔''

وہ کچھ حیران ہوا تھا لیکن وہ جواب میں چپ سادھ کر رہ گئی تھیں۔ کیسے بتا دیتیں کہ آج بھائی کی باتوں نے کس طرح ان کا دل چیر کر رکھ دیا تھا۔

معیز دس سال کا تھا جب وہ بیوہ ہو کر بھائی کے در پر آ بیٹھی تھیں۔ ان کے تین بھائی تھے جو پہلے اکٹھے رہتے تھے اور بعد میں انھوں نے اپنے پورشن الگ کر لیے تھے۔ عدت کے پورا ہوتے ہی بھائی انھیں لینے آ پہنچے تھے۔ لیکن وہ معیز کو ساتھ نہیں لانا چاہتے تھے اور رابعہ معیز کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں اور ان کی یہ ضد ہی معیز کو ننھیال لانے کا سبب بنی تھی۔ وہ شادی کے پانچ سال بعد پیدا ہوا تھا اور ان کا اکلوتا بیٹا تھا ان کے شوہر ناصر مسقط میں کسی فرم میں انجینئر تھے اور وہ بھی اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ شادی کے پندرہ سال انھوں نے جیسے ایک مستقل بہار میں گزارے تھے۔ روپے پیسے کی ریل پیل تھی اور ساس سسر چاہنے والے تھے۔

معیز شادی کے پانچ سال بعد پیدا ہوا تھا اور جیسے منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا تھا۔ کون سا ناز نخرہ تھا جو اس کا نہیں اٹھایا گیا تھا۔ وہ صرف ماں باپ کا ہی نہیں بلکہ خالاؤں اور ماموؤں کا بھی چہیتا تھا اور ہوتا کیوں نہ اس وقت رابعہ کے پاس بے تحاشا روپیہ تھا جو وہ کھلے دل سے اپنے

بھانجے بھانجیوں پر لٹاتی تھیں۔ لاڈ پیار نے معیز کو اسی طرح بگاڑا تھا جس طرح اکلوتے بچے اکثر بگڑتے ہیں۔ وہ تعلیم میں اچھا تھا لیکن آؤٹ اسٹینڈنگ نہیں تھا اور ضد میں تو کوئی اس کا ثانی نہیں تھا جو بات ایک بار اس کے منہ سے نکل جاتی وہ جیسے پتھر پر لکیر ہو جاتی۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو سکتی تھی مگر وہ نہیں لیکن اس وقت کسی کو اس کے غصے اور ضد پر پریشانی ہوتی تھی۔ وہ لاکھوں کی جائیداد کا اکلوتا وارث تھا پھر کون تھا جو اس میں نقص نکالنے کی حماقت کرتا۔ ان ہی دنوں رابعہ نے اپنے چھوٹے بھائی کی بیٹی سعدیہ سے معیز کی نسبت طے کر دی تھی۔ دونوں خاندان اس رشتہ پر بہت خوش تھے۔

معیز اس وقت آٹھ سال کا تھا جب یہ ہولناک انکشاف ہوا تھا کہ ناصر کو پھیپھڑوں کا کینسر ہے۔ یہ تشخیص ہو جانے کے بعد انہیں ملازمت سے ریٹائر کر دیا گیا۔ رابعہ پر جیسے ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ انہیں ملازمت ختم ہونے کا افسوس نہیں تھا۔ انہیں تو صرف ناصر کی صحت یابی کی فکر تھی۔ ناصر کو ساتھ لیے وہ باہر کے ممالک میں علاج کے لیے پھرتی رہیں لیکن مختلف آپریشنز کے بعد بھی کینسر ختم نہیں ہوا بلکہ پھیلتا ہی چلا گیا۔ پھر ان ہی دنوں ایک ٹریفک حادثے میں ان کے سسر کا انتقال ہو گیا۔ رابعہ جیسے پھر دوراہے پر آن کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی ساس کے ساتھ مسقط سے پاکستان شفٹ ہو گئیں پھر معیز کو اپنی ساس کے پاس چھوڑ کر وہ ایک بار پھر ناصر کو علاج کی خاطر انگلینڈ لے گئی تھیں۔ روپیہ پانی کی طرح بہانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسقط کی طرح پاکستان میں موجود ان کی جائیداد بھی بک گئی۔ جو روپیہ اکٹھا کرنے میں ناصر اور ان کے باپ کو چالیس سال لگے تھے وہ صرف دو سال میں ختم ہو گئے تھے اور جب وہ دو سال ختم ہوئے تو ناصر بھی ختم ہو گئے تھے۔ رابعہ کے لیے مصیبتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کی ساس کو بھی اپنے بھائیوں کے پاس جانا پڑا اور ان کے بھائی معیز اور رابعہ کی ذمہ داری اٹھانے پر تیار نہیں تھے۔ رابعہ کی ساس بلکتے ہوئے انہیں چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔

سب کچھ بدل گیا ہے، کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا۔ بھائیوں کے پاس آ کر رابعہ کو پہلا احساس یہی ہوا تھا۔ وقت اور حالات کے بدلنے کے ساتھ ہی لوگ بھی بدل گئے تھے۔ وہی بھائی، بھابیاں جو انہیں بلانے کے لیے بار بار مسقط فون کیا کرتے تھے۔ اب انہیں گھر لانے کے بعد یہ طے کرنے میں مصروف تھے کہ وہ کس کے پاس رہیں گی اور انہیں خرچ کون دیا کرے گا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد انھوں نے رابعہ پر دوسری شادی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ لیکن صرف یہ ایک ایسی چیز تھی جس پر رابعہ کوئی دباؤ برداشت کرنے پر تیار نہیں ہوئی تھیں۔ ناصر ان کے لیے کیا تھے اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے سترہ سال وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کے بھائی یہ سمجھنے سے قاصر تھے رابعہ کی ضد کے سامنے وہ جھک تو گئے تھے مگر ان کے رویے روز بروز بد سے بدتر ہوتے گئے تھے۔ وہ کئی دن انہیں مخاطب نہ کرتے۔

بھابیاں جو بات بلاواسطہ نہیں کہتی تھیں، وہ بالواسطہ طور پر کہہ دیتی تھیں۔ ان کی ماں خود بھی بیٹوں اور بہوؤں کے رحم و کرم پر تھیں۔ وہ ہمیشہ انہیں صرف صبر کی تلقین کرتی تھیں۔

بہنیں وہ تھیں جو بھائیوں کے گھر آتیں تو کوشش کرتیں کہ رابعہ سے ملے بغیر ہی چلی جائیں کیونکہ رابعہ کے ساتھ زیادہ گرم جوشی برتنے کا مطلب یہ ہوتا کہ انہیں پہلے بھابیوں اور پھر بھائیوں کی بے رخی کا سامنا کرنا پڑتا، ویسے بھی وہ جس سوشل اسٹیٹس کی حامل تھیں، وہ متقاضی تھا کہ وہ صرف بھائیوں سے ہی میل جول رکھیں۔ رابعہ تو اب وہ اسٹیٹس کھو چکی تھیں اور دوبارہ اسے حاصل کرنے کا دور دور تک امکان نہیں تھا۔ لیکن جو بھی تھا۔

رابعہ کا حوصلہ اور صبر کمال کا تھا۔ انھوں نے کبھی کسی سے شکوہ نہیں کیا۔ ایک چپ کی مہر تھی جو انھوں نے اپنے ہونٹوں پر لگالی تھی۔ انھوں نے گھر کی پوری ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھالی تھی۔ ان کے بڑے بھائی کے گھر دو تین ملازم تھے اور وہی سارا کام لیا کرتی تھیں جیسے وہ اپنے بھائی کی ہاؤس کیپر ہوں۔ ان کی خدمت کے عوض انھیں رہائش اور تین وقت کا کھانا میسر تھا۔ ہر ماہ ان کو ایک بھائی ہزار روپے دے جاتا اور وہ انھیں ہزار روپوں میں اپنے اخراجات پورے کرنے کی کوشش کرتیں ان کے ذاتی اخراجات کچھ نہیں تھے۔ ہاں معیز کا خیال انھیں رکھنا پڑتا تھا۔ وہ اسی اسکول میں داخل تھا۔ جہاں ان کے بھائیوں کے بچے داخل تھے۔ اس میں ان کے بھائیوں کا کوئی کمال نہیں تھا۔ اپنی ساس کے ساتھ پاکستان شفٹ ہونے کے بعد انھوں نے خود ہی اسے اس اسکول میں داخل کروایا تھا کیونکہ تب ان کے پاس روپے کی کمی نہیں تھی۔ لیکن اب انھیں اس کی فیس اور دوسرے اخراجات پورے کرنے کے لیے جو جتن کرنے پڑتے تھے وہ ان کا دل ہی جانتا تھا۔ اتنی تعلیم یافتہ تو وہ تھیں نہیں کہ کوئی اچھی جاب کر سکتیں اور اگر تعلیم یافتہ ہوتیں بھی تب بھی ان کے بھائیوں کی غیرت کو یہ کہاں گوارا ہوتا کہ وہ کوئی جاب کریں۔ ایک سے بڑھ کر ایک امتحان انھیں درپیش تھا۔

اور ان ہی امتحانوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے پتا نہیں کب ان کی توجہ معیز سے ہٹ گئی تھی۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی بھابھی کا کوئی نہ کوئی کام کر رہی ہوتیں اور اس ساری جدوجہد کا یہ فائدہ ہوتا تھا کہ کوئی نہ کوئی ان کے اخراجات پورے کر ہی دیتا تھا۔ اسی بھاگ دوڑ میں انھیں پتا نہیں چلا کب معیز ذہنی طور پر بالغ ہو گیا۔ اس نے بلاشبہ باپ کی بیماری اور موت کو بے حد محسوس کیا تھا اور وہ بہت خاموش رہنے لگا تھا۔ شروع میں اسے ماموؤں کے گھر آ کر رہنا بہت اچھا لگا تھا کیونکہ اسے ہمیشہ سے یہاں آنا پسند تھا۔ کیونکہ یہاں اس کے ساتھ کھیلنے کے لیے بہت بچے ہوتے تھے اور پھر اس کے بہت ناز نخرے بھی اٹھائے جاتے تھے۔

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے پتا چل گیا تھا کہ پہلے اور اب کے رہنے میں بہت فرق تھا، اب اسے ڈانٹا جاتا تھا۔ اس کے کاموں میں روک ٹوک ہوتی تھی۔ شروع میں اس کے کزنز اس کے ساتھ بہت فرینک تھے لیکن اپنے ماں باپ کے بدلتے ہوئے رویوں کا اثر ان پر بھی ہوا تھا اور انھوں نے اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ پہلے پہل اسے یہ سب کچھ سمجھ میں نہیں آیا مگر پھر جب اس نے اس سب پر سوچنا شروع کیا تو آگہی کے نئے نئے در اس پر کھلتے چلے گئے۔ سارے فرق اس کی سمجھ میں آنے لگے تھے اور وہ جیسے شاک میں آتا چلا گیا تھا۔ بہت نامحسوس طور پر اس میں تبدیلی آنے لگی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنے کزنز کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دیا کیونکہ اب وہ خود کو ان کے برابر کا نہیں سمجھتا تھا۔ وہ پہلے والی ضد یکسر ختم ہو گئی تھی۔ اسے ماں کی بے توجہی کی شکایت بھی نہیں رہی تھی۔

وہ اسکول سے آ کر کسی کونے میں اپنا بیگ لے کر بیٹھ جاتا اور ہوم ورک کرتا رہتا، جب ہوم ورک ختم ہو جاتا تو پھر ڈرائنگ کرنے لگتا اور جب اس میں دلچسپی ختم ہو جاتی تو کوئی کتاب نکال کر پڑھنے لگتا، اسٹڈیز میں اب اس کے گریڈز بہت اچھے آنے لگے تھے۔ ہر بار اس کا رزلٹ کارڈ دیکھ کر رابعہ کا سیروں خون بڑھ جاتا۔ انھیں لگتا تھا کہ اس کو ڈاکٹر بنانے کا ان کا خواب پورا ہونے والا ہے۔

معیز کے مزاج میں ہونے والی تبدیلیوں کا احساس انھیں پہلی مرتبہ تب ہوا تھا۔ جب وہ ایک صبح اسے اتفاقاً ہی گاڑی تک چھوڑنے چلی گئی تھیں۔ وہ انھیں خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ان کے بھائی کے بچے ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ وہ بلا مقصد ہی کھڑی رہیں۔ پھر کچھ دیر بعد ان کے بھتیجے اور بھتیجیاں آ گئی تھیں۔

''تم آگے ہو کر بیٹھو، کھڑکی کے پاس میں بیٹھوں گی۔ میں تمھیں روز کہتا ہوں پھر تم پر اثر کیوں نہیں ہوتا۔''

ان کے سب سے چھوٹے بھتیجے نے آتے ہی بڑی بدتمیزی سے دروازہ کھول کر معیز کو جھڑکتے ہوئے کہا تھا۔ رابعہ ڈر گئی تھیں کہ معیز ابھی لڑنا شروع کر دے گا اور اسی خدشے کے پیش نظر وہ گاڑی کے پاس آ گئی تھیں مگر معیز بے حد خاموشی سے آگے سرک گیا تھا۔ ان کے سارے بھتیجے اور بھتیجیاں گاڑی میں سوار ہو گئی تھیں اور وہ ان کے درمیان سکڑا ہوا سر جھکائے بیٹھا تھا۔

گاڑی چل پڑی تھی اور رابعہ کے گال آنسوؤں سے بھیگنے لگے تھے۔ انھیں یاد تھا وہ ہمیشہ کھڑکی کے پاس ہی بیٹھتا تھا اور کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اسے وہاں سے ہٹا دیتا اور اب معیز کی اطاعت گزاری نے انھیں خوش کرنے کے بجائے ان کا دل چھید دیا تھا۔ جب ناصر زندہ تھے تو بعض دفعہ وہ معیز کی ضد اور غصے سے تنگ آ کر ہر ایک سے پوچھتی رہتیں کہ وہ اسے کیسے ٹھیک کریں اور اب جب ان کی مشکل حل ہو گئی تھی تو وہ رو رہی تھیں۔ اسی دن اسکول سے واپس آنے کے بعد وہ بہانے بہانے سے معیز کو پیار کرتی رہیں۔

معیز واقعی بدل گیا تھا۔ اس بات کا یقین انھیں تب ہوا تھا جب چند روز بعد ایک روز صبح اسکول جاتے ہوئے انھوں نے اسے پاکٹ منی دینے کی کوشش کی۔

''نہیں امی! اب میرا روپے خرچ کرنے کو دل نہیں چاہتا۔''

بڑی سنجیدگی سے اس نے ماں کا ہاتھ پیچھے کر دیا تھا۔ اس کے الفاظ پر جیسے رابعہ کا سانس ہی رک گیا تھا۔

''کیوں بیٹا؟''

''بس ویسے ہی ٹک شاپ آتے جاتے بہت وقت لگ جاتا ہے پھر وہاں پر رش بھی بہت ہوتا ہے ساری بریک تو انتظار میں ہی گزر جاتی ہے پھر پاکٹ منی کا کیا فائدہ۔''

وہ اپنا اسکول بیگ بند کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ رابعہ بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں، وہ روپے خرچ کرنے کا کتنا شوقین تھا وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ جب سے اس اسکول میں آیا تھا تب سے روز پانچ دس روپے لے کر جاتا رہا تھا تب کبھی اس نے کینٹین کے دور ہونے کا رونا نہیں رویا تھا پھر اب کیا بات ہو گئی تھی۔ رابعہ کو اپنی بے چارگی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔

آٹھویں کلاس تک آتے آتے وہ بالکل ہی بدل چکا تھا۔ اس میں پہلے والی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ اس کا غصہ بالکل ختم ہو چکا تھا۔ ماموؤں کی ڈانٹ ڈپٹ کو وہ بڑی خاموشی سے سنتا تھا۔ اس نے کبھی ممانیوں کی کسی بات کا برا مانا نہ ہی کبھی وضاحتیں پیش کرنے کی کوشش کی۔

اس کے چہرے کے نقوش بہت عام سے تھے اور رنگت بھی سانولی تھی۔ اوپر سے وہ تھا بھی دبلا پتلا اور کسی نہ کسی بات پر وہ اپنے کزنز کے

مذاق کا نشانہ بنتا ہی رہتا تھا مگر اس نے کبھی پلٹ کر کسی کو جواب نہیں دیا۔ وہ بڑی خاموشی سے سب کی باتیں برداشت کر لیتا تھا۔ ماموں کے گھر کی دوسری منزل پر موجود اسٹور کو اس نے اپنے کمرے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا اور سارا دن اپنے کمرے میں ہی گھسا رہتا۔ پھر اچانک اس نے زیادہ وقت گھر سے باہر رہنا شروع کر دیا۔

ماں کے استفسار پر اس نے کہہ دیا کہ وہ اپنے دوست کے ساتھ پڑھتا رہتا ہے۔ پھر گھر سے باہر رہنا جیسے اس کا معمول ہی بن گیا تھا۔ رابعہ کو ہمیشہ اس کی بات پر یقین آ جاتا کہ وہ دوست کے ساتھ پڑھتا ہے۔ کیونکہ گھر آنے کے بعد بھی وہ زیادہ وقت کتابیں لے کر ہی بیٹھا رہتا تھا۔ پھر جب وہ میٹرک میں آیا تو اس کے باہر رہنے کے اوقات بھی بڑھ گئے۔ لیکن رابعہ پھر بھی مطمئن تھیں۔ پتا نہیں انھیں کبھی یہ کیوں نہیں لگا کہ وہ کہیں کوئی غلط کام نہ کر رہا ہو، گھر پر وہ جب بھی ہوتا کسی نہ کسی کو کوئی نہ کوئی کام یاد آتا رہتا اور وہ بار بار اندر باہر کے چکر لگاتا رہتا۔ اب رابعہ کی بھی یہی خواہش ہوتی تھی کہ وہ باہر ہی رہے۔ کم از کم باہر وہ اطمینان سے پڑھتا تو ہوگا۔

⁂

میٹرک کے امتحانات میں وہ شاندار نمبروں سے کامیاب ہوا تھا اسکول میں پہلی پانچ پوزیشنز لینے والوں میں سے ایک وہ بھی تھا۔ رابعہ کو ان کی منزل اور قریب لگنے لگی تھی۔ رابعہ کے بھائیوں اور بھابھیوں نے انھیں مبارکباد دی تھی لیکن بجھے دل سے کیونکہ ان کے اپنے بچوں میں سے جتنوں نے بھی میٹرک کا امتحان دیا تھا وہ بمشکل پاس ہی ہوئے تھے۔ پھر اسی شام ان کے بڑے بھائی نے ان سے پوچھا۔

''اب معیز نے آگے کیا کرنا ہے؟''

''آگے کالج میں ایڈمیشن لے گا۔'' رابعہ نے بے حد خوشی سے کہا تھا کیونکہ پہلی بار بھائی نے اتنی دلچسپی سے معیز کے بارے میں پوچھا تھا۔

''کالج میں ایڈمیشن لے کر وہ کیا کرے گا اب وہ اتنا بڑا ہو چکا ہے کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے اس سے کہو کہ اب میرے پاس فیکٹری آ جایا کرے۔ مہینے کے اتنے روپے تو میں اسے دے ہی دوں گا کہ وہ اپنا اور تمہارا خرچ اٹھا سکے۔''

رابعہ نے گم صم ہو کر بھائی کو دیکھا تھا۔ ان کے لہجے میں ایک عجیب سی بیزاری تھی۔ یہ وہی بھائی تھا جو کسی زمانے میں کہتا تھا کہ معیز کو ڈاکٹر بننا چاہیے کیونکہ خاندان میں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ رابعہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

''نہیں بھائی جان! ابھی اس نے پڑھا ہی کیا ہے۔ آج کل خالی میٹرک کو کون پوچھتا ہے۔ ابھی تو اس نے آگے پڑھنا ہے۔ پھر اسے شوق بھی ہے۔'' ان کے لہجے میں لجاجت تھی۔ ان کا بھائی خاموش رہا تھا مگر اس نے جن نظروں سے رابعہ کو دیکھا تھا وہ رابعہ کے وجود کو بھکاری بنا گئی تھیں۔ بیٹے کی کامیابی کی ساری خوشی یک دم ختم ہو گئی تھی۔ لیکن صحیح معنوں میں قیامت تو ان پر تب ٹوٹی تھی جب معیز نے بھی کالج میں داخلہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔

''مجھے پڑھ کر آخر کرنا کیا ہے۔ میں کوئی کام کرنا چاہتا ہوں۔''

رابعہ کو اس کی بات سن کر اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

''معیز! تم کیا کہہ رہے ہو؟'' ان کے لہجے میں بلا کی بے یقینی تھی۔

''ہاں امی! میں اب پڑھنا نہیں چاہتا۔ میں کوئی کام کرنا چاہتا ہوں آخر کب تک ہم دوسروں کا کھاتے رہیں گے؟ اس نے پھر پہلے کی طرح اپنی بات دہرائی تھی۔

''کیا کام کرو گے؟ میٹرک پاس کو کون ملازمت دیتا ہے اگر تمھیں دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے کا اتنا ہی احساس ہے تو کچھ بن کر دکھاؤ۔ اسی لیے کہتی ہوں اپنی تعلیم جاری رکھو۔ ڈاکٹر بنو۔ تم نہیں جانتے تمھارے باپ کو کتنی خواہش تھی تمھیں ڈاکٹر بنانے کی۔ کتنے خواب دیکھے تھے انھوں نے تمھارے لیے۔''

وہ ان کی بات پر بڑے عجیب سے انداز میں ہنسا تھا۔

''امی! سارے خواب پورے نہیں ہوتے اور جب یہ پتا چل جائے کہ کوئی خواب پورا نہیں ہو سکتا تو پھر اس کا پیچھا چھوڑ دینا چاہیے یہ زندگی میں سکون کے لیے بہت ضروری ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا میں ڈاکٹر بننا نہیں چاہتا تھا۔ چاہتا تھا بالکل چاہتا تھا لیکن جب میں نے آپ کو فیس اور دوسرے اخراجات کے لیے دوسروں کی منت سماجت کرتے دیکھا تو میں نے اپنے دماغ سے ایسے سارے خواب نکال دیے۔''

''تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو۔ یہ سب کیوں سوچتے ہو، تم صرف اپنی تعلیم کے بارے میں سوچو، اخراجات کی فکر مت کرو۔''

وہ ماں کے چہرے پر نظریں گاڑے کھڑا تھا۔ ''ڈاکٹر بننے کے لیے لاکھوں روپے چاہیے کہاں سے لائیں گی آپ اتنا روپیہ آپ مجھے روپیہ دکھا دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو ڈاکٹر بن کر دکھا دوں گا۔'' اس بار اس نے بڑے خشک لہجے میں ماں سے کہا تھا۔

''میں لے آؤں گی روپیہ، چاہے مجھے اپنے بھائیوں کی منتیں ہی کیوں نہ کرنی پڑیں۔''

''امی! یہ دو چار ہزار کی بات نہیں ہے۔ لاکھوں کا معاملہ ہے۔ آپ کیوں اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ آپ کے بھائی آپ کو فوراً روپیہ دے دیں گے۔ وہ مجھ پر روپیہ کیوں خرچ کریں گے، اس سے انھیں کیا فائدہ ہوگا۔ میں ان کی اپنی اولاد نہیں ہوں۔ آپ بھی یہ بات سمجھ لیں اور خدا کے لیے ان خوابوں سے باہر آ جائیں اور فرض کریں۔ میں ڈاکٹر بن بھی جاؤں تب بھی کیا ہوگا۔ پہلے ہاؤس جاب کے لیے سفارشیں ڈھونڈوں گا پھر جاب کے لیے اور اگر بغیر کسی سفارش کے جاب مل بھی جائے تو اس سے کیا ہوگا۔ وہ چار پانچ ہزار روپے میں کیا کروں گا۔ نہیں امی! جو مجھے چاہیے وہ چار پانچ ہزار روپے سے بہت زیادہ ہے۔ میرے ڈاکٹر بننے سے کچھ نہیں ہوگا۔''

رابعہ پتھر کا بت بنی ہوئی اسے دیکھے جا رہی تھیں۔ انھیں لگا تھا سات سال پہلے کا معیز واپس آ گیا تھا۔ ضد کرنے والا، کسی کی نہ سننے والا۔ اس کے لہجے میں اتنی ہی قطعیت تھی۔ وہ اپنے لہجے سے کسی طور پر بھی پندرہ سالہ لڑکا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر انھیں جو سنجیدگی نظر آئی تھی۔ وہ تو انھوں نے کبھی کسی ادھیڑ عمر آدمی کے چہرے پر بھی نہیں دیکھی تھی۔ رابعہ کو بے تحاشا رونا آیا۔

''تمھیں تعلیم دلوانے کے لیے ہی تو میں یہ سارا عذاب سہہ رہی ہوں اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ تم بھی میرے ساتھ دوسروں والا سلوک کرو گے تو میں بھی اسی وقت خودکشی کر لیتی جب تمہارا باپ مرا تھا۔''

وہ کہتے کہتے رونے لگی تھیں۔ وہ ماں کی آنکھوں میں اترتی نمی دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ بے اختیار وہ ماں کے پاس آیا اور ان کے ہاتھ چہرے سے ہٹانے لگا۔

''امی! میری طرف دیکھیں۔ پلیز میری طرف دیکھیں۔'' اس کی آواز میں التجا تھی۔

''کیا دیکھوں۔ میں تمہاری طرف کیا دیکھوں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے کیا مل جائے گا؟'' وہ اسی طرح چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپے روتی رہیں۔

''میرے ساتھ ایسا مت کریں امی! کم از کم آپ تو ایسا نہ کریں، آپ کو کیا لگتا ہے۔ کیا مجھے تعلیم چھوڑ کر بہت خوشی ہو گی۔ میرا دل جانتا ہے یہ فیصلہ میں نے کس طرح کیا ہے لیکن میں کیا کروں۔ میں آپ کی طرح آنکھیں بند کر کے نہیں بیٹھ سکتا۔ یہ گھر یہ لوگ اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتے۔ میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ میں اب ان کا کوئی احسان نہیں لینا چاہتا امی! مجھے اپنے وجود سے گھن آتی ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں کوئی کتا ہوں جسے یہ لوگ دو وقت کی روٹی دیتے ہیں۔ آپ کیوں آئی تھیں یہاں؟ آخر کیوں آئی تھیں ان لوگوں کے پاس۔ میرا باپ ہی مرا تھا دنیا تو ختم نہیں ہوئی تھی۔ آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ کہیں محنت مزدوری کر لیتیں۔ کہیں برتن دھو لیتیں۔ کسی گھر میں کام کر لیتیں مگر مجھے یہاں کبھی نہ لاتیں۔''

وہ پہلی بار معیز کو اس طرح بلکتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ اس کے آنسو دیکھ کر وہ اپنا رونا بھول گئی تھیں۔ معیز کیا سوچتا تھا کیا چاہتا تھا۔ یہ انہیں اس دن پتا چل رہا تھا۔ وہ پتا نہیں کس کس بات کی شکایت کر رہا تھا، رابعہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتی جا رہی تھیں۔ انہوں نے معیز کو آسائشیں دینے کے لیے اپنے بھائیوں کے در پر آنا پسند کیا تھا اور آج وہی بیٹا اس آرام و آسائش سے نفرت کر رہا تھا۔

''امی! یہ دیکھیں! میرے ہاتھوں کو دیکھیں۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ یہ ایک مزدور کے ہاتھ ہیں۔ میں پچھلے تین سال سے کام کر رہا ہوں اور اب محنت کے علاوہ مجھے کچھ اور سوٹ نہیں کرے گا۔''

وہ اپنے ہاتھ ان کے سامنے پھیلائے کہہ رہا تھا۔ رابعہ حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

''معیز! تم کام کرتے ہو؟'' رابعہ نے بے یقینی سے اس سے پوچھا۔

''ہاں!'' معیز کے لہجے میں ایک عجیب سا تفاخر تھا میں نے کام اس وقت شروع کیا تھا جب میں آٹھویں کلاس میں تھا۔ میرے دوست کے باپ کی لیدر جیکٹس کی فیکٹری ہے، وہاں میں نے لیدر جیکٹس کی کٹنگ اور سلائی سیکھی ہے۔ میں آپ سے کہتا تھا کہ میں اپنے دوست کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ میں پڑھتا نہیں تھا میں یہ کام سیکھنے جاتا تھا اور اب تو میں پارٹ ٹائم کام کر کے ہزار ڈیڑھ ہزار کما لیتا ہوں اور امی! مجھے یہی سب کچھ کرنا ہے جو میں کر رہا ہوں۔ میرے لیے اب آپ کو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے نہیں پڑیں گے۔''

اس نے بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ ان کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔

''میں کوئی غلط کام نہیں کر رہا جو آپ اس طرح رو رہی ہیں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ میں اپنی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل ہو گیا ہوں۔ مجھے ابھی آپ کے لیے بہت کچھ کرنا ہے اگر آپ اس طرح میرے راستے میں دیواریں کھڑی کریں گی تو میں کیا کروں گا۔''

معیز جیسے منت کر رہا تھا۔ رابعہ کچھ کہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔تم جیسا چاہتے ہو ویسا ہی کرو۔''

یہ واحد جملہ تھا جو رابعہ کے منہ سے نکلا تھا اور پھر وہ کمرے سے نکل گئیں۔ رابعہ کے دل میں جیسے جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔ آج ان کے سارے خوابوں کے چکنا چور ہونے کا دن تھا۔

……❁……

عجیب سی بے حسی تھی جو رابعہ پر طاری ہو گئی تھی۔ اب انھیں گھر کے کاموں میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ پہلے وہ اس لیے گھر کے کاموں میں جتی رہتی تھیں کیونکہ انھیں معیز کے اخراجات کے لیے روپوں کی ضرورت ہوتی تھی اور یہ روپے وہ ان سے لیتی تھیں لیکن اب یک دم انھیں روپے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ معیز اپنا سارا خرچ خود اٹھاتا تھا اور انھیں بھی ہر ماہ اتنے روپے دے دیتا تھا کہ انھیں کسی دوسرے سے روپے مانگنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

انھوں نے صرف ایک بار اپنے بھائیوں سے روپے لینے سے انکار کیا تھا اور ان کے بھائیوں نے دوبارہ جھوٹے منہ انھیں روپے لینے کے لیے نہیں کہا تھا۔ شاید وہ بھی اس ذمہ داری سے جلد از جلد جان چھڑانا چاہتے تھے اور اب آہستہ آہستہ انھیں معیز صحیح لگنے لگا تھا۔ وہ مرد تھا، عمر اور تجربہ میں ان سے کم ہی سہی مگر بہر حال جذبات کی آنکھ سے دیکھنے والی عورت نہیں تھا۔ اب انھیں احساس ہونے لگا تھا کہ جو بھائی ہر ماہ انھیں ہزار روپے دیتے دیتے تنگ آ گئے تھے، وہ انھیں اس کی میڈیکل کی تعلیم کے اخراجات کے لیے لاکھوں روپے کہاں سے دیتے۔

انھیں معیز کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کب گھر ہوتا ہے اور کب نہیں۔ اکثر وہ رات کے گیارہ بارہ بجے آتا اور جب ماموں اس کو جھڑکتے تو وہ اوور ٹائم کا کہہ دیتا۔ اب وہ کھانا بھی وہاں سے نہیں کھاتا تھا، اگر کبھی چھٹی کا دن ہوتا تب بھی وہ اپنا کھانا باہر سے ہی لے کر آتا اور ماں کو بھی ساتھ بٹھا لیتا۔ پھر آہستہ آہستہ رابعہ کو یہ سب اچھا لگنے لگا تھا بیٹے کی کمائی تھوڑی سہی مگر پوری طرح ان کی تھی، انھیں اس روپے کو خرچ کرتے ہوئے سوچنا نہیں پڑتا تھا۔ انھیں اس سے یہ بھی نہیں کہنا پڑتا تھا کہ انھیں کسی چیز کی ضرورت ہے۔ وہ خود ہی ان کے لیے اکثر کچھ نہ کچھ لاتا رہتا۔ کبھی کپڑے۔ کبھی جوتے کبھی استعمال کی کوئی دوسری شے اور کبھی کھانے کے لیے کچھ۔ وہ پہلے اسے روک دیتی تھیں، اب ایسا نہیں کر پاتی تھیں۔ وہ باہر کیا کرتا تھا۔ وہ مکمل طور پر نہیں جانتی تھیں مگر یہ دعا ضرور کرتی رہتی تھیں کہ وہ کسی بری صحبت کا شکار نہ ہو۔

……❁……

چار سال اسی طرح گزر گئے تھے۔ معیز نے پرائیویٹ طور پر گریجویشن بھی کر لیا تھا۔ پھر ایک دن وہ ان کے پاس آیا۔

''امی! میری فیکٹری کے مالک مجھے ایک کورس کے لیے کوریا بھیجنا چاہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں آپ یہ بات کسی سے نہ کہیں بس سب سے یہ کہہ دیں کہ میں کسی کورس کے لیے کراچی گیا ہوں۔''

رابعہ نے کسی تردد کے بغیر اس کی بات مان لی تھی۔ پھر وہ کوریا چلا گیا۔ وہ انھیں خط نہیں لکھتا تھا، اکثر فون پر بات کرتا تھا۔ جب پورا سال وہ گھر نہیں آیا حتیٰ کہ عیدوں پر بھی تو ان کے بھائیوں نے کافی شکوک و شبہات کا اظہار کیا تھا کہ شاید وہ کسی غلط صحبت میں پڑ گیا ہے اور پتا نہیں وہ واقعی

کراچی کورس کرنے گیا ہے یا نہیں۔ انھوں نے رابعہ سے اس کا کراچی کا ایڈریس اور فیکٹری کا پتا پوچھنے کی کوشش کی تھی جہاں وہ کام کرتا تھا مگر رابعہ کو دونوں جگہوں کا پتا نہیں تھا۔ ان کے بھائیوں نے چند دن تک معیز کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا تھا مگر کچھ دن گزرنے کے بعد وہ ایک بار پھر اسے بھول گئے تھے۔ مگر رابعہ کی بھابھیاں انھیں یہ جتانا کبھی نہ بھولتیں کہ وہ بیٹا ہو کر ان سے بالکل لاپروا ہے اور انھوں نے اتنے سالوں سے انھیں اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔

سال گزرنے کے بعد جس خاموشی سے وہ باہر گیا تھا۔ اسی خاموشی سے وہ واپس آ گیا تھا ایک بار پھر وہ پہلے ہی کی طرح اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ لیکن اب وہ پہلے کی نسبت زیادہ مطمئن اور خوش نظر آتا تھا۔

*

''امی! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے؟''

اس دن وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

جہاں میں کام کرتا ہوں وہ جگہ یہاں سے بہت دور ہے۔ آنے جانے میں مجھے بہت پیسے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کیوں نہ وہیں قریب کوئی گھر لے لوں اور آپ کو بھی وہیں لے جاؤں۔ اس طرح مجھے اتنی دور نہیں آنا پڑے گا اور پھر مجھے گھر کی سہولت بھی ہو جائے گی۔'' اس نے ماں سے کہا تھا۔

''نہیں معیز! میں ابھی وہاں کیسے جا سکتی ہوں۔ تمھیں معلوم ہی ہے تمہاری نانی کی طبیعت اکثر خراب رہتی ہے۔ ان کا خیال میں ہی رکھتی ہوں اگر میں چلی گئی تو ان کی دیکھ بھال کون کرے گا اور ویسے بھی تم تو کام پر چلے جایا کرو گے پھر میں پیچھے سارا دن کیا کروں گی؟''

''امی! ہم نانی کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔''

''تمھارے ماموں یہ کبھی گوارا نہیں کریں گے کہ امی میرے ساتھ رہیں۔''

وہ ان کی بات پر خفگی سے انھیں دیکھنے لگا۔

''امی! دیکھیں مجھ سے روز روز یہاں نہیں آیا جاتا۔ کرائے پر بہت سے روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ پھر میں رات کو دیر سے آتا ہوں تو ماموں بھی اعتراض کرتے ہیں۔ کل انھوں نے مجھ سے کہہ دیا ہے کہ اگر مجھے اتنی دیر ہو جایا کرے تو گھر میں آنے کے بجائے وہیں فیکٹری میں ہی رک جایا کروں۔ کیونکہ میرے دیر سے گھر آنے پر دوسرے لڑکوں پر برا اثر پڑ رہا ہے۔'' وہ کافی بے چین تھا۔

''معیز! تم ایسا کرو کہ تم کوئی گھر لے لو ہفتے میں دو تین بار تم مجھ سے ملنے آ جایا کرو۔ اس طرح تمھیں سہولت رہے گی۔''

معیز نے کچھ حیرانی سے رابعہ کو دیکھا تھا۔

''یعنی امی! آپ میرے ساتھ نہیں جائیں گی۔'' پتا نہیں کیوں معیز کو اس بات سے تکلیف پہنچی تھی۔

''دیکھو معیز! میں تمہاری نانی کو نہیں چھوڑ سکتی۔ اتنے عرصے سے انھوں نے ہمارا خیال رکھا ہوا تھا اب ضرورت کے وقت میں انھیں کیسے

چھوڑ دوں پھر مجھے ساری زندگی تمھارے ساتھ ہی تو رہنا ہے۔''

انھوں نے اس بار بڑے نرم لہجے میں اسے سمجھایا تھا وہ ہونٹ بھینچے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ٹھیک ہے امی! لیکن اب آپ ذہنی طور پر یہ گھر چھوڑنے کی تیاری کر لیں۔ اب میں اتنا کما لیتا ہوں کہ ہم دونوں الگ رہ سکیں۔''

اس نے بڑے مستحکم لہجے میں کہا تھا۔ رابعہ یک ٹک اسے دیکھتی رہیں۔ آج پہلی بار انھوں نے اس کا چہرہ اتنے غور سے دیکھا تھا وہ بہت خوبصورت نہیں تھا لیکن دراز قد اور سڈول جسم نے اسے بے حد پُرکشش بنا دیا تھا۔ انھیں وہ بالکل ناصر کی طرح لگا، وہ بھی اس کی طرح دراز قد تھے اور نقوش کے اعتبار سے بھی وہ ناصر سے مشابہ تھا۔ وہی گندمی رنگ جس کی بنا پر وہ بچپن میں اپنے کزن کے تمسخر کا نشانہ بنتا رہا تھا، اب اس پر جچ رہا تھا۔ وہ بائیس سال کا تھا لیکن اپنے قد و قامت سے اپنی عمر سے بڑا لگ رہا تھا۔ انھوں نے دل ہی دل میں اس کی نظر اتاری۔ جوان اور سعادت مند بیٹا کیسی نعمت کیسا سہارا ہوتا ہے۔ یہ انھیں آج پتا چلا تھا۔ انھیں اچانک یوں لگنے لگا تھا جیسے وہ اب کسی کی محتاج نہیں رہیں۔ اب وہ جب چاہتیں، اس گھر کو چھوڑ سکتی تھیں۔

معیز دوسرے دن اپنا سامان لے گیا تھا اس نے انھیں بتایا تھا کہ ابھی وہ فیکٹری میں ہی رہے گا۔ کیونکہ اس طرح اسے زیادہ آسانی ہوگی۔ جاتے ہوئے وہ رابعہ کے ساتھ اپنے ماموں کے پاس گیا تھا۔ جنھوں نے اس بات کا قطعاً نوٹس نہیں لیا کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہا ہے۔ ہاں انھوں نے یہ ضرور کہا تھا کہ اب اسے اپنا گھر بنا لینا چاہیے جہاں اپنی ماں کو رکھ سکے۔ رابعہ کو بیٹے کے سامنے بھائی کی اس بات پر بے پناہ خجالت ہوئی تھی مگر معیز نے ماموں کی بات پر جی کہہ کر بڑی فرمانبرداری سے سر ہلا دیا تھا۔

دن آہستہ آہستہ گزر رہے تھے۔ معیز اب جب بھی ان سے ملنے آتا تو بہت تھوڑی دیر کے لیے رکتا تھا لیکن وہ تقریباً روز انھیں فون ضرور کرتا تھا۔ رابعہ کو اس کی کمی تو محسوس ہوتی تھی مگر وہ یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لیتی تھیں کہ بہرحال وہ خوش تو ہے نا۔

پھر انھیں دنوں ان کے چھوٹے بھائی کی بیٹی سعدیہ کی بات طے کر دی گئی تھی۔ انھیں اس بات کا تب پتا چلا جب ان کی بھابھی نے اپنی ساس کو اس بارے میں اطلاع دی تھی۔ رابعہ بھی اس وقت ماں کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ جیسے بھونچکا رہ گئی تھیں۔ بھائیوں کی تمام بے التفاتی کے باوجود انھیں پتا نہیں یہ یقین کیوں تھا کہ وہ سعدیہ کی شادی معیز سے ہی کریں گے کیونکہ معیز کے ساتھ بچپن سے اس کی نسبت طے تھی۔ مگر ایک بار پھر ان کی امیدیں غلط ثابت ہوئی تھیں۔

''لیکن بھابھی! سعدیہ کی نسبت تو بچپن سے معیز سے طے ہے۔ آپ اس کا رشتہ کہیں اور کیسے کر سکتی ہیں، معیز سے اس کی نسبت آپ لوگوں کے اصرار پر ہی طے ہوئی تھی۔''

رابعہ خاموش نہیں رہ سکی تھیں۔ بھابھی نے تیکھی نظروں سے انھیں گھورا اور کہا۔

''کون سی نسبت اور کہاں کی نسبت؟ وہ نسبت طے کرنے والے بھی تمھارے بھائی تھے اور یہ نسبت طے کرنے والے بھی تمھارے بھائی ہیں۔ تمھیں جو بھی کہنا ہے، وہ ان سے کہو مگر ایک بات ذہن میں رکھنا، سعدیہ کبھی بھی تمھاری بہو نہیں بن سکتی۔ میں اپنی بیٹی کو کنویں میں نہیں دھکیل سکتی۔ تمھارا بیٹا ہے کیا؟''

وہ یہ کہتے ہوئے تیزی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی تھیں۔

رابعہ نے شاکی نظروں سے ماں کو دیکھا۔

''حوصلہ رکھو رابعہ! میں تمھارے بھائی سے بات کروں گی۔''

ان کی امی نے جس طرح انھیں تسلی دی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ خود بھی اس رشتے کے بارے میں کچھ زیادہ پُر امید نہیں تھیں۔ لیکن انھیں خود بیٹے سے بات کرنے کی کوشش نہیں کرنی پڑی۔ شام ہوتے ہی وہ دندناتے ہوئے اپنی بیوی کے ساتھ ان کے کمرے میں آ گئے تھے۔ نہ صرف وہ بلکہ رابعہ کے دوسرے دونوں بھائی بھی آ گئے تھے۔ انھوں نے رابعہ کے سلام کا جواب دیے بغیر کڑے تیوروں کے ساتھ کہا تھا۔

''کون سے رشتے اور نسبت کی بات کی تھی تم نے یاسمین سے؟'' انھوں نے اپنی بیوی کا نام لیا۔

''بھائی جان! آپ نے بچپن میں خود ہی۔''

ان کے بھائی نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''میں نے جو کہا تھا غلط کہا تھا، بکواس کی تھی۔ تم اپنے بیٹے کو کس برتے پر رشتے کے لیے پیش کر رہی ہو، وہ ہے کیا چیز؟ کیا وہ کسی بھی بات میں میری بیٹی کے برابر ہے۔ اس کی تعلیم دیکھو اور میری ایم اے پاس بیٹی کو دیکھو، وہ چار پانچ ہزار کمانے والا کاریگر ہے اور میری فیکٹری میں ایسے چالیس کاریگر کام کرتے ہیں۔ وہ جتنی رقم ہر مہینے کماتا ہے۔ میں اتنی رقم ہر ماہ اپنی بیٹی کو خرچ کے لیے دیتا ہوں۔ باقی باتوں کو تو چھوڑو۔ تم شکل دیکھو اپنے بیٹے کی۔ کیا وہ اس قابل ہے کہ میری بیٹی کے ساتھ کھڑا بھی ہو سکے اور تم مجھے نسبتیں یاد دلا رہی ہو۔ ہمارے ٹکڑوں پر پل کر جوان ہونے والے کو کیا ہم ساری عمر اپنے سر پر مسلط رکھیں۔''

باتیں نہیں خنجر تھے جو وہ باری باری رابعہ کے دل میں گاڑتے چلے جا رہے تھے۔

"میرا ہونے والا داماد اسسٹنٹ کمشنر ہے اور تمہارا بیٹا تو اس قابل بھی نہیں ہے کہ کہیں چپڑاسی بھرتی ہو سکے۔"

"بھائی جان! میں نے سعدیہ کا رشتہ نہیں مانگا تھا۔ آپ نے خود اس کا رشتہ دیا تھا جو باتیں آپ آج کہہ رہے ہیں وہ آپ کو پہلے سوچنی چاہیے تھیں۔" رابعہ نے بھرائی ہوئی آواز میں ان سے کہا۔

"ہر باپ اپنی اولاد کا اچھا ہی چاہتا ہے۔ اس وقت مجھے لگتا تھا کہ تمھارے بیٹے سے بیاہ کر میری بیٹی کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا لیکن تم تو اتنی احمق نکلیں کہ اپنا مستقبل محفوظ نہیں رکھ سکیں۔ میری بیٹی کا کیا رکھتیں۔ جو کچھ تمھارے پاس تھا تم نے شوہر پر خرچ کر دیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا مرض لاعلاج ہو چکا ہے۔ تمھیں اتنی عقل نہیں تھی کہ بیٹے کے لیے ہی کچھ بچا لیتیں جو آج اس کے کام آتا لیکن تم نے تو سب کچھ ناصر پر خرچ کر دیا اور تمھیں اس کا کیا فائدہ ہوا۔"

ان کا بھائی انھیں عقل سکھا رہا تھا کہ وہ روپیہ بچا لیتیں اور شوہر کو مرنے دیتیں، وہ روپیہ جسے جمع کرنے میں ان کا کوئی رول نہیں تھا رابعہ دل چاہا وہ ان سے پوچھیں کیا یہی سبق وہ اپنی بیوی کو دینا پسند کریں گے۔ مگر انھوں نے صرف اتنا کہا تھا۔

"ٹھیک ہے بھائی جان! مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میں سعدیہ کا ذکر لے بیٹھی۔ آپ سے بہتر اس کا برا بھلا کون سوچ سکتا ہے۔"

وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل آئی تھی۔ کسی دوسرے بھائی، بھابھی نے ان کی حمایت میں ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ سگے رشتوں سے جو تھوڑی بہت انسیت تھی وہ بھی اس دن انھیں ختم ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ اسی لیے آج جب تین دن بعد معیز ان سے ملنے آیا تھا تو انھوں نے اسے گھر تلاش کرنے کے لیے کہا تھا۔

"لیکن امی! آخر بات کیا ہے۔ پہلے تو بالکل انکار کر رہی تھیں اور اب؟" معیز کو ماں کی رضا مندی پر حیرانی ہو رہی تھی۔

بیٹے کے نرم لہجے پر خود پر ضبط کرتے ہوئے بھی ان کا جی بھر آیا۔

"سعدیہ کی منگنی ہو گئی ہے۔" انھوں نے بھیگی آنکھوں سے اسے بتایا۔

تو اس میں رونے والی کیا بات ہے؟" ماں کے آنسو اس کی سمجھ سے باہر تھے اور رابعہ کے لیے اس کا رویہ ایک لمحہ کو بھی ایسا نہیں لگا تھا جیسے اسے کوئی ملال ہو۔

"کیا سعدیہ کی منگنی ہونے پر میرے لیے رونے والی کوئی بات نہیں ہے؟" رابعہ نے شاکی لہجے میں اس سے پوچھا۔

"ہاں امی! آپ کے لیے رونے والی اس میں کیا بات ہے۔ آخر اس کی شادی تو اس کے ماں باپ نے کرنی ہی تھی پھر خاندان میں ابھی اور بھی لڑکیاں ہیں۔ کیا آپ سب کی منگنی پر اسی طرح روئیں گی؟"

"سعدیہ کوئی دوسری لڑکی نہیں ہے۔ وہ بچپن سے تم سے منسوب تھی پھر اب۔" ایک بار پھر ان کے آنسو چھلک پڑے تھے۔

وہ بے اختیار ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ ماں کی افسردگی کا سبب کیا تھا۔ اس کے ذہن میں کہیں دور دور تک بھی سعدیہ اور اپنی نسبت کا خیال نہیں تھا، کیونکہ اس نے سعدیہ کو کبھی اس نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ بلاشبہ وہ اس خاندان کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی

اور اسے اس خوبصورتی کا احساس بھی تھا وہ اگر ان حالات کا شکار نہ ہوتا تو شاید وہ بھی بری طرح سعدیہ کے عشق میں گرفتار ہوتا لیکن ہوش سنبھالتے ہی اس نے اپنے ساتھ سعدیہ کا جو ہتک آمیز سلوک دیکھا تھا اس نے معیز کو کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونے دیا تھا۔ اب اسے ماں کے رونے پر ہنسی آ رہی تھی۔ شاید وہ یہ سوچ رہی تھیں کہ اسے اس نسبت کے ٹوٹنے کا سن کر بہت دکھ ہوگا۔ اس نے بڑے پیار سے ماں کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

''امی اگر اس کی منگنی ہوگئی ہے تو یہ بہت اچھا ہوا ہے۔ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ ماموں مجھ سے اس کی شادی کر دیں گے۔ میں نے بھی اس کے بارے میں نہیں سوچا اور ویسے بھی میں اس کے قابل نہیں ہوں۔ اس کے ماں باپ سب والدین کی طرح اپنی بیٹی کو خوش دیکھنا چاہتے تھے اور یقیناً یہ خوشی دولت سے وابستہ ہوتی ہے اور میرے پاس دولت ہی نہیں ہے اور نہ ہی ابھی آنے کی امید ہے۔ پھر وہ کس آس میں سعدیہ کی زندگی برباد کریں۔ انھوں نے جو کچھ کیا، بالکل ٹھیک کیا ہے۔ آپ خوامخواہ اتنی چھوٹی سی بات کو دل پر نہ لگائیں۔''

اس نے بڑی نرمی سے انھیں سمجھایا تھا۔

''کیا ٹھیک کیا انھوں نے؟ دھوکا دیا ہے، وعدہ خلافی کی ہے میں دیکھتی اگر ناصر زندہ ہوتے تو وہ یہ سب کیسے کرتے۔ اسی لیے میں تم سے کہتی تھی کہ تعلیم نہ چھوڑو۔ پڑھو کچھ بن جاؤ تاکہ دولت میں نہ سہی تعلیم میں تو تم اس کے برابر کے ہوتے، پھر کوئی تمھیں اس طرح رد نہ کرتا۔''

انھیں اب اس پر غصہ آ رہا تھا مگر وہ سر جھکائے بڑے اطمینان سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

''تم نے سعدیہ کے بارے میں کچھ سوچا ہو یا نہ سوچا ہو۔ میں نے تو ہمیشہ ہی اسے اپنی بہو سمجھا ہے۔ کیا کیا خواب دیکھے تھے میں نے تم دونوں کے لیے۔'' وہ ایک بار پھر بات ادھوری چھوڑ کر رونے لگیں۔

''امی! اب بس کریں۔ جانے دیں اس بات کو۔ مجھے کوئی دکھ نہیں۔ کوئی افسوس نہیں ہے تو آپ کو کیوں ہے اور صاف بات تو یہ ہے کہ ابا اگر زندہ ہوتے اور میرے پاس بے تحاشا دولت ہوتی تو میں تب بھی کبھی اس سے شادی نہ کرتا۔ چاہے آپ نے نسبت کے بجائے نکاح ہی کیوں نہ کیا ہوتا۔ وہ بہت ناز نخروں میں پلی ہے اسے اپنے حسن اور دولت پر بہت غرور ہے اور امی! میں بہت سادہ بندہ ہوں۔ زندگی کو بہت آرام اور سکون سے گزارنا چاہتا ہوں۔ بیوی خوبصورت چاہے ہو یا نہ ہو لیکن اس کی فطرت ضرور اچھی ہو۔ وہ کم از کم میری عزت ضرور کرے میری ہر مہربانی ہر عنایت کو اپنا حق نہ سمجھے اور آپ کی عزت کرے لیکن امی؟ آپ کی بھتیجی میں ایسی کوئی خصوصیات نہیں ہیں۔ اب آپ یہ بے کار کا رونا دھونا ختم کر دیں۔ میں چند دن کے لیے کراچی جا رہا ہوں آپ میری عدم موجودگی میں اپنا سامان پیک کر لیجیے گا۔ میں جس دن واپس آیا اسی دن آپ کو لے جاؤں گا۔''

رابعہ تعجب سے اسے دیکھ رہی تھی۔ معیز میں کیا کیا تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ انھیں یاد تھا۔

بچپن میں وہ سعدیہ سے بے تحاشا محبت کرتا تھا اگر کسی کے لیے وہ تھوڑا بہت ایثار کرتا تھا تو وہ سعدیہ ہی تھی۔ مسقط واپس جا کر بھی وہ ضد کر کے فون پر اس سے بات ضرور کیا کرتا تھا اور جب بھی اپنے لیے کچھ لیتا تو ضد کر کے وہی چیز سعدیہ کے لیے بھی ضرور لیتا اور رابعہ ہر دو چار ماہ سعدیہ کے لیے درجنوں کے حساب سے کھلونے اور کپڑے بھجواتی تھیں۔ یہ تو صرف یہاں آنے کے بعد ہوا تھا کہ اس نے آہستہ آہستہ سعدیہ کے ساتھ کھیلنا بند کر دیا تھا اور اب تو یہ عالم تھا کہ اگر کبھی دونوں کا سامنا ہو جاتا تو دونوں ایک دوسرے کو مخاطب بھی نہیں کرتے تھے لیکن وہ یہ دیکھ کر بھی دلبرداشتہ

نہیں ہوئی تھیں پتا نہیں انھیں کیوں یہ لگتا تھا کہ سعدیہ کی شادی معیز سے ہی ہوگی اور کوئی اس میں رکاوٹ نہیں ڈالے گا اور ایک بار پھر ان کی یہ توقع غلط ثابت ہوئی تھی۔

معیز کو سعدیہ سے محبت ہو یا نہ ہو، انھیں سعدیہ سے بے حد محبت تھی گو سعدیہ نے کبھی بھی اس التفات کا اس گرم جوشی سے جواب نہیں دیا تھا۔ اگر وہ کبھی اس کے گھر چلی جاتیں تو وہ صرف سلام دعا کر کے پھر دوبارہ ان کے سامنے نہ آتی پھر بھی رابعہ کو اس سے بہت انس تھا۔

ان کے بھائی نے جو معیز کے بارے میں کہا تھا وہ ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھا اور ان کے لیے بہت مشکل تھا کہ وہ اس سب کو بھلا دیتیں۔ معیز کی واحد خامی یہ تھی کہ اس کے پاس روپیہ پیسہ نہیں تھا اور اس ایک خامی نے اس کی ساری خوبیوں کو چھپا دیا تھا۔ انھیں سب سے زیادہ اس بات پر تکلیف پہنچی تھی کہ بھائی نے معیز کی شکل وصورت کا مذاق اڑایا تھا جب انھوں نے معیز سے سعدیہ کی نسبت طے کی تھی تب بھی وہ اسی شکل و صورت کا مالک تھا لیکن تب فرق صرف دولت کا تھا انھیں ملال تھا کہ بھائی کو اگر انکار کرنا تھا تو کوئی دوسرا بہانا بنا دیتا اس طرح ذلیل تو نہ کرتا مگر سعدیہ کے باپ کا غصہ ابھی بھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔

٭

چوتھے دن معیز کراچی سے لوٹا تھا اور اسی دن وہ ماں کو لینے آ گیا تھا۔ جانے سے پہلے وہ باری باری ماں کے ساتھ تینوں ماموؤں کے پورشنز میں ملنے گیا تھا۔ چھوٹے ماموں نے اسے دیکھتے ہی اس پر برسنا شروع کر دیا۔

''کتے کو بھی چار دن روٹی ڈال دو تو وہ بھی مالک کے پیر چاٹتا ہے بھونکتا نہیں وفادار ہو جاتا ہے۔ تم تو کتے سے بھی بدتر نکلے ہو۔''

یہ جملہ تھا جو انھوں نے اسے دیکھتے ہی کہا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر جیسے سن ہو کر رہ گیا کیونکہ وہ اس بات کے سیاق وسباق سے لاعلم تھا۔

''ماموں! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''خبردار آج کے بعد تم نے مجھے کسی رشتے سے پکارا۔ تمھیں اور تمہاری ماں کو ترس کھا کر رکھا تھا اور تم آستین کے سانپ نکلے۔ اتنی جرات کیسے ہوئی تمہاری کہ میری بیٹی سے شادی کے خواب دیکھو۔ تم ہو کیا؟ اوقات کیا ہے تمہاری؟''

معیز کے ذہن میں سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔ اس کے چھوٹے ماموں بری طرح گرج رہے تھے۔ ان کی بلند آواز سن کر ان کے بیوی بچے بھی لاؤنج میں آ گئے۔ معیز کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور اس میں سما جائے۔

''ماموں! میں نے امی کو رشتے کے لیے آپ۔'' اس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی۔

مگر چھوٹے ماموں اس وقت غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔ انھوں نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔ ''یہ فریب کسی اور کو دینا۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تمہاری ماں تمہاری مرضی کے بغیر رشتہ کی بات کرے۔ تم نے سوچا ہوگا کہ امیر ہونے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے، اسی طرح ساری عمر تم میری چوکھٹ پر پڑے رہتے۔ ذرا اپنے آپ کو دیکھو۔ ہو کیا تم؟ بھکاری جو سب کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ لنڈے کے کپڑے پہن کر تم سمجھے ہو کہ نواب بن گئے ہو جسے میں بڑے شوق سے اپنی بیٹی دے دوں گا اگر اتنے ہی اونچے آدمی ہو تو اپنی ماں کو لے کر جاؤ۔ اسے اپنے پلّے سے کھلاؤ۔''

معیز کو جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ یہی حال رابعہ کا تھا۔ ذلت کا وہ احساس جو بچپن سے اسے گھیرے ہوئے تھا اب اپنی انتہا پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے خاموشی سے ان کی باتیں اور طعنے سنے تھے اور پھر کچھ کہے بغیر وہاں سے نکل آیا تھا۔ رابعہ کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں مگر معیز کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ واپس بڑے ماموں کی طرف آ کر اس نے ماں کی چیزیں گاڑی میں رکھنا شروع کر دی تھیں۔ پھر وہ انھیں لے کر باہر آ گیا تھا۔

معیز! یہ کس کی گاڑی ہے؟'' رابعہ نے قدرے حیرانی سے اس سے پوچھا تھا۔

''امی! میری نہیں ہے، کسی دوست کی ہے۔ اس لیے لایا ہوں تاکہ آپ کو آسانی رہے۔'' رابعہ کو اس کے جواب سے تسلی نہیں ہوئی تھی۔

''ایسا کون سا دوست ہے تمہارا جس نے اپنی گاڑی تمھیں دے دی ہے۔''

ہے امی ایک۔ آپ کو ملواؤں گا اس سے۔''

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''تم نے ڈرائیونگ کب سیکھی ہے؟'' رابعہ ایک بار پھر حیران ہوئی تھیں۔

''میں نے تو پتا نہیں کیا کیا سیکھ لیا ہے؟ آپ کو کیا پتا؟'' اس کا لہجہ بے حد عجیب تھا۔

پھر پورا راستہ وہ خاموش رہا تھا۔ رابعہ کے ذہن میں بھائی کی باتیں گونج رہی تھیں۔ معیز کی یہ تذلیل انھیں اس وقت بے پناہ تکلیف پہنچا رہی تھی۔ وہ بار بار اس کے چہرے پر کچھ تلاش کرنے کے لیے نظر دوڑاتی رہیں۔ مگر وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ جس گھر میں وہ انھیں لے کر آیا تھا، اسے دیکھ کر رابعہ کو ہول اٹھنے لگے تھے۔ پورچ میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد اس نے نیچے اتر کر رابعہ کی سیٹ کا دروازہ کھولا تھا۔ رابعہ نے نیچے اترے بغیر اس سے پوچھا۔

''یہ کس کا گھر ہے؟''

وہ بڑی پھیکی سی ہنسی ہنسا تھا۔ ''گھبرائیں مت امی! میرا نہیں ہے۔ آپ پہلے نیچے تو اتریں، پھر آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔''

اس نے ملازم کو کار کی چابی دیتے ہوئے رابعہ سے کہا تھا جو اس عرصہ میں گاڑی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ملازم نے ڈکی سے سامان اتارنا شروع کر دیا۔

''آئیں امی!'' وہ یہ کہہ کر اندر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ رابعہ نے کچھ پریشانی کے عالم میں اس کی پیروی کی تھی۔

یہ چاروں اطراف سے وسیع لان میں گھرا ہوا ایک چھوٹا لیکن خوبصورت بنگلہ تھا۔ وہ انھیں لے کر سیدھا اوپر کی منزل پر گیا تھا اور سیڑھیاں چڑھ کر کوریڈور میں داخل ہوتے ہی اس نے پہلے کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ ایک چھوٹا مگر ویل فرنشڈ روم رابعہ کی نظروں کے سامنے تھا۔

''معیز! یہ کس کا گھر ہے۔ دیکھو، مجھے سچ بتانا جھوٹ مت بولنا۔''

رابعہ نے کمرے کے اندر داخل ہونے کے بجائے اس سے پوچھا تھا۔

''امی! یہ میرے دوست کا گھر ہے۔ میں یہاں عارضی طور پر رہتا ہوں۔'' اس نے کچھ لاپروائی سے کہا تھا۔

''ایسا کون سا دوست بن گیا ہے تمہارا جس نے تمہیں رہنے کے لیے یہ گھر دے دیا ہے۔ گاڑی دے دی ہے۔ آخر مجھے بھی تو پتا چلے۔''

رابعہ کو اس کی بات پر اعتبار نہیں آیا تھا۔

''امی! کیا آپ سمجھ رہی ہیں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں ماں سے پوچھا۔

''نہیں۔ مجھے تمہاری باتوں پر بالکل یقین نہیں آ رہا۔''

رابعہ نے بالکل کھرے انداز میں کہہ دیا۔ معیز نے ایک گہری سانس لی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی تھی۔

''امی! وہ ابھی کچھ دیر بعد یہاں آئے گا پھر آپ کو میری باتوں پر یقین آ جائے گا۔ میں ولید کی فیکٹری میں کام کرتا ہوں اور بہت عرصے سے کر رہا ہوں اس کے پاس میں نے کام سیکھا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا جب میں اسکول میں تھا تو اکثر ولید کا ذکر کرتا تھا۔ یہ وہی ہے۔''

اس بار اس نے تفصیلاً رابعہ کو بتایا تھا۔ رابعہ ابھی بھی مطمئن نہیں ہوئی تھیں البتہ انہیں یاد آ گیا کہ اس کا ولید نامی ایک دوست ضرور اسکول میں تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد ولید آیا تھا۔ وہ آتے ہی ان سے اس طرح ملا تھا جیسے پہلی بار نہیں بلکہ اکثر ان سے ملتا رہا ہو۔ شام کا کھانا بھی اس نے وہیں کھایا تھا اور جب وہ واپس گیا تو رابعہ کافی حد تک مطمئن ہو چکی تھیں۔ وہ نہ صرف چہرے سے بلکہ باتوں سے بھی شریف اور سلجھا ہوا لگتا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے معیز سے کہا تھا کہ وہ رابعہ کو لے کر اس کے گھر آئے تاکہ وہ اس کی امی سے مل سکیں۔ معیز نے ہامی بھر لی تھی۔

چند دنوں بعد جب رابعہ ولید کی امی سے ملیں تو ان کے باقی ماندہ خدشات بھی ہوا ہو گئے۔ وہ بھی اسی گرم جوشی سے ملی تھیں جیسے ولید ملا تھا۔ معیز کے رویے سے لگ رہا تھا جیسے وہاں اس کا بہت آنا جانا ہو کیونکہ وہ بڑی بے تکلفی سے وہاں چل پھر رہا تھا۔ رابعہ اب بالکل مطمئن ہو چکی تھیں۔

⁂

ولید اور معیز کی دوستی فورتھ کلاس میں ہوئی تھی۔ دونوں میں بظاہر کچھ بھی مشترک نہیں تھا۔ ولید کلاس کا سب سے قابل اسٹوڈنٹ تھا اور معیز اوسط درجے کا تھا لیکن جو چیز انہیں پاس لے آئی تھی، وہ اسپورٹس کا شوق تھا۔ اسپورٹس کے بارے میں معیز کی معلومات زبردست تھیں اور دوسری چیز جس نے ولید کو معیز کا گرویدہ کیا تھا، وہ معیز کی انگلش تھی۔ وہ مسقط میں ایک امریکن اسکول میں پڑھتا رہا تھا، اسی لیے وہ بڑی خوبصورت اور رواں انگلش اور عربی بولتا تھا۔ معیز کی طرف دوستی کا ہاتھ ولید نے بڑھایا تھا پھر ولید کے ساتھ رہنے سے یہ ہوا کہ معیز کی پڑھائی میں دلچسپی بڑھتی گئی۔ ناصر کی وفات کے بعد جب اس کے حالات بدلنا شروع ہوئے تو اس میں تبدیلیاں آنے لگیں اور اس نے ولید سے بھی الگ ہونے کی کوشش کی کیونکہ اب وہ خود کو ولید کے مقابلے میں کمتر محسوس کرتا تھا۔ ولید کو شروع میں اس کے رویے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی لیکن پھر اس نے ایک دن اسے پکڑ کر زبردستی اس سے پوچھنا شروع کر دیا اور اس کے پوچھنے پر معیز یک دم رونے لگا تھا۔ پھر اس نے ولید کو آہستہ آہستہ سب کچھ بتا دیا۔

ولید عمر میں اس سے ایک دو سال بڑا تھا اور بہت سمجھدار تھا اس نے معیز کو جتائے بغیر اس طرح اپنی سرگرمیوں میں انوالو کرنا شروع کر دیا جس طرح وہ پہلے کرتا تھا۔ ان کی دوستی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی اور اس میں بڑا ہاتھ ولید کا تھا۔ پھر جب معیز آٹھویں کلاس میں پہنچا تو اس نے

ولید سے کہا کہ وہ اپنے باپ سے بات کرے کہ وہ اس کو اپنی فیکٹری میں آ کر کام سیکھنے دیں۔

ولید کے ڈیڈی نے پہلے تو بالکل انکار کر دیا اور انھوں نے معیز سے کہا کہ اسے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ان کو بتائے وہ اسے دے دیں گے کیونکہ وہ اسے بھی ولید کی طرح ہی سمجھتے ہیں مگر بعد میں ولید کے اصرار پر وہ معیز کو کام سکھانے پر تیار ہو گئے۔ کیونکہ ولید جانتا تھا کہ معیز مفت میں کچھ بھی لینے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ ولید کے ڈیڈی نے بادل نخواستہ اسے فیکٹری آنے کی اجازت دی تھی لیکن معیز نے جس رفتار اور شوق سے کام سیکھنا شروع کیا تھا اس نے انھیں حیران کر دیا تھا۔

اسے سیکھنے کا صرف شوق ہی نہیں تھا بلکہ جنون تھا اور پھر وہ محنت سے بھی گھبراتا نہیں تھا۔ شروع میں ولید کے ڈیڈی اسے دو گھنٹے سے زیادہ وہاں رکنے نہیں دیتے تھے مگر آہستہ آہستہ وہ چار سے پانچ گھنٹے وہاں گزارنے لگا اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ولید کے ڈیڈی کو اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی، وہ پہلے پہل لیدر کی جیکٹس کسی دوسری فیکٹری سے تیار کرواتے تھے اور پھر اپنی پیکنگ اور اپنی کمپنی کے ٹیگ کے ساتھ اسے ایکسپورٹ کر دیتے تھے مگر بعد میں انھوں نے خود ہی جیکٹس تیار کروانا شروع کر دیں۔

شروع میں انھوں نے ایک ڈیزائنر رکھا تھا۔ معیز نے ان ہی دنوں فیکٹری میں آنا شروع کیا تھا۔ تیرہ سال کا وہ لڑکا سولہ سال تک پہنچتے پہنچتے نہ صرف جیکٹ کی کٹنگ سیونگ بلکہ ڈیزائننگ میں بھی ماہر ہو چکا تھا اور آہستہ آہستہ اس نے ان کی فیکٹری کے لیے جیکٹس ڈیزائن کرنا شروع کر دیں۔

انھیں دنوں راشد صاحب نے ولید کو ہائر سیکنڈری اسکول کے بعد مزید تعلیم کے لیے باہر بھجوایا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے اس کمپنی کو ٹریننگ کے لیے اس کا نام بھجوایا تھا جس کے ساتھ مل کر انھوں نے Joint venture کیا تھا، وہ تقریباً ایک سال کورس کر آیا تھا اور واپس آنے کے بعد اس نے ڈیزائننگ کے شعبے کا پورا کام اپنے سر لے لیا تھا۔ ان ہی دنوں ولید کے ڈیڈی نے اپنے بھائی سے اپنا کاروبار الگ کرنا شروع کیا تھا اور یہ معاملہ ایک بہت بڑے تنازعہ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

ان دنوں معیز ہر وقت ان کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ فیکٹری کے معاملات سنبھالا کرتا اور راشد صاحب اپنے مقدمے کے سلسلے میں کورٹس کے معاملات سے نبٹا کرتے۔ پھر اچانک ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا یہ معیز اور ولید دونوں کے لیے ایک بڑا صدمہ تھا۔

ولید اپنی تعلیم چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔ اس کے چچا نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا اور مختلف حربے استعمال کر کے مقدمہ جیت گئے تھے فیکٹری کے حصے ہو گئے تھے اور وہ بڑی فیکٹری ایک چھوٹی سی فیکٹری کی شکل میں ولید کے حصے میں آئی تھی۔ جس فرم کے نام سے وہ ساری ایکسپورٹ کرتے تھے، وہ ولید کے چچا کو مل گئی تھی۔ ولید ان معاملات میں ناتجربہ کار تھا۔ وہ کسی اور جھگڑے میں انوالو نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اس چھوٹی سی فیکٹری پر صبر کر لیا تھا۔

باپ کے چہلم کے بعد اس نے معیز سے کہا تھا کہ وہ امتحانات دینے واپس امریکہ جانا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ چاہتا ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں معیز فیکٹری کا انتظام سنبھالے۔ معیز نے فیکٹری کا انتظام سنبھالنے کی ہامی بھر لی تھی اور ولید پاور آف اٹارنی اسے دے کر امریکہ چلا گیا تھا۔

فیکٹری کا انتظام سنبھالتے ہی مشکلات کا ایک پہاڑ تھا جو معیز کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ باری باری فیکٹری میں کام کرنے والے بہترین کاریگر کام چھوڑ کر ولید کے چچا کی فیکٹری میں چلے گئے تھے کیونکہ انھوں نے ان لوگوں کو بہتر تنخواہ کی آفر کی تھی۔ جو پارٹیز پہلے ان کو آرڈر دیا کرتی تھیں، وہ اب ولید کے چچا کی فیکٹری کو آرڈر دیتی تھیں کیونکہ فرم کا نام وہی استعمال کرتے تھے۔

فیکٹری کے اکاؤنٹس میں اتنا روپیہ نہیں تھا کہ معیز کوئی بڑا آرڈر لیتا۔ وہ ویسے بھی کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا کیونکہ فیکٹری اس کی اپنی نہیں تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی خطرہ مول لے کر وہ فیکٹری کو مزید دشواری میں ڈال دے۔ ولید تقریباً چھ ماہ باہر رہا تھا اور ان چھ ماہ میں معیز اسے "سب اچھا ہے" کی رپورٹیں دیتا رہا تھا کیونکہ وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ فیکٹری کے اکاؤنٹ سے ولید کو اس کے اخراجات کے لیے اور اس کی فیملی کو ماہانہ خرچ کے لیے روپے بھجواتا رہا۔ ان چھ ماہ میں اس نے کچھ لوکل اور کچھ چھوٹے باہر کے آرڈرز پورے کیے تھے۔ مگر ان کی تعداد کم تھی۔ چھ ماہ بعد ولید امتحانات سے فارغ ہو کر واپس آ گیا تھا۔

معیز نے اس کی واپسی پر فیکٹری کی پوری صورت حال اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ ولید کو شاک لگا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ فیکٹری کے حالات اتنے خراب ہو چکے ہیں مگر وہ بہت جلد اس شاک سے باہر آ گیا تھا اور ایک بار پھر اس نے اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے معیز کی مدد مانگی تھی اور معیز نے ہر چیز کو پلان کرنا شروع کر دیا تھا ان کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا تھا کہ ان کے بہترین کاریگر انھیں چھوڑ گئے تھے اور اچھے کاریگر ملنا آسان نہیں تھا، معیز نے ولید کو مجبور کیا کہ وہ خود ان کاریگروں کے گھر جا کر انھیں زیادہ تنخواہ کی آفر دے کر واپس آنے پر مجبور کرے۔

ولید اس معاملے میں بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ان لوگوں نے نمک حرامی کی ہے اور مشکل وقت میں اس کا ساتھ چھوڑ کر گئے ہیں پھر اب وہ انھیں کیوں واپس لائے لیکن معیز نے بہت تحمل سے دلائل کے ساتھ اسے سمجھایا تھا کہ کاریگروں کو اس کی ضرورت نہیں، اسے کاریگروں کی ضرورت ہے اور انھوں نے نمک حرامی نہیں کی۔ وہ بھی انسان تھے مجبوریوں اور ضرورتوں سے بندھے۔ ولید کے والد کے انتقال کے بعد فیکٹری کا انتظام ڈانواں ڈول تھا اور کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ فیکٹری کے حالات ٹھیک ہو جائیں گے ایسی صورت حال میں جب انھیں ولید کے چچا کی طرف سے اچھی آفر ہوئی تو انھوں نے قبول کر لی۔

ولید اس کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا تھا۔

وہ دونوں ان پرانے کاریگروں کے گھر گئے جو دس پندرہ سال سے ولید کے باپ کے پاس کام کرتے رہے تھے اور انھیں زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا زیادہ تر کاریگر واپس آ گئے تھے۔

سب سے بڑا مسئلہ اب ان کے سامنے روپے کی فراہمی کا تھا۔ فیکٹری کے اکاؤنٹس میں زیادہ روپے نہیں تھے۔

اس مسئلے کو ولید نے حل کیا تھا اس نے اپنی فیکٹری اور گھر پر بینک سے لون لے لیا تھا، پھر دونوں کام میں جت گئے تھے۔ انھوں نے ایک نئی فرم لانچ کی اور ان ساری پارٹیز کو لیٹرز لکھے تھے جن کے ساتھ وہ پہلے بزنس کرتے تھے لیکن کسی طرف سے بھی کوئی حوصلہ افزا جواب نہ ملا، پھر ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ ولید کچھ سیمپل بنوا کر اپنے ساتھ یورپ اور امریکہ لے کر جائے گا اور آرڈر حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ جیکٹس کے یہ سیمپل

معیز نے خود ڈیزائن کیے تھے اور یہ اس کی پہلی مکمل ڈیزائننگ کا تجربہ تھا۔

ولید ان سیمپلز کو لے کر باہر چلا گیا اور اس بار انھیں مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ پہلی ہی پارٹی سے انھیں دس ہزار جیکٹس کا آرڈر مل گیا تھا اور یہ ان کے لیے ایک بہت بڑا آرڈر تھا۔ دونوں نے جی توڑ کر محنت سے یہ آرڈر پورا کیا تھا۔

ولید کو مال کے بارے میں زیادہ نہیں پتا تھا۔ وہ دفتری امور کو سرانجام دیتا رہا اور معیز نے ان جیکٹس کے لیے نہ صرف لیدر کی خریداری خود کی بلکہ تیاری کے ہر مرحلے میں خود انوالو رہا۔ اس نے ایک ایک جیکٹ کو خود ذاتی طور پر چیک کیا تھا۔ اس کے بعد ان کی پیکنگ کروائی تھی۔ وہ لوگ کاریگروں سے اوور ٹائم کرواتے رہے اور مقررہ وقت سے پہلے ہی انھوں نے آرڈر پورا کر دیا تھا۔

جیکٹس کی کوالٹی اور ڈیزائننگ اتنی پسند کی گئی تھی کہ فوراً ہی اسی فرم کی طرف سے انھیں ایک اور بڑا آرڈر مل گیا۔ پھر تو آرڈرز کی ایک لمبی لائن لگ گئی تھی اور بعض آرڈرز تو اتنے بڑے ہوتے کہ وہ انھیں کر سکتے تھے۔ اس لیے وہ انھیں انکار کر دیتے۔ آہستہ آہستہ ان کے پاس کاریگروں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ پہلے ان کے پاس پچیس تیس کاریگر ہوتے تھے۔ پھر یہ تعداد دو سو کے قریب پہنچ گئی۔ وقتی طور پر ہائر کرنے والے کاریگروں کی تعداد ان کے علاوہ تھی۔ انھوں نے فیکٹری کی عمارت میں بھی توسیع کی تھی اور آج کل انھوں نے کچھ نئی مشینری منگوائی ہوئی تھی جس کی تنصیب وہ اس نئے حصے میں کروا رہے تھے۔

معیز کا اگرچہ فیکٹری میں کوئی شیئر نہیں تھا اور نہ ہی اس کی ایسی کوئی خواہش تھی لیکن وہ اب پروڈکشن مینیجر کے طور پر کام کر رہا تھا اور ڈیزائننگ کے شعبے کا انچارج بھی وہی تھا۔ اس کو تقریباً تیس ہزار کے قریب تنخواہ ملتی تھی اور دوسری بہت سی سہولیات بھی مگر پھر بھی وہ مطمئن نہیں تھا۔ وہ اب اپنی الگ فیکٹری لگانا چاہتا تھا اور اسی لیے وہ اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ بینک میں جمع کرواتا جا رہا تھا۔ پھر ان ہی دنوں اس نے ایک کرائے کے گھر میں شفٹ ہونے کی کوشش کی تھی مگر ولید نے اس سے کہا کہ وہ کرائے پر گھر لینے کے بجائے اس کے اس گھر میں شفٹ ہو جائے جہاں وہ باہر سے کاروبار کے سلسلے میں آنے والے لوگوں کو ٹھہراتا تھا۔

معیز نے بہت پس و پیش کی تھی لیکن ولید نے اس کی ایک نہ سنی، اس کا کہنا تھا کہ وہ گھر زیادہ تر خالی ہی رہتا ہے اور دو منزلہ ہونے کی وجہ سے معیز اس کی کسی بھی منزل پر اپنی امی کے ساتھ رہ سکتا ہے اور بقیہ حصے میں کوئی بھی آنے والا مہمان ٹھہر سکتا ہے۔ رابعہ نے تب اپنی ماں کی وجہ سے معیز کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا اور معیز اکیلا ہی وہاں شفٹ ہو گیا تھا اور اب جب اس کی امی آنے پر تیار ہو گئی تھیں تو وہ انھیں بھی وہیں لے آیا تھا۔

رابعہ کو یہاں آتے ہی وہ بدلا ہوا لگنے لگا تھا اب وہ پہلے کی طرح سنجیدہ اور خاموش نہیں رہتا تھا بلکہ جب بھی گھر آتا تو زیادہ سے زیادہ وقت رابعہ کے پاس گزارنے کی کوشش کرتا انھیں اپنی باتیں بتاتا۔ اپنی مصروفیات کے بارے میں بتاتا ان سے مختلف قسم کے کھانوں کی فرمائش کرتا۔ چھوٹی چھوٹی بات پر ہنس پڑتا، پتا نہیں وہ اپنی کون کون سی خواہش کو دبائے بیٹھا تھا۔ رابعہ کو اب احساس ہو رہا تھا کہ اکلوتی اولاد کتنی تنہائی کا شکار ہوتی ہے اور وہ بھی جو معیز جیسے حالات سے دوچار رہی ہو۔

پھر چند ہفتوں کے بعد وہ اپنی امی سے ملنے گئی تھیں۔ وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں جب سعدیہ کی امی ان کے پاس آئی تھیں اور

انھیں سعدیہ کی شادی کا کارڈ دیا تھا۔ انھوں نے بجھے دل سے وہ کارڈ لیا تھا اور وہاں سے آ گئی تھیں۔ معیز نے سعدیہ کی شادی کا کارڈ دیکھنے پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ بالکل نارمل تھا۔

اس دن چھوٹے ماموں اور ان کی فیملی ایک شادی میں انوائیٹڈ تھے۔ معیز بھی ولید کے ساتھ اس شادی میں گیا ہوا تھا۔ دولہا ولید کا کاروباری دوست تھا اور اس حوالے سے معیز سے بھی اس کی اچھی جان پہچان تھی اور اس نے معیز کو بھی شادی میں انوائیٹ کیا تھا۔ چھوٹے ماموں معیز کو وہاں دیکھ کر کچھ حیران ہوئے تھے مکس گیدرنگ تھی اس لیے نہ صرف انھوں نے بلکہ ان کے بیوی بچوں نے بھی معیز کو دیکھا تھا۔

جس چیز نے انھیں زیادہ حیران کیا تھا وہ اس کا حلیہ تھا، وہ بلیک ڈنر سوٹ میں ریڈ پرنٹڈ ٹائی لگائے کہیں سے بھی کوئی معمولی ورکر نہیں لگ رہا تھا۔ معیز نے بھی انھیں دیکھ لیا تھا لیکن وہ ان کی طرف نہیں آیا۔ چھوٹے ماموں پوری طرح متجسس ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے دوست سے معیز کے بارے میں پوچھا تھا اور اس نے ان سے کہا تھا کہ معیز کو اس کے بیٹے نے انوائیٹ کیا ہے۔ اسے معیز کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں جب چھوٹے ماموں نے زیادہ ہی تجسس کا اظہار کیا تو وہ اپنے بیٹے کے پاس گیا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد آ کر اس نے انھیں معیز کے بارے میں معلومات دی تھیں۔

وہ جس فرم میں پروڈکشن مینیجر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس فرم نے پچھلے سالوں سے چیمبر آف کامرس میں اپنے بڑے بڑے ایکسپورٹ آرڈرز کی وجہ سے خاصی دھوم مچائی ہوئی تھی۔ چھوٹے ماموں خود بھی لیدر گڈز کی ایکسپورٹ کا کام کرتے تھے۔ انھیں اب یاد آیا تھا کہ چیمبر آف کامرس میں جب بھی اس فرم کا ذکر ہوتا تو اس کے پروڈکشن مینیجر معیز ناصر کا ذکر بھی ہوتا جسے کئی دوسری فیکٹریز بھاری تنخواہ پر اپنے لیے کام کرنے کی آفرز کر رہی تھیں مگر تب چھوٹے ماموں کو قطعاً خیال نہیں آیا تھا کہ معیز ناصر ان کا اپنا بھانجا بھی ہو سکتا ہے۔

ان کے دوست نے ان کی کیفیت سے بے خبر انھیں معیز کے بارے میں معلومات فراہم کر دی تھیں اور اب چھوٹے ماموں عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئے تھے اور کچھ یہی حال ان کے بیوی بچوں کا تھا۔ ان کو یاد آیا تھا چند ہفتے پہلے کس طرح انھوں نے کھڑے کھڑے اپنے گھر میں اس کی بے عزتی کی تھی اور انھوں نے یا ان کے کسی بھائی نے یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ دونوں کہاں گئے ہیں۔ کھانا کھانے کے دوران وہ سب گاہے بگاہے دور کھڑے ہوئے معیز کو دیکھتے رہے۔ جو کچھ لوگوں کے ساتھ کسی گفتگو میں مصروف کھانا کھا رہا تھا۔

واپسی پر گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے ان کی بیوی مسلسل رابعہ اور معیز پر تنقید کرتی رہی تھی مگر وہ خاموش رہے تھے اگلے دن تینوں گھروں میں معیز کے بارے میں معلومات اور خبریں گردش کر رہی تھیں اور ہر شخص بھونچکا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد رابعہ ایک بار پھر ماں سے ملنے آئی تھیں اور وہ اس بار اپنے استقبال سے حیران ہو گئی تھی۔ وہ بھابیاں جنھوں نے پچھلی دفعہ بمشکل ان کے سلام کا جواب دیا تھا اس بار ہنس ہنس کر ان کا حال احوال دریافت کر رہی تھیں۔ پھر جب وہ اپنی ماں کے پاس آ کر بیٹھیں تو ان کی بھابیاں باری باری وہاں آ گئی تھیں اور پھر بڑی بھابی اصل بات زبان پر لے ہی آئی تھیں۔ انھوں نے شکوہ کیا تھا کہ رابعہ اور معیز نے انھیں غیر سمجھا

جو انہیں اس کی ترقی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

رابعہ خود بھی حیران تھیں کیونکہ وہ صرف یہ جانتی تھی کہ معیز ولید کے ساتھ کام کرتا ہے مگر کس عہدے پر کام کرتا ہے اس سے وہ بے خبر تھیں پھر بھی انھوں نے اپنی بھابھیوں سے معذرت کر لی تھی۔

چند ہفتے پہلے جب وہ گھر چھوڑ کر آئی تھیں تو کسی نے جانے سے پہلے ان کے ایڈریس کے بارے میں نہیں پوچھا تھا اور اس دن انھوں نے اصرار کر کے ان کا ایڈریس لیا تھا پھر کچھ دن بعد ہی ان کے بڑے بھائی اور بھابھی ان سے ملنے آ موجود ہوئے تھے۔ گھر کو دیکھ کر وہ خاصے مرعوب ہوئے تھے حالانکہ رابعہ نے انھیں بتا دیا تھا کہ یہ گھر ان کا نہیں ہے۔ معیز کی واپسی سے پہلے وہ چلے گئے تھے پھر تو جیسے آمدورفت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ گاہے بگاہے ان کا کوئی نہ کوئی بہن بھائی ان سے ملنے آتا رہتا اور انھیں اپنے گھر مدعو کر جاتا۔

معیز بڑی خوش دلی اور خوش اخلاقی سے ہر ایک سے ملتا تھا حتیٰ کہ چھوٹے ماموں سے بھی جنھوں نے رابعہ سے اپنے رویے کی معذرت کر لی تھی معیز ان سے اس طرح پیش آیا تھا جیسے ان سے کبھی اس کا کوئی جھگڑا نہیں ہوا ہو۔

سعدیہ کی شادی پر چھوٹے ماموں زبردستی رابعہ کو شادی سے چند دن پہلے اپنے گھر لے آئے تھے۔ معیز شادی پر نہیں آیا تھا۔ اسے کسی کام سے کراچی جانا تھا۔ شادی کی ایک ایک رسم رابعہ کو خود پر بھاری لگی۔ سعدیہ دلہن بن کر اس قدر خوبصورت لگ رہی تھی کہ انھوں نے اسے دوبارہ نظر بھر کر نہیں دیکھا کہ کہیں اسے نظر نہ لگ جائے۔ لیکن انھیں بار بار معیز کا خیال آ رہا تھا وہ تصور میں اس کے شوہر کے بجائے معیز کو اس کے ساتھ بیٹھے دیکھنے لگتیں۔

انھیں یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ان کی سب سے قیمتی چیز چھین کر لے جا رہا تھا۔ سعدیہ کی شادی نے انھیں بہت نڈھال کر دیا تھا جس دن وہ واپس آئی تھیں۔ معیز انھیں گھر پر ہی ملا تھا اور اس نے رسمی سے انداز میں شادی کے بارے میں پوچھا تھا۔ رابعہ کے تاثرات سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ابھی بھی ناخوش ہیں۔ اس نے ایک بار پھر ماں کو دلاسا اور تسلی دی تھی۔

''ولید! میں اپنی الگ فیکٹری کھولنا چاہتا ہوں اور کچھ دوسری فرمز کی طرف سے مجھے جیکٹس کی ڈیزائننگ کے لیے آفرز ہیں۔ میں ان کے لیے بھی کام کرنا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے فیکٹری کے لیے ابھی بہت سے روپے کی ضرورت ہے۔ میں تمھیں یہ سب اس لیے بتا رہا ہوں کیونکہ میں اصولی طور پر تمہارا ملازم ہوں اور مجھے کسی اور کے لیے کام کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس لیے میں ریزائن کرنا چاہتا ہوں۔''

اس دن وہ ولید کے آفس میں بیٹھا اسے شاک پر شاک دے رہا تھا۔

''معیز! تمھیں کس چیز کی کمی ہے۔ میں نے ہمیشہ تمھیں ہر سہولت پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے تمھیں کبھی ملازم نہیں سمجھا، یہ فرم جتنی میری ہے۔ اس سے زیادہ تمہاری ہے پھر تم یہ جاب کیوں چھوڑنا چاہتے ہو؟'' ولید اس کی باتوں پر بھونچکا رہ گیا تھا۔

ولید! مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے میں یہ بھی مانتا ہوں کہ مجھے ہر قسم کی سہولت دی گئی ہے لیکن پھر بھی میری حیثیت اس فیکٹری میں ایک

ملازم کی ہے۔ مجھے ابھی زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے۔ یہ جاب تو صرف ایک آغاز تھا۔''

ولید نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

''جذبات میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب کچھ بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ میں تمھیں چھوڑ کر نہیں جا رہا۔ تم اگر چاہو گے تو میں تمھارے لیے بھی کام کروں گا لیکن میں اپنی الگ فیکٹری بھی قائم کرنا چاہتا ہوں۔ تم میری خواہشات اور عزائم سے واقف ہو اور میری خواہشات میں صرف ایک باب شامل نہیں ہے، مجھے زندگی میں بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔ اس لیے بہت غیر جانبدار ہو کر میرے فیصلے کے بارے میں سوچو۔''

''تم فیکٹری لگانا چاہتے ہو۔ لیکن اس کے لیے تمھیں سرمایہ کہاں سے ملے گا؟'' ولید نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس سے سوال کیا۔

''کچھ غیر ملکی کمپنیز جن کے ساتھ میں کافی عرصے سے بات چیت کرتا آرہا ہوں۔ ان ہی میں سے ایک کمپنی یہاں جوائنٹ وینچر کرنا چاہتی ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ وہ میرے ساتھ یہ پروجیکٹ کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ کچھ روپیہ میرے پاس ہے اور کچھ میں دوسری فرمز کے لیے کام کر کے اکٹھا کر لوں گا لیکن ابھی یہ صرف منصوبے ہیں کوئی چیز بھی فائنل نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے، میں اسی سال اپنی فیکٹری شروع کر دوں ہو سکتا ہے اس میں کچھ سال لگ جائیں۔''

''تم میرے ساتھ مل کر یہ فیکٹری کیوں نہیں لگا لیتے۔'' ولید نے اچانک اسے ایک آفر دی تھی۔

''تمھارے ساتھ؟'' وہ کچھ حیران ہوا تھا۔

''ہاں میرے ساتھ۔ تم اپنی فیکٹری میں میرے شیئرز رکھو ساٹھ پرسنٹ تمھارے اور چالیس پرسنٹ میرے اس کے بدلے میں تمھاری فیکٹری کے لیے سرمایہ فراہم کروں گا۔ لیکن اس فیکٹری کے انتظامات میں میرا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ اس کے ورکنگ پارٹنر تم ہو گے۔''

معیز اس پیش کش پر حیران تھا۔ ''اور اگر سرمایہ ڈوب گیا تو؟'' اس نے ولید سے کہا تھا۔

''تب وہ میری ذمہ داری ہوگی۔ میں تمھیں اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہراؤں گا۔'' اس نے جیسے بات ہی ختم کر دی تھی۔

''تم فیکٹری کے لیے سائٹ تلاش کرو۔''

معیز نے اس کی آفر قبول کر لی تھی۔ چند ہفتوں میں اس نے فیکٹری کے لیے سائٹ تلاش کی اور تعمیر شروع کروا دی۔ قسمت کا ہر در اس پر جیسے کھلتا ہی جا رہا تھا۔ وہ جس کمپنی کے ساتھ جوائنٹ وینچر کرنا چاہتا تھا انھوں نے اس کے ساتھ ڈیل سائن کر لی اب اگر وہ چاہتا تو ولید کے سرمائے کے بغیر بھی فیکٹری تعمیر کر سکتا تھا لیکن اس نے ولید کے ساتھ پارٹنر شپ ختم نہیں کی تھی۔ فیکٹری کے لیے عمارت اس نے تعمیر کروائی تھی اور روپیہ اور مشینری ولید اور اس کمپنی نے فراہم کیا تھا۔ ڈیڑھ سال میں یہ پروجیکٹ مکمل ہوا تھا اور پھر جیسے روپے کی ایک ریٹ ریس تھی جس میں وہ شریک ہو گیا تھا۔

پہلے اسے روپیہ کمانے کے لیے محنت کرنی پڑتی تھی اب روپیہ جیسے اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ پہلے اس نے لیدر گڈز ایکسپورٹ کرنی شروع کی تھیں پھر گڈز کی رینج میں اضافہ ہوتا گیا۔ لیدر سے وہ سپورٹس گڈز کی طرف آیا اور پھر کارپٹ انڈسٹری کی طرف۔ اس کے ہاتھ جیسے کوئی پارس آ گیا تھا کہ وہ جس چیز کو بھی چھوتا وہ سونا بن جاتی۔

لوگوں کو اس کی کامیابی پر رشک آتا تھا۔ سات سال اسی طرح گزر گئے اور ان سات سالوں میں وہ ظاہری طور پر بالکل بدل گیا تھا۔ جو لوگ پہلے ان سے کتراتے تھے، اب ان کے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ باطنی طور پر معیز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ خوش اخلاق اور نرم مزاج ہو گیا تھا۔ یہی حال رابعہ کا تھا۔

معیز کے چھوٹے ماموں نے رابعہ سے کہا تھا کہ وہ معیز کے لیے اپنی چھوٹی بیٹی کا رشتہ دینا چاہتے ہیں اور یہ پہلا موقع تھا جب رابعہ نے انھیں کسی بات پر انکار کیا تھا۔

''سجاد بھائی! اب مجھے معیز کی شادی آپ کے گھر نہیں کرنی۔ سعدیہ سے رشتہ آپ نے توڑ ڈالا تھا۔ اب پھر آپ کی چھوٹی بیٹی سے رشتہ کروں اور کل کو میرے بیٹے پر کوئی برا وقت آ جائے تو آپ تو پھر رشتہ توڑ دیں گے۔ نہیں آپ مجھے معاف کر دیجئے گا لیکن میں یہ رشتہ نہیں کروں گی۔''

سجاد بھائی کو ان کا جواب طمانچے کی طرح لگا تھا لیکن وہ جواب میں کچھ بول نہیں پائے اور وہ خاندان میں واحد نہیں تھے جو اپنی بیٹی کے لیے معیز کا رشتہ چاہتے تھے۔ لیکن معیز خاندان میں شادی کرنا نہیں چاہتا تھا اور رابعہ کا اصرار بھی اسے خاندان میں شادی پر آمادہ نہیں کر سکا تھا۔

وہ موڑ کاٹ رہی تھی جب اس نے ایک بوڑھی عورت کو ایک گاڑی سے ٹکراتے اور دور گرتے دیکھا۔ وہ گاڑی رکنے کے بجائے ایک طوفانی رفتار سے وہاں سے نکل گئی تھی۔ اسے عورت کی فکر لاحق ہوگئی اپنی گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے وہ اس جگہ آئی، جہاں وہ عورت گری تھی۔ تیزی سے وہ اس عورت کے پاس آئی اور سیدھا کیا۔ وہ عورت کراہ رہی تھی اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر متلاشی نظروں سے اردگرد دیکھا اور پھر ایک آتی ہوئی گاڑی کو ہاتھ دے کر روکا اور اسے ڈرائیو کرنے والے آدمی کے ساتھ مل کر بوڑھی عورت کو اٹھا کر اپنی گاڑی میں لٹا دیا۔ عورت نیم غشی کے عالم میں تھی، پھر وہ سیدھی اسے ایک پرائیویٹ کلینک لے آئی، نرس اور وارڈ بوائے نے جب اس عورت کو اسٹریچر پر منتقل کیا تھا تو وہ تب بھی کراہ رہی تھی۔

اس نے اس عورت کا ہاتھ تھام کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی چیک اپ کے بعد ڈاکٹرز نے اسے بتایا تھا کہ اس عورت کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے اور اس کا آپریشن کرنا پڑے گا۔ آپریشن کے لیے انھوں نے جتنی رقم مانگی تھی وہ اس کے پاس نہیں تھی۔ اسنے کاؤنٹر پر ریسپشنسٹ کو کہا کہ وہ یہ رقم گھر سے لے آتی ہے تب تک وہ گارنٹی کے طور پر اس کا لاکٹ اور ایئر رنگز رکھ لیں اور اس عورت کا آپریشن کر دیں تا کہ وہ اس طرح تکلیف سے تڑپتی نہ رہے۔ ریسپشنسٹ نے ڈاکٹر سے بات کی اور پھر اس نے اس کا لاکٹ اور ایئر رنگز رکھ لیے۔ وہ گھر آئی اور وہاں سے چیک بک لے کر بینک گئی۔ جب وہ واپس ہاسپٹل پہنچی تو اسے پتا چلا کہ وہ عورت ہوش میں آ گئی تھی اور اس کا بیٹا اسے وہاں سے لے گیا تھا اور اس نے بل بھی ادا کر دیا تھا ریسپشنسٹ نے اسے ایک کارڈ دیا تھا جو اس عورت کا بیٹا اس کے لیے دے گیا تھا تا کہ وہ اس سے رابطہ کرے۔

اس نے کارڈ نہیں لیا تھا، اسے رابطہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اسے یہ جان کر ہی تسلی ہوگئی تھی کہ وہ عورت محفوظ تھی اور وہ اپنے خاندان کے پاس پہنچ گئی تھی۔ وہ ریسپشنسٹ سے اپنی چیزیں لے کر واپس آ گئی۔

معیز کو رابعہ کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع آفس میں ملی تھی اور وہ اندھا دھند اس کلینک کی طرف دوڑ پڑا، ماں کو ہوش میں دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی تھی وہ اپنی تکلیف پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر بڑھاپے کی چوٹ کی تکلیف پر قابو پانا آسان نہیں ہوتا۔ ماں کو دیکھنے کے بعد وہ بل ادا کرنے کے لیے کاؤنٹر پر گیا تھا۔ بل ادا کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا کہ رابعہ کو وہاں کون لایا تھا۔

''عائشہ حسن نامی ایک لڑکی تھی اس نے بتایا تھا کہ کوئی گاڑی انھیں ٹکر مار کر چلی گئی تھی اور وہ انھیں اٹھا کر یہاں لے آئی تھی۔ بل کے لیے اس نے ہمیں کچھ روپے دیے تھے لیکن اس کے پاس زیادہ روپے نہیں تھے، اس لیے اس نے اپنی کچھ جیولری ہمیں دی تھی کہ ہم یہ رکھ لیں اور آپریشن کر دیں کیونکہ آپ کی والدہ کو فوری آپریشن کی ضرورت تھی۔''

ریسپشنسٹ نے بل بناتے ہوئے وہ جیولری نکال کر اس کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دی۔ وہ ایک عجیب سی کیفیت میں وہاں کھڑا رہ گیا۔ پتا نہیں وہ کون تھی جس نے اپنے جسم پر سجایا ہوا زیور اس کی ماں کی جان بچانے کے لیے دے دیا تھا۔ اگر وہ لڑکی اس وقت اس کے سامنے ہوتی تو وہ شاید اس کے قدموں پر گر جاتا۔ اس وقت اس کی کچھ ایسی ہی حالت ہو رہی تھی۔ معیز نے اس لاکٹ کو ہاتھ میں لے کر دیکھا، ایک خوبصورت تختی پر اللہ کا نام بڑے خوبصورت انداز میں منقش تھا۔ معیز نے دوبارہ اسے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ بل ادا کرتے ہوئے اس نے نرس کو اپنا کارڈ دیا۔

''دیکھیں، یہ جب واپس آئیں تو انھیں ان کے روپے اور جیولری واپس کر دیں اور انھیں یہ کارڈ دے کر کہیں کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے جلدی ہے کیونکہ میں اپنی امی کو کسی اچھے ہاسپٹل میں شفٹ کرنا چاہتا ہوں ورنہ میں یہیں رک کر ان کا انتظار کرتا۔''

اس نے ریسپشنسٹ سے کہا اور پھر اپنی امی کو لے کر ایک بڑے کلینک پر آ گیا۔ ایک دفعہ پھر رابعہ کے ٹیسٹ ہوئے اور دو گھنٹے کے چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ رابعہ کا آپریشن ٹھیک کیا گیا تھا اور اب اسے کسی انتہائی نگہداشت کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے تسلی ہو گئی تھی اس سارے عرصے کے دوران اسے بار بار اس لڑکی کا خیال آتا رہا، وہ منتظر تھا کہ وہ لڑکی کارڈ پانے کے بعد اس سے رابطہ قائم کرے لیکن اس نے کوئی رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اگلے دن اس نے اپنی ماں کو اس لڑکی کے بارے میں بتایا۔ رابعہ کو بے اختیار وہ آواز یاد آ گئی جو ہاسپٹل لے جاتے ہوئے مسلسل اسے کچھ کہتی رہی تھی۔ وہ عام طور پر گھر سے باہر نہیں جاتی تھیں مگر چھ ماہ قبل اس نئے گھر میں منتقل ہونے کے بعد وہ اکثر ماڈل ٹاؤن کے پارک میں چلی جاتی تھیں جو گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ وہاں وہ کافی دیر بیٹھی رہتیں۔ لوگوں کو گھومتے دیکھتیں اور تنہائی کا احساس ختم ہو جاتا۔ اس دن بھی وہ پارک میں چہل قدمی کے بعد واپس آ رہی تھیں جب اچانک سڑک پار کرتے ہوئے وہ اس گاڑی کے سامنے آ گئیں۔ ساری غلطی نہ تو ان کی تھی نہ ہی گاڑی کے ڈرائیور کی۔ گاڑی سے ٹکرانے کے بعد وہ نیم بے ہوش ہو گئی تھیں۔ ٹانگ اور سر میں اٹھتی ہوئی درد کی لہروں کے باوجود انھیں وہ لمس یاد تھا جو وقتاً فوقتاً ان کا ہاتھ تھام لیتا تھا۔

چند دنوں تک وہ دونوں ہی اس لڑکی کا انتظار کرتے رہے پھر رابعہ نے معیز سے کہا کہ وہ خود اس لڑکی کا پتا لگانے کی کوشش کرے معیز دوبارہ اس کلینک پر گیا تھا اور اس نے انکوائری کاؤنٹر سے اس لڑکی کا ایڈریس حاصل کرنے کی کوشش کی تھی ریسپشنسٹ نے چند منٹوں کی تلاش کے بعد عائشہ حسن کا ایڈریس اس کے سامنے کر دیا۔

''بالکل جی، نام پتا تو انھوں نے لکھوایا تھا۔ اب پتا نہیں یہ صحیح ہے یا نہیں۔'' ریسپشنسٹ نے کہا۔

معیز وہ پتا دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ اس کے ساتھ والے گھر کا ایڈریس تھا۔ گھر واپس جاتے ہوئے معیز گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے گھر سے آگے لے گیا تھا اور پھر اس گھر کے آگے گاڑی روک کر وہ بڑے دھیان سے اس گھر کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ اس کے گھر کی نسبت بہت چھوٹا گھر تھا اور اس کے سامنے ایک مختصر سالان بھی تھا۔ وہ گاڑی ٹرن کر کے واپس آ گیا۔ ایک ہفتے کے بعد وہ رابعہ کو لے کر گھر واپس آ گیا۔ ڈاکٹر کے کہنے پر اس نے رابعہ کے لیے وہیل چیئر منگوالی تھی تاکہ وہ ہر وقت گھر ہی میں نہ رہیں اور گھر میں آسانی سے پھرنے کے علاوہ باہر بھی نکل سکیں۔ ایک کل وقتی نرس بھی اس نے ان کے لیے رکھ دی۔

معیز نے رابعہ کو بتا دیا تھا کہ وہ لڑکی ان کے ساتھ والے گھر میں رہتی ہے۔ وہ بھی اس اتفاق پر حیران ہوئی تھیں۔ گھر آنے کے دوسرے ہی دن انھوں نے معیز سے کہا تھا کہ وہ اس لڑکی کے گھر جا کر اس کا شکریہ ادا کرے اور ہو سکے تو اسے ان کے پاس لے کر آئے تاکہ وہ خود اس کا شکریہ ادا کر سکیں۔ معیز شام کو اس گھر کی طرف آیا تھا۔ بیل بجانے پر چودہ سالہ ایک لڑکا باہر آیا۔ معیز کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا کہے۔

''میں آپ کے ساتھ والے گھر میں رہتا ہوں۔'' اس نے ہاتھ سے اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا۔لڑکے کے چہرے پر یک دم مرعوبیت کے آثار نمودار ہو گئے۔

''میرے ابو تو فوت ہو چکے ہیں۔آپ اندر آئیں میں آپ کو اپنی امی سے ملوا دیتا ہوں۔''

معیز اس کے ساتھ چلتا ہوا اندر آ گیا، وہ لڑکا اسے اندرونی دروازے پر ٹھہرا کر اندر چلا گیا۔چند منٹوں کے بعد وہ واپس آیا اور اسے اندر لے گیا۔ایک بہت ہی ویل ڈیکوریٹڈ ڈرائنگ روم اس کے سامنے تھا۔وہ لڑکا اسے وہاں بٹھا کر غائب ہو گیا۔معیز طائرانہ نظروں سے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتا رہا، کچھ دیر بعد وہ لڑکا ایک ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔معیز عورت کے اندر آنے پر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھو بیٹا بیٹھو۔'' اس عورت نے نرمی سے اس سے کہا اور خود بھی سامنے صوفہ پر بیٹھ گئی۔

''میں آپ کے ساتھ والے گھر سے آیا ہوں۔چند دن پہلے۔'' معیز نے بات شروع کی اور آہستہ آہستہ ساری باتیں بتا دیں۔اسے اس عورت اور لڑکے کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی۔وہ بہت عجیب سی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

''مجھے یہ تو نہیں پتہ کہ آپ کا عائشہ حسن سے کیا رشتہ ہے مگر میں ان سے مل کر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

معیز نے اپنی بات کے اختتام پر کہا تھا۔

''بیٹا! وہ میری بیٹی ہے۔اس وقت تو وہ آفس میں ہو گی۔آج وہ دیر سے آئے گی۔دراصل وہ ایک کمپنی میں سیلز آفیسر ہے۔اسے اکثر دیر ہو جاتی ہے۔میں تمہارا پیغام اس تک پہنچا دوں گی لیکن شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔تکلیف میں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔میں کل تمہاری امی کی خیریت دریافت کرنے آؤں گی۔'' عائشہ کی امی نے کہا پھر بات چیت کا یہ سلسلہ کچھ دیر تک جاری رہا۔معیز اٹھنا چاہتا تھا مگر عائشہ کی امی کے اصرار پر وہ چائے کے لیے رک گیا۔

دوسرے دن شام کو عائشہ کی امی ان کے گھر آئی تھیں۔معیز صرف ان کے لیے خاص طور پر گھر ٹھہرا ہوا تھا۔عائشہ ان کے ساتھ نہیں تھی۔اس کی امی نے ایک بار پھر اس کی طرف سے معذرت کی کہ اسے کوئی ضروری کام تھا اس لیے وہ نہیں آ سکی۔

رابعہ نے عائشہ کی امی کو زبردستی کھانے پر روک لیا تھا اور کھانے پر ان کے لیے خصوصی اہتمام کیا تھا باتوں باتوں میں انہوں نے عائشہ کی امی سے ساری معلومات حاصل کر لی تھیں۔ان کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے تھے سب سے بڑا بیٹا امریکہ میں ہوتا تھا اور اس نے وہیں شادی کر رکھی تھی۔اس کے بعد عائشہ تھی۔اس سے چھوٹی فریحہ تھی جس کی شادی اس کے تایا کے بیٹے سے ہوئی تھی اور ایک بیٹی اور ایک بیٹا بالترتیب بی اے اور ایف ایس سی میں پڑھتے تھے۔

عائشہ کی امی سادہ مزاج کی تھیں اور یہی خصوصیات رابعہ میں تھیں اس لیے دونوں ایک دوسرے کی صحبت سے کافی محظوظ ہوئی تھیں۔

آہستہ آہستہ دونوں گھروں میں میل جول شروع ہو گیا۔ رابعہ کو عائشہ سے ملنے کا جتنا اشتیاق تھا وہ ان سے اتنا ہی کترا رہی تھی۔ ان کے بے حد اصرار کے باوجود وہ ان کے گھر نہیں آئی تھی۔ ہر بار اس کی امی اس کی مصروفیت کا بہانہ بنا دیتیں۔ رابعہ کا اشتیاق بڑھتا ہی گیا تھا اور یہی اشتیاق ایک دن انھیں بنا بتائے عائشہ کے گھر لے گیا تھا۔ وہ وہیل چیئر پر نرس کی مدد سے اس کے گھر گئی تھیں۔ عائشہ کی امی انھیں دیکھ کر حیران ہو گئی تھیں۔ انھوں نے رابعہ کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور پھر ان کے اصرار پر عائشہ کو بلانے چلی گئیں۔ دس پندرہ منٹ بعد سفید کھدر کے کرتے اور سیاہ شلوار اور دوپٹہ میں ملبوس تراشیدہ بالوں والی ایک دراز قد لڑکی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس نے اندر آتے ہی رابعہ کو سلام کیا اور پھر صوفہ پر بیٹھ گئی۔

''تم عائشہ ہو؟'' رابعہ نے بے اختیار اس سے پوچھا۔

''ہاں، آپ کیسی ہیں؟'' اس کا لہجہ اور چہرہ دونوں بے تاثر تھے مگر رابعہ کو اس وقت اس پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔

''بیٹا! میرے پاس آؤ'' رابعہ نے بے ساختہ بازو پھیلا دیے۔ اس نے حیرانی سے ان کو دیکھا اور پھر جیسے شش و پنج میں پڑ گئی۔ رابعہ نے ایک بار پھر اسے اپنے پاس بلایا۔ اس بار وہ کچھ جھجکتے ہوئے ان کے پاس آ گئی، رابعہ نے پاس آنے پر اسے گلے لگایا اور اس کا ماتھا چوم لیا۔ وہ یک دم جیسے ہکا بکا رہ گئی تھی۔ تب ہی اس کی امی کمرے میں آ گئی تھیں۔

وہ کچھ نروس سی دوبارہ صوفہ پر بیٹھ گئی۔ رابعہ اس کا شکریہ ادا کرتی رہیں مگر وہ گونگوں کی طرح گم صم بیٹھی رہی پھر کچھ دیر بعد وہ کسی کام کا بہانہ بنا کر اٹھی اور دوبارہ اندر نہیں آئی۔ رابعہ کافی دیر تک عائشہ کی امی کے پاس بیٹھی رہیں اور پھر گھر واپس آ گئیں۔

معیز جب رات کو گھر آیا تو رابعہ نے اسے عائشہ سے ملاقات کا قصہ بڑی بے چینی سے سنایا وہ ماں کی بے تابی پر مسکراتا رہا۔

''آپ ایسا کریں امی! ان کی پوری فیملی کو کھانے پر بلائیں۔ میں بھی عائشہ سے مل لوں گا اور اس کا شکریہ ادا کر دوں گا۔ آپ تو کر ہی چکی ہیں۔''

اس نے کھانا کھاتے ہوئے سرسری انداز میں رابعہ سے کہا تھا۔

''ہاں، ٹھیک ہے۔ میں ان لوگوں کو کھانے پر بلاؤں گی۔'' رابعہ کو اس کی تجویز اچھی لگی تھی۔

تیسرے دن انھوں نے عائشہ کی امی کو کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ عائشہ کی امی نے شروع میں انکار کیا مگر رابعہ نے اتنا اصرار کیا کہ وہ دعوت قبول کرنے پر تیار ہو گئیں۔ لیکن جس دن وہ لوگ کھانے پر آئے تھے اس دن عائشہ ان کے ساتھ نہیں تھی۔ رابعہ کو مایوسی ہوئی۔ ان کے پوچھنے پر عائشہ کی امی نے کہا کہ عائشہ آج کسی دوست کی شادی پر گئی ہے، اس وجہ سے نہیں آ سکی۔ رابعہ ان کی بات سن کر خاموش ہو گئیں۔

پھر ایسا ایک بار نہیں کئی بار ہوا تھا۔ وہ مختلف تقاریب میں عائشہ کو بلا لیتیں مگر عائشہ کی فیملی تو ان کے گھر آ جاتی مگر وہ کبھی نہیں آئی۔ دو تین بار رابعہ نے خود جا کر بھی اسے آنے کی دعوت دی وہ خاموشی سے ہامی بھر لیتی مگر پھر نہیں آتی۔ رابعہ کو یہ محسوس ہونے لگا جیسے وہ ان سے کترانے کی کوشش کرتی ہے اور یہ بات انھیں کافی عجیب لگی تھی۔ عائشہ کے گھر وہ اکثر جاتی رہتی تھیں مگر عائشہ سے ان کا سامنا بہت کم ہی ہوتا تھا اگر ہو بھی جاتا تو بھی عائشہ سلام دعا کے بعد اپنے کمرے میں چلی جاتی اور دوبارہ سامنے نہ آتی اور پھر اگر وہ عائشہ سے ملنا بھی چاہتیں تو بھی وہ نیچے نہ آتی اور انھیں

یوں لگتا جیسے عائشہ کی امی بھی یہ نہیں چاہتیں کہ عائشہ زیادہ دیر ان کے پاس بیٹھے۔ عائشہ کے برعکس سب سے چھوٹی بہن معصومہ سارا وقت ان کے پاس بیٹھی رہتی۔ رابعہ کو اس کی عادات بہت پسند تھیں اور وہ اکثر اوقات اسے اپنے گھر کسی نہ کسی کام کے لیے بلاتی رہتیں۔

اس دن رابعہ نے اپنے گھر پر میلاد کروایا تھا۔ چھٹی ہونے کی وجہ سے عائشہ بھی گھر پر ہی تھی۔ رابعہ نے ایک دن پہلے عائشہ کی امی کو اس تقریب کے بارے میں بتا دیا تھا۔ حسب معمول عائشہ کی امی معصومہ کے ساتھ رابعہ کے ہاں چلی آئی تھیں۔ عائشہ کو ان کے ساتھ نہ دیکھ کر رابعہ نے اس کے بارے میں پوچھا تھا اور پھر اسے خود لانے کے لیے اس کے گھر چلی آئی تھیں۔ عائشہ کے بہانوں کے باوجود وہ پہلی بار اسے زبردستی اپنے گھر لے آئی تھیں۔ یہاں آ کر عائشہ قدرے نروس ہو گئی تھی۔ رابعہ نے باری باری اسے اپنے پورے خاندان سے متعارف کروایا تھا اور وہ رابعہ کے منہ سے اپنی تعریفیں سن سن کر شرمندہ ہوتی رہی تھیں۔ رابعہ کے اصرار کی وجہ سے اسے تقریب کے اختتام تک رکنا پڑا ورنہ وہ بہت پہلے ہی واپس آ جانا چاہتی تھی۔

اس تقریب کے بعد رابعہ اسے اکثر ضد کر کے اپنے گھر لے جانے لگی تھیں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی بات مان لیتی اور ان کے گھر آ جاتی اور پھر یہ جیسے ایک معمول ہو گیا تھا۔ وہ اکثر اس وقت رابعہ کے گھر جاتی تھی۔ جب معیز گھر پر نہیں ہوتا تھا۔ چھٹی والے دن بھی وہ فیکٹری چلا جایا کرتا تھا اور اسی وجہ سے ان دونوں کی کبھی ایک دوسرے سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مگر صرف ملاقات نہیں ہوئی تھی ورنہ رابعہ کی زبانی وہ معیز کے بارے میں سب کچھ جان چکی تھی۔ وہ کیا کھاتا ہے۔ کیا پہنتا ہے کیا پسند کرتا ہے۔ کیا ناپسند کرتا ہے۔ اس نے بچپن کیسے گزارا ہے کتنی محنت کی ہے کون کون سی تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ کیسی تنگی دیکھی ہے۔

رابعہ نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ ان کی زبان پر ہر وقت معیز کا نام ہی رہتا تھا۔ وہ چپ چاپ ان کی زبان سے معیز کے قصے سنتی رہتی اور ان کا چہرہ دیکھتی رہتی۔ معیز کے نام پر ان کا چہرہ چمکنے لگتا تھا۔

شروع شروع میں وہ صرف مروتاً رابعہ سے معیز کے قصے سنا کرتی تھی اور اکثر رابعہ کی ایسی گفتگو کے دوران اس کا دماغ کہیں اور پہنچا ہوا ہوتا تھا۔ رابعہ اپنی دھن میں بولتی جاتیں۔ انھیں اندازہ ہی نہ ہو پاتا کہ وہ متوجہ نہیں ہے مگر پھر آہستہ آہستہ اسے معیز اور اس کی زندگی میں دلچسپی ہونے لگی تھی۔ وہ اسے اپنے جیسا لگنے لگا تھا۔ گر گر کر اٹھنے والا ٹھوکریں کھا کر سنبھلنے والا۔

اس دن بھی وہ اس سے دوسری باتیں کرتے کرتے معیز کا ذکر لے بیٹھی تھیں۔

"دنیا میں بہت سے لوگوں کی اولاد نیک اور تابعدار ہوتی ہے مگر میں کہتی ہوں، جتنا ادب، لحاظ اور مروت معیز میں ہے میں نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔ میری عزت تو کرتا ہی ہے۔ ظاہر ہے میں اس کی ماں ہوں مگر دیکھو عائشہ! میرے بیٹے کا ظرف کتنا بلند ہے کہ اپنے ان رشتہ داروں کی بھی عزت کرتا ہے جنھوں نے پوری زندگی اس کا مذاق اڑایا۔ مجال ہے جو کبھی اس نے کسی کو جتایا ہو کہ اس نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا

میرے بھائیوں اور ان کی اولادوں نے ساری عمر اسے ذلیل کیا، اس کی شکل سے لے کر لباس اور کھانے پینے کے طریقے تک پر اعتراض کرتے رہے۔ مذاق اڑاتے رہے۔ بے عزت کرتے رہے۔ مگر معیز کا اتنا حوصلہ ہے کہ وہ جب بھی ان سے ملتا ہے بہت ہنس کر ملتا ہے۔ میرے بھائی کہتے ہیں کہ اتنی عزت ان کی اپنی اولاد نہیں کرتی جتنی معیز ان کی کرتا ہے۔ کبھی اس نے انھیں پلٹ کر جواب نہیں دیا۔ ان سے بدتمیزی نہیں کی۔ ان کے جھڑکنے پر ناک بھوں نہیں چڑھائی۔ کبھی ان کے سامنے اونچی یا تیز آواز میں بات نہیں کی۔ پہلے کی تو خیر بات ہی اور تھی، وہ ان کے گھر پہ رہتا تھا، عزت کرنے پر مجبور تھا مگر وہ اب بھی جب اسے کوئی مجبوری نہیں ہے۔ ان کی اسی طرح عزت کرتا ہے۔

میں کہتی ہوں۔ خدا معیز جیسی اولاد سب کو دے۔ اسے اس کے صبر، برداشت اور محنت کا اجر ملا ہے۔ جب یہ چھوٹا ہوتا تھا تو مجھے خیال آتا تھا کہ میں اسے کس طرح پالوں گی۔ یہ اتنا ضدی اور بدتمیز ہوتا تھا۔ مگر ناصر کے مرنے کے بعد اس میں خود برداشت پیدا ہوگئی۔ مجال ہے اس نے کبھی بچپن میں مجھے عام بچوں کی طرح مختلف چیزیں مانگ مانگ کر تنگ کیا ہو بس جو لا دیتی تھی۔ خاموشی سے لے لیتا تھا۔ بعض دفعہ تو مجھے رونا آجاتا تھا کہ یہ عام بچوں کی طرح ضد کیوں نہیں کرتا۔ مجھے یہی خوف رہتا تھا کہ یہ کہیں بگڑ نہ جائے مگر خدا کا ایسا کرم ہے کہ مجھے کبھی اس کی نگرانی کرنی نہیں پڑی۔ اس کی زندگی اتنی سیدھی گزری ہے۔"

وہ معیز کے بارے میں مسلسل بولتی جا رہی تھیں اور عائشہ بیزار ہونے کے بجائے مستقل ان کی باتیں سن رہی تھی اور اس کی دلچسپی اب پہلے سے بڑھ گئی تھی۔

⁂

اس دن چھٹی تھی۔ وہ حسب معمول صبح دس بجے اٹھی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد یک دم اس کا دل رابعہ کے گھر جانے کو چاہا اور وہ ان کی طرف آگئی۔ رابعہ اسے اس وقت ہمیشہ اپنے کمرے میں ہی ملا کرتی تھیں۔ وہ سیدھا ان کے کمرے کی طرف آئی اور دروازہ بجا کر حسب عادت اندر داخل ہوگئی تھی۔ لیکن اندر داخل ہوتے ہی وہ یک دم گڑبڑا گئی تھی۔ کیونکہ کمرے میں رابعہ کے بجائے صوفہ پر معیز اخبار لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ کھڑا ہوگیا۔ عائشہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔

"السلام علیکم، کیسی ہیں آپ؟" اسے گھبراتے دیکھ کر معیز نے کہا تھا۔ وہ قدرے حیران ہوئی کہ کسی تعارف کے بغیر وہ اس کا حال کیسے دریافت کر رہا ہے لیکن اس نے اس کے سلام کا جواب دے دیا۔

"امی نہا رہی ہیں۔ بس ابھی آجائیں گی۔ آپ پلیز بیٹھیں۔" وہ صوفہ چھوڑ کر خود بیڈ کی طرف چلا گیا تھا۔

"نہیں، میں پھر آجاؤں گی۔"

"عائشہ! آپ کو دوبارہ آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ امی واقعی تھوڑی دیر میں باہر آجائیں گی۔"

اس بار عائشہ کی حیرانی میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا۔ اس کی زبان سے اپنا نام سن کر۔

"آپ پلیز بیٹھیں۔ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" عائشہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور صوفہ پر بیٹھ گئی۔

''میں اصل میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔امی کی مدد۔''معیز نے بات شروع کی تھی مگر عائشہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''پلیز آپ اس بات کو رہنے دیں۔ یہ بہت پرانا واقعہ ہے، اب تو اسے کئی ماہ گزر چکے ہیں۔''

''میں اسی سلسلے میں شرمندہ ہوں کہ پہلے آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکا حالانکہ میں آپ سے پہلے ہی ملنا چاہتا تھا۔لیکن بس کچھ مصروفیات کی وجہ سے مل نہیں سکا۔''

''لیکن میں نے آپ سے کہا ہے نا کہ اس سلسلے میں شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس لیے یہاں نہیں آئی ہوں۔''

عائشہ کے انداز میں کچھ بے بسی تھی۔ معیز خاموش ہو گیا۔

''امی اکثر آپ کے بارے میں بتاتی رہتی ہیں۔ بہت تعریف کرتی ہیں آپ کی۔''معیز کے جملے پر عائشہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور معیز کو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی بے یقینی نظر آئی۔ وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ عائشہ نے ایک بار پھر اس کے چہرے سے نظر ہٹا لی۔

''آپ جاب کرتی ہیں؟''معیز نے گفتگو کا سلسلہ ایک بار پھر جوڑنے کی کوشش کی تھی۔

''ہاں۔''

''کہاں پر؟''عائشہ نے معیز کو چند جملوں میں اپنی جاب اور کمپنی کے بارے میں بتایا۔

''جاب پسند ہے آپ کو؟''کچھ لمحوں بعد اس نے پوچھا تھا۔

''پتا نہیں۔ میں نے کبھی اس بارے میں سوچا نہیں۔''معیز عائشہ کے جواب پر کچھ حیران ہوا تھا۔ کچھ دیر تک وہ اس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور اچانک اسے احساس ہوا تھا کہ وہ خطرناک حد تک خوبصورت تھی۔ بہت چبھتے ہوئے تیکھے نقوش تھے اس کے خاص طور پر اس کی آنکھیں۔ کوئی بہت ہی عجیب تاثر تھا اس کی آنکھوں میں جو دوسرے کو یکدم چپ ہو جانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ معیز نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ دونوں کے درمیان اس دن مزید گفتگو نہیں ہوئی۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد رابعہ نہا کر باہر نکل آئی تھیں اور معیز اٹھ کر کمرے سے آ گیا۔

***

پھر ان دونوں کی اکثر ملاقات ہونے لگی تھی۔ معیز خلاف عادت اتوار کو گھر پہ رہنے لگا تھا۔ لاشعوری طور پر اسے عائشہ کا انتظار رہتا تھا اور جس دن عائشہ نہ آتی، اسے ایک نامعلوم سی بے چینی رہتی۔ دونوں کے درمیان آہستہ آہستہ گفتگو بھی ہونے لگی تھی۔ پھر گفتگو کا یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ وہ دونوں پارک میں بھی ملنے لگے۔ عائشہ شام کے وقت گھر کے قریب پارک میں وقت گزارنے جایا کرتی تھی اور معیز بھی وہیں جاگنگ کے لیے جایا کرتا تھا۔لیکن اب وہ پارک میں عائشہ کے ساتھ واک کیا کرتا تھا۔ وہ بہت اچھا سامع تھا۔شروع میں وہ صرف عائشہ کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ اسے تب یہ احساس ہوا تھا کہ وہ اتنی خاموش طبع نہیں ہے جتنی وہ اسے تب تک نظر آئی تھی پھر آہستہ آہستہ وہ بھی بولنے لگا تھا۔ بہت سی باتیں جو اس نے آج تک کسی سے نہیں کی تھیں وہ اس سے کرنے لگا تھا۔

''پاپا سب کچھ تھے میرے لیے دوست، ساتھی، باپ سب کچھ جب ان کی ڈیتھ ہوئی تو میں سولہ سال کی تھی۔ بہت دنوں تک تو مجھے یقین

ہی نہیں آیا کہ وہ زندہ نہیں ہیں جب یقین آیا تو میرے لیے دنیا ہی ختم ہو چکی تھی۔''

اس دن بھی وہ پارک میں بیٹھے ہوئے تھے جب وہ اپنے والد کی بات کرنے لگی تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب میں دنیا میں کیسے رہوں گی۔ پاپا کے بغیر کچھ کرنا مجھے بہت ناممکن سا لگتا تھا۔ پھر ہر ایک نے جی بھر کے لف کیا ہمیں۔ ددھیال والوں نے ننھیال والوں نے ہر ایک نے کسی نے کوئی لحاظ نہیں کیا۔ میں نہیں جانتی تھی پاپا کے نہ ہونے سے فرق پڑے گا۔ پاپا نے ہمیشہ سب کی مدد کی تھی۔ کبھی کسی کو دھوکا دیا تھا نہ مایوس کیا تھا۔ مگر وہ سب احسان فراموش نکلے سانپ کی طرح دنیا میں کوئی کسی کو اس طرح بے یارومددگار نہیں چھوڑتا جیسے انھوں نے ہمیں چھوڑ دیا تھا۔''

عائشہ کے لہجے میں بہت تلخی تھی۔

''سب ایسا ہی کرتے ہیں، تمھارے رشتے دار اس سے مستثنیٰ نہیں یہ دنیا ہی ایسی ہے۔'' معیز نے اس سے کہا تھا۔

''سب تو ایسا نہیں کرتے جس طرح انھوں نے کیا تھا۔'' وہ اب بھی اپنی بات پر مصر رہی۔

''عائشہ! لوگوں کو معاف کر دینا چاہیے اس طرح۔'' عائشہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''کیا آپ نے معاف کر دیا؟ آپ نے بھی تو بہت کچھ برداشت کیا ہے، ایسے ہی حالات سے گزرے ہیں آپ۔''

''میں نے کبھی کسی کو مجرم سمجھا ہی نہیں۔ ہر چیز کی تلافی اللہ نے کر دی تھی پھر میں کسی سے نفرت کر کے کیا کرتا۔'' وہ نرم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''آپ بہت عجیب ہیں، اپنے گھر میں ان لوگوں کو آنے دیتے ہیں اس طرح ہنسی خوشی ملتے ہیں جیسے انھوں نے کبھی کچھ کیا ہی نہیں۔ کیا آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ ان سب لوگوں کو باری باری بتائیں کہ انھوں نے آپ کے ساتھ کیا کیا۔ انھیں آئینہ دکھائیں۔ ان کے ساتھ میل جول ختم کر دیں۔''

وہ اس کی بات پر مسکرانے لگا تھا۔ ''نہیں۔ میں نے یہ کبھی نہیں چاہا ان سب باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ زندگی ہے اس میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اپنے ظرف کو بہت بڑا کرنا پڑتا ہے۔ میں ان جیسا بننا نہیں چاہتا، کسی کو بے عزت نہیں کر سکتا۔''

وہ اب جھیل میں بوٹنگ کرتے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگا تھا، وہ اضطراب کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔ وہ واقعی بہت عجیب تھا، بہت اعلا ظرف تھا۔

''آپ کے لیے یہ سب کہنا اور کرنا بہت آسان ہے۔ آپ نے میرے جیسی زندگی نہیں گزاری، سیلز آفیسر کی جاب بھی کوئی جاب ہوتی ہے۔ ہر وقت مسکراہٹ، ہر وقت نرمی جن لوگوں کو میرا دیکھنے کو دل نہیں چاہتا ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینی پڑتی ہے۔ اب یہ سب اتنا ناقابل برداشت نہیں ہے جتنا پہلے تھا۔ اس جاب کی وجہ سے مجھے اپنے رشتہ داروں سے زیادہ نفرت ہوئی تھی۔ مجھے ان کی خود غرضی کی وجہ سے گھر سے باہر نکل کر اس طرح کی جاب کرنا پڑی تھی۔''

معیز نے اسے دیکھا۔

''اب تو آپ کو کوئی مجبوری نہیں ہے۔ آپ کا بھائی گھر کو سپورٹ کر رہا ہے پھر آپ یہ جاب چھوڑ نا چاہیں تو چھوڑ سکتی ہیں۔''

عائشہ نے اس کی بات پر نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔

''شاید آپ ان سہولیات کو چھوڑ نا نہیں چاہتیں جو اس جاب کی وجہ سے آپ کو حاصل ہیں۔ ہر جاب گاڑی، موبائل اور اتنی تنخواہ نہیں دیتی جتنی آپ کو ملتی ہے۔''

وہ معیز کی بات پر ایک بار پھر خاموش رہی تھی لیکن اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ معیز کچھ دیر اس کے جواب کا منتظر رہا لیکن وہ خاموش ہی رہی۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔ وہ بات کرتے کرتے چپ ہو جاتی اور پھر معیز کے لاکھ اصرار پر بھی کچھ نہ بولتی، بس گھر چلی جاتی، وہ حیرانی سے یہ سب دیکھتا رہ جاتا۔

*

''آؤ عائشہ! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' اس شام رابعہ نے اسے دیکھتے ہی کہا تھا۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

''آپ کو کیوں انتظار تھا میرا؟''

''بس آج مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔'' وہ ان کے جملے سے زیادہ ان کے انداز پر چونکی تھی۔ وہ بہت خوش، بہت پر جوش نظر آ رہی تھیں۔

''ایسی بھی کیا بات ہے؟'' وہ کچھ الجھ گئی تھی۔

''بتا دوں گی۔ تم پہلے چائے تو پیو۔''

رابعہ نے ملازم کو چائے لاتا دیکھ کر کہا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ ملازم نے چائے بنا کر کپ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ رابعہ بھی چائے پینے میں مصروف ہو گئیں۔

''یہ بات اصولاً تو مجھے تم سے نہیں تمہارے گھر والوں سے کرنی چاہیے تھی۔''

چائے کے چند گھونٹ لینے کے بعد رابعہ نے بات شروع کی تھی۔

''لیکن معیز کا اصرار تھا کہ پہلے میں تم سے بات کروں۔ دراصل معیز تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' وہ رابعہ کی بات پر دم بخود رہ گئی تھی۔

''وہ تمہیں بہت پسند کرتا ہے اور صرف وہ ہی نہیں بلکہ میں بھی۔'' رابعہ کہہ رہی تھیں۔

''میں نے معیز کے لیے جس طرح کی لڑکی کا سوچا تھا، تم بالکل ویسی ہی ہو نیک، باکردار، نرم دل، سمجھدار، باادب۔''

عائشہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ ''میں نے ہمیشہ خدا سے دعا کی تھی کہ وہ مجھے میری بہو میں یہ ساری خصوصیات ضرور دے مگر اللہ نے مجھے میری دعا سے بڑھ کر نوازا ہے۔ تم میں تو اتنی خوبیاں ہیں عائشہ! کہ میں گنوانا بھی چاہوں تو گنوا نہیں سکتی۔ وہ لوگ بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں جنہیں تمہاری جیسی اولاد ملتی ہے اور میں چاہتی ہوں۔ اس خوش نصیبی کو اپنا مقدر بھی بنا لوں۔ معیز نے مجھ سے کہا تھا کہ میں پہلے تمہاری رائے لوں۔

اس کے بعد رشتہ لے کر تمھارے گھر جاؤں۔ میں نے تو اس سے کہا تھا کہ عائشہ کسی اور کو پسند نہیں کر سکتی وہ ایسی لڑکی ہی نہیں ہے اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ کبھی مجھ سے ذکر تو کرتی۔ مگر اس نے مجھ سے کہا کہ میں پھر بھی پہلے تم سے پوچھوں، اس کے بعد ہی بات آگے بڑھاؤں۔"

وہ جیسے کسی سکتے کے عالم میں تھی۔ رابعہ کہتی جارہی تھیں۔

"میرے بیٹے نے کبھی کسی کو دھوکا دیا نہ کسی کا دل دکھایا ہے۔ ہر ایک پر احسان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اسے خدا نے انعام کے طور پر تمھارے جیسی لڑکی سے ملوایا ہے۔ اب تم بتاؤ عائشہ! تمہاری کیا رائے ہے۔ میں کب تمھارے گھر تمہاری امی سے بات کرنے آؤں؟"

وہ اب عائشہ سے پوچھ رہی تھیں۔ وہ خالی خالی نظروں سے انھیں دیکھ رہی تھی، رابعہ کے چہرے پر موجود اعتماد اور فخر کی چمک نے اس کے پورے وجود کو تاریک کر دیا تھا وہ کچھ کہے بغیر کپ رکھ کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھے کچھ وقت دیں۔ ابھی میں آپ کو اس سلسلے میں کوئی جواب نہیں دے سکتی۔"

❁

وہ پارک میں اپنے مخصوص بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ معیز نے اسے دور سے دیکھ لیا تھا۔ قدموں کی چاپ پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ معیز کو اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ایک جھٹکا لگا تھا۔ اسے قیافہ شناسی کا دعوا نہیں تھا مگر وہ چہرہ شناس ضرور تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے عائشہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا تھا۔ وہ جواب دیے بغیر یک ٹک اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ معیز کو یوں لگا جیسے وہ ذہنی طور پر وہاں موجود نہیں تھی۔ اسے ہمیشہ اس کی آنکھیں بولتی ہوئی لگی تھیں اور آج پہلی بار وہ آنکھیں اسے گونگی لگی تھیں۔

"کیا بات ہے؟ کوئی مسئلہ ہے عائشہ؟" وہ نرم لہجے میں کہتا ہوا اس سے کچھ فاصلے پر بینچ کے دوسرے سرے پر بیٹھ گیا۔ اس نے معیز کو دیکھنا بند کر دیا تھا وہ دور جاگنگ ٹریک پر بھاگتے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔

"مجھے کچھ بتانا ہے۔ اپنے بارے میں کچھ ایسی باتیں جو آپ نہیں جانتے۔" وہ سامنے نظریں جمائے آہستہ سے بولی تھی۔

"کیا یہ بہت ضروری ہے۔" معیز نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔

"ہاں بہت ضروری ہے۔" اس بار معیز کو اس کی آواز کسی کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ اب بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔

"میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ آپ اور آنٹی مجھے جو سمجھ رہے ہیں میں وہ نہیں ہوں۔" وہ اس کی بات پر چونکا نہیں تھا بس سنجیدگی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

میں آپ کو کسی دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتی۔ آپ نے زندگی میں بہت محنت کی ہے۔ بہت تکلیفیں برداشت کی ہیں اب آپ اس کے مستحق نہیں ہیں کہ میرے جیسی لڑکی آپ کی زندگی میں شامل ہو۔ میں اتنی پاکیزہ، مقدس اور نیک نہیں ہوں جتنا آپ لوگ مجھے سمجھتے ہیں۔ میں ہر لحاظ سے تھرڈ کلاس ہوں۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں آپ دونوں کو دھوکہ دیتے ہوئے آپ کی زندگی میں شامل ہو جاؤں۔ آپ کے سکون کو تباہ

کروں۔ میں یہ سب آنٹی سے کہنا چاہتی تھی مگر مجھ میں اتنا حوصلہ، اتنی ہمت نہیں تھی۔ وہ مجھے پتا نہیں کیا سمجھتی ہیں اور میں انھیں یہ نہیں بتا سکتی کہ میں کتنی عام، گری ہوئی لڑکی ہوں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ میں سب کچھ آپ کو بتا دوں۔ آپ آنٹی کو خود ہی میرے بارے میں بتا دیجئے گا۔''

وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔ معیز نے اسے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے دیکھا یوں جیسے وہ کچھ بتانے کے لیے ہمت مجتمع کر رہی ہو۔ پھر اس نے سر جھکا لیا۔

''چار سال پہلے مجھے اپنے تایا کے بیٹے سے محبت ہو گئی تھی۔ تب ہم ان کی فیملی کے ساتھ نہیں ملتے تھے۔ میں کسی کو بھی اپنے گھر آنے نہیں دیتی تھی۔ وہ ایک بار میرے آفس آیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے۔ وہ چاہتا تھا میں اپنے خاندان کو ان کے خاندان سے ملنے سے نہ روکوں۔ ان کے خاندان پر پابندیاں نہ لگاؤں۔ شروع میں مجھے اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔'' وہ اب بات کرتے ہوئے اپنی ہتھیلیاں دیکھ رہی تھی۔ ''مگر وہ بار بار آتا رہا۔ بار بار مجھ سے کہتا رہا کہ اسے مجھ سے محبت ہے۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ آہستہ آہستہ مجھے اس کی باتوں پر یقین ہونے لگا۔ پھر تایا کی فیملی سے ہمارے تعلقات بحال ہونے لگے۔ وہ لوگ ہمارے گھر آنے جانے لگے۔ پھر ایک دن حاذق نے مجھے بتایا کہ اس کے ماں باپ میرا رشتہ مانگنے کے لیے ہمارے گھر آئیں گے۔ اس نے اپنے ماں باپ کو ہمارے گھر بھجوایا لیکن انھوں نے میرا نہیں فریحہ کا رشتہ مانگا۔ انھوں نے کہا یہ سب حاذق کی خواہش پر ہو رہا ہے۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ میں نے حاذق سے پوچھا تو اس نے مجھ سے کہا کہ وہ کبھی بھی نہ تو مجھ سے محبت کرتا تھا نہ ہی مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ اور فریحہ ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ مگر ان کی شادی تب تک نہیں ہو سکتی تھی جب تک میں امی کو تایا کی فیملی سے تعلقات بحال نہ کرنے دیتی۔ انھوں نے تعلقات بحال کروانے کے لیے یہ طریقہ سوچا۔

میں کچھ نہیں کہہ سکی۔ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ رہ ہی نہیں گیا تھا۔ حاذق نے مجھ سے معذرت کر لی مگر فریحہ نے نہیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ اس نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ وہ ٹھیک تھی، اس نے بالکل صحیح کیا تھا۔ غلطی تو مجھ سے ہوئی تھی۔

امی نے حاذق کا رشتہ منظور کر لیا۔ دونوں کی شادی ہو گئی۔ مجھے اپنا وجود بالکل بے کار لگنے لگا۔ میں ایک ایسی چیز بن گئی تھی جس سے کوئی بھی محبت کرتا تھا نہ ہی پسند کرتا تھا۔ سب کو اعتراض ہونے لگا تھا۔ میری ہر بات پر، ہر کام پر۔

فریحہ کی شادی پر احمر بھی آیا تھا اس نے بھی وہاں شادی کر لی تھی اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اب اس جاب کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے میں یہ جاب چھوڑ دوں اور گھر بیٹھ جاؤں۔ اسے میرے کردار پر دوسروں کی طرح اعتراضات تھے۔ میں نے اس کی بات نہیں مانی۔ اس نے میرے ساتھ سارے تعلقات ختم کر دیے۔ جب تک میرے گھر والوں کو میری ضرورت تھی وہ مجھے استعمال کرتے رہے۔ جب انھیں میری ضرورت نہیں رہی تو انھوں نے مجھے ایک استعمال شدہ چیز کی طرح پھینک دیا۔ پہلے میں گھر کو سپورٹ کرتی تھی کیونکہ احمر امریکہ میں سیٹل نہیں ہو رہا تھا پھر اس نے باہر سے لمبی چوڑی رقم کے ڈرافٹ بھیجنا شروع کر دیے۔ تب کسی کو میرے چند ہزار کی ضرورت نہیں رہی تو گھر میں میرا عمل دخل بھی ختم کر دیا گیا۔ ان دنوں میں نے ڈرنک کرنا شروع کر دی۔''

وہ بات کرتے کرتے ایک بار پھر رکی۔ معیز کا چہرہ اب بھی بے تاثر تھا۔

''ڈرنک کے بعد کوکین پھر ہیروئن۔ گھر والوں کو شروع میں پتا نہیں چلا جب پتا چلا تب تک کافی دیر ہو چکی تھی۔ میں وہ سب کچھ چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ ہاں گھر چھوڑنے پر تیار تھی۔ ایسا کرتی تو شاید گھر والوں کی بہت بدنامی ہوتی۔ اس لیے انھوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ پھر ان ہی دنوں آنٹی والا حادثہ ہوا۔ آپ لوگوں کے ساتھ واقفیت بڑھی۔ میں نے آنٹی سے شروع میں بچنے کی بہت کوشش کی۔ میں نہیں چاہتی تھی وہ میرے بارے میں کچھ جانیں مگر ایسا نہیں ہوا، مجھے نہیں پتا کس طرح میں ان کے پاس جانے لگی۔ شاید مجھے کوئی سہارا چاہیے تھا۔ محبت کے چند لفظ چاہیے تھے۔ وہ آپ کے بارے میں بات کرتی رہتی تھیں آپ نے بچپن کس طرح گزارا۔ کتنی تنگی برداشت کی۔ رشتہ داروں کے ہاتھوں کتنی ذلت اٹھائی۔ مجھے آپ سے انس ہونے لگا۔ مجھے آپ کی زندگی اپنی جیسی لگتی تھی۔ پھر میں لاشعوری طور پر آپ کے پاس آنے لگی۔ آپ سے باتیں کرنے لگی اور تب میرا دل چاہا میں زندگی سے محبت کروں۔ میں وہ سب کچھ چھوڑ دوں جس کی میں عادی ہو چکی تھی اور میں نے یہی کیا۔ میں نے ایک سینٹر جوائن کیا اور ڈرگز کو چھوڑ دیا۔ گھر والے آج بھی یہی سمجھتے ہیں کہ میں ڈرگز استعمال کرتی ہوں لیکن میں نہیں کرتی۔ میں نے آپ کو پہلے کبھی یہ سب نہیں بتایا مجھے خوف تھا دوسروں کی طرح آپ بھی مجھ سے نفرت کریں گے۔ رابعہ آنٹی مجھے اپنے گھر نہیں آنے دیں گی میں ایک بار پھر پہلے کی طرح اکیلی رہ جاؤں گی۔ میں ماضی کو دفن کر دینا چاہتی تھی مگر ماضی دفن ہی تو نہیں ہوتا۔ آپ نے زندگی میں ایسا کوئی کام نہیں کیا ہے کیا آپ کے مقدر میں میرے جیسی کرپٹ لڑکی ہونی چاہیے؟ میں نے آپ کے پرپوزل دیے جانے کے بعد یہی سوچا تھا پہلے میرا دل چاہا تھا کہ میں آپ کو کچھ بھی نہ بتاؤں سب کچھ چھپا ہی رہنے دوں۔ مگر یہ سب بہت مشکل ہے۔ مجھے رابعہ آنٹی اور آپ سے خوف آنے لگا ہے۔ میں آپ دونوں کو پچھلے چھ ماہ سے بلف کر رہی ہوں۔ آپ دونوں مجھے بہت پاکیزہ، نیک، ایثار پسند سمجھتے ہیں حالانکہ میں تو ایسی ہوں ہی نہیں۔ میری حقیقت کبھی نہ کبھی تو آپ لوگوں کے سامنے کھل ہی جاتی پھر آپ لوگ مجھ سے نفرت کرتے۔ میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ آپ کسی اچھی لڑکی سے شادی کریں یا پھر معصومہ سے شادی کر لیں وہ ہر لحاظ سے آپ کے قابل ہے۔ ہر لحاظ سے مجھ سے بہتر ہے۔ میرے جیسے عیب نہیں ہیں اس میں، آپ اس کے ساتھ بہت اچھی زندگی گزاریں گے۔ وہ رابعہ آنٹی کو بھی بہت پسند ہے۔ وہ معصومہ جیسی بہو ہی چاہتی ہیں۔''

وہ خاموش ہو گئی۔

''ایک کہانی سنیں گی آپ؟'' جو جملہ اس کی تمام گفتگو کے بعد اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا۔ اس نے اسے حیران کر دیا تھا وہ سر اٹھا کر معیز کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

آج سے چھبیس سال پہلے ایک بچے نے اپنی دنیا کو ختم ہوتے اور ایک نئی دنیا کو ابھرتے دیکھا۔ ختم ہونے والی دنیا محبتوں، آسائشوں، رنگینیوں کی دنیا تھی اور نئی دنیا ذلتوں، آزمائشوں اور ٹھوکروں کی دنیا تھی۔ اس دنیا میں اس نے پچھلی دنیا کے کرداروں کو نئے چہروں کے ساتھ دیکھا، اصلی چہروں کے ساتھ اور وہ چہرے بہت ہولناک تھے۔''

وہ آنکھوں میں ابھرتی نمی کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔ وہ اسے کیا سنا رہا تھا۔

''اس نے ہر رشتے کو بہت معمولی، بہت بے معنی پایا۔ انسانوں پر سے اس کا اعتبار اٹھ گیا۔ لمبے عرصے تک وہ لوگوں سے خوف کھاتا رہا۔

پھر اس نے ایک بار پھر اپنی دنیا نئے سرے سے بنانے کا فیصلہ کیا۔ اسے ایک بار پھر پرانی دنیا میں اصلی کردار نقلی چہروں کے ساتھ چاہیے تھے۔ چھبیس سال تک اس نے ایک لمبی جدوجہد کی۔ اس جدوجہد میں اس نے بہت کچھ گنوایا۔ اپنی منگیتر، اپنا بچپن، ماں کی توجہ اور وقت، اپنی تعلیم اپنی جوانی اور یہ سب گنوانے کے بعد وہ پرانی دنیا کو دوبارہ سے تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تب وہ چونتیس سال کا ہو چکا تھا۔ تب اسے محبت کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس محبت کی نہیں جسے وہ روپے سے خرید سکتا تھا بلکہ اس محبت کی جو اس کے وجود کی ساری کمیوں کو پورا کر دے پھر اسے ایک لڑکی ملی۔''

اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ وہ اسے دیکھنے کے بجائے پارک میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

''اسے لگا جیسے اس کی تلاش ختم ہو گئی تھی۔ وہ اسے ہر اعتبار سے اپنے جیسی لگی۔ اس لڑکی میں بہت سی خامیاں تھیں، بالکل اس کی طرح مگر اسے تو اس کے وجود سے نہیں اس کے دل سے محبت تھی جس نے ایک بار اس لڑکی کو اس کی ماں کو بچانے پر مجبور کیا تھا۔''

کوئی چیز عائشہ کے گال بھگونے لگی۔ وہ اب بھی بول رہا تھا۔

''بہت عرصہ دونوں نے اکٹھے گزارا پھر اس نے اس لڑکی کو پرپوز کر دیا۔ تب ایک دن وہ لڑکی اپنے پورے ماضی کو اٹھا کر اس کے سامنے پہنچ گئی۔ اسے بتانے لگی کہ اس نے زندگی میں کیا کیا ہے وہ صاف گو اور ایماندار بننا چاہتی تھی۔ اس کو دھوکا نہیں دینا چاہتی تھی۔''

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں صاف گو بننا چاہتی ہوں نہ ایماندار میں تو صرف۔''

اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر معیز نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میں صرف حاذق کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ باقی سب کچھ جانتا تھا، یہ بھی کہ تم ڈرنک کرتی ہو۔ یہ بھی کہ تم ڈرگز لیتی ہو۔''

اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ معیز آپ سے تم پر آ چکا تھا۔

''میں نے تمھیں پرپوز کرنے سے پہلے تمھارے بارے میں سب کچھ پتا کروایا تھا جہاں تم کام کرتی ہو وہاں تمھاری ریپوٹیشن کیا ہے۔ تمھاری کمپنی کیسی ہے۔ پھر وہ Rehabilitation سینٹر جہاں تم اپنے علاج کے لیے جاتی رہیں وہاں سے بھی میں تمھارا سارا ریکارڈ دیکھ چکا ہوں۔ جس عمر میں میں شادی کر رہا ہوں۔ اس عمر میں کوئی بھی مرد آنکھیں بند کر کے صرف محبت کے لیے شادی نہیں کرتا۔ میں نے بھی تمھارے بارے میں پوری چھان بین کی تھی۔ یہ مانتا ہوں کہ مجھے شاک لگا تھا، یہ جان کر کہ تم ڈرگز استعمال کرتی رہی ہو۔ بے شک یہ بہت زیادہ مقدار میں نہیں تھا مگر پھر بھی کسی ڈرگ ایڈکٹ سے شادی کرنے کا فیصلہ کافی مشکل تھا۔ میں نے اس پر کافی سوچا، تمھارے حق میں سب سے بڑا پوائنٹ یہ جاتا تھا کہ تم ڈرگز سے نجات حاصل کر چکی تھیں اب نارمل تھیں۔ اس لیے مجھے فیصلہ کرنے میں کچھ مشکل تو ہوئی لیکن بہر حال میں نے تمھارے حق میں ہی فیصلہ کیا۔

جہاں تک حاذق کا تعلق ہے تو میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ تم ماضی میں کسے پسند کرتی تھیں یا کس سے محبت کرتی تھیں۔ مجھے اگر دلچسپی ہے تو صرف اس بات سے کہ تم اس وقت کس سے محبت کرتی ہو۔ عائشہ! تمھارا مسئلہ یہ ہے کہ تم بہت جذباتی ہو اور اس جذباتیت نے تمھیں بہت کمزور بنا دیا ہے۔ تم زندگی میں ہمیشہ سوچے سمجھے بغیر فیصلے کرتی رہی ہو۔ ہمیشہ اپنے ماضی کو سر پر اٹھائے پھرتی رہی ہو۔ ہم میں سے کچھ اپنی غلطیوں سے سیکھتے ہیں اور انھیں دوبارہ نہیں دہراتے کچھ غلطیوں سے کچھ بھی نہیں سیکھتے اور وہی غلطیاں دوبارہ کرتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو ساری عمر اپنی غلطیوں کو پچھتاوؤں کی صورت میں ساتھ لیے پھرتے ہیں پھر وہ اپنی زندگی کو ہی ایک پچھتاوا بنا دیتے ہیں تم بھی اسی کیٹیگری میں آتی ہو۔''

وہ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتی جا رہی تھی۔ وہ بڑے ٹھنڈے لہجے میں بولتا جا رہا تھا۔

''حاذق اور فریحہ نے تمھارے ساتھ جو کیا وہ اسے بھلا چکے ہیں۔ اس کا ثبوت ان کی اچھی زندگی ہے۔ تم نے کچھ نہیں بھلایا بلکہ اپنے آپ سے نفرت کرنی شروع کر دی۔ کیوں؟ حاذق ہی زندگی میں سب کچھ نہیں تھا اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ تم نے خود کو سب سے کاٹ لیا۔ سگریٹ نوشی شروع کر دی پھر ڈرنک پھر ڈرگز کیا ان چیزوں نے تمھاری مدد کی یہ چیزیں کبھی کوئی حل نہیں کرتیں کیونکہ وہ تو خود ہی ایک مسئلہ ہوتی ہیں۔ تم نے اچھا کیا۔ خود ان سے جان چھڑا لی۔ یہ تمھارے لیے اس لیے آسان ثابت ہوا کیونکہ تم ابھی انھیں بہت کم مقدار میں استعمال کرتی تھیں اگر زیادہ مقدار میں کرتیں تو جتنی کم قوت ارادی تمھاری ہے تم کبھی بھی ان چیزوں سے نجات حاصل نہ کر سکتیں۔ تم نے زندگی میں دوسروں سے اتنا انتقام نہیں لیا جتنا اپنے آپ سے لیا ہے۔ تم خود کو دوسروں سے کاٹ کر انھیں سزا دینا چاہتی ہو تمھارا خیال ہے اس طرح انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گا یا کم از کم انھیں تکلیف تو ضرور ہو گی۔ عائشہ حقیقی زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہوتا آپ صرف خود کو اکیلا کر لیتے ہیں۔ انتقام لینے میں دوسروں کو کچھ تکلیف ضرور ہوتی ہو گی انتقام لینے والے کی تو پوری زندگی، پوری ذات، پوری شخصیت مسخ ہو جاتی ہے۔''

اس کے گال ایک بار پھر بھیگنے لگے تھے۔ وہ دھندلی آنکھوں سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''میں روز شام کو یہاں جاگنگ کرنے آتا تھا اور میں نے بہت دفعہ تمھیں شام گئے تک یہیں بیٹھے دیکھا۔ بعض دفعہ تم اسموکنگ کر رہی ہوتی تھیں تب میری تم سے کوئی زیادہ سلام دعا نہیں تھی، اس لیے میں کبھی تمھارے پاس نہیں آیا لیکن میں حیران ضرور ہوتا تھا کہ تم پارک میں آ کر شام

تک کیوں بیٹھی رہتی ہو۔ آفس سے سیدھی گھر کیوں نہیں جاتیں۔ پھر آہستہ آہستہ مجھے اندازہ ہوا کہ تم دراصل گھر جانا ہی نہیں چاہتی تھیں تم اپنے ماحول سے فرار چاہتی تھیں۔ کئی سال پہلے میں بھی اسی طرح گھر سے بھاگتا تھا۔ گھر سے باہر بے مقصد وقت گزارتا تھا۔ گھر جانا ہی نہیں چاہتا تھا میرا مسئلہ اور تھا۔ امی کے علاوہ میرا کوئی نہیں تھا اور جو تھے ان سے مجھے انس نہیں تھا نہ انھیں میری ضرورت تھی۔''

اس کے لہجے میں اب عجیب سی افسردگی تھی۔ وہ دم بخود اس کی باتیں سنتی جارہی تھی۔

''مگر تمہاری تو ساری فیملی تھی پھر تم ان کے پاس کیوں جانا نہیں چاہتی تھیں۔ تم ایک بار دعوت پر ہمارے گھر آئیں تو اپنے گھر والوں کے پاس بیٹھنے کے بجائے اکیلے ایک طرف بیٹھی رہیں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی تم میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔ میں تمہاری ذات کی گرہوں کو کھولنا چاہتا تھا۔ میں تمہارے اسرار کو بوجھنا چاہتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ تمہارے بارے میں بہت کچھ میرے علم میں آتا گیا۔ تم جب بھی امی کے پاس آتی تھیں اپنے ابو کی باتیں کرتی رہتی تھیں۔ یاد ہے تم نے ایک بار مجھ سے کہا تھا۔ آپ بالکل میرے پاپا جیسے ہیں۔ تم ہر مرد کے وجود میں اپنے پاپا کو تلاش کیوں کرتی رہتی ہو۔ تمھیں یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ وہ بہت سال پہلے مر چکے ہیں اور کوئی دوسرا شخص کبھی بھی ان کی جگہ نہیں لے سکتا۔ میں جانتا ہوں، یہ مشکل ہے مگر یہ بہت ضروری ہے۔ میرے ڈیڈی بھی بچپن میں مر گئے تھے۔ بہت دیر تک مجھے بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ہوا کیا ہے۔ بہت دیر تک ان کے بغیر مجھے چلنا نہیں آیا پھر میں نے حقیقت تسلیم کر لی۔ ان کے بغیر زندگی گزارنا سیکھا۔ عائشہ! تم یہ بھی نہیں کر سکیں۔ ہے نا؟''

وہ بہت دھیمے بہت نرم لہجے میں اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ بے آواز روتی رہی۔

''لیکن ان خامیوں کے سوائے تم میں بہت سی خوبیاں بھی ہیں۔ تم بہت ایثار پسند ہو، کرپٹ نہیں ہو، حیران کن بات یہ ہے کہ تم ایک بہت کامیاب سیلز آفیسر ہو۔ تمہارے آفس میں تمہاری ریپوٹیشن بہت اچھی ہے۔ اگر تم باہر کی دنیا میں ایک کامیاب انسان کے طور پر زندگی گزار سکتی ہو تو نجی زندگی میں بھی ایسا ممکن ہے۔ ابھی تمہارے پاس بہت وقت ہے۔ تم سب کچھ ٹھیک کر سکتی ہو۔ میں تمہاری امی سے بات کروں گا۔ احمر سے بھی بات کروں گا۔ تم نے ایسی کوئی غلطی نہیں کی جسے معاف کیا ہی نہ جا سکے۔ ایک دفعہ پھر سے تم اپنی فیملی کے ساتھ نئی زندگی شروع کر سکتی ہو۔ میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ تمہاری امی اور گھر والوں کو تم سے محبت بھی ہے اور تمہاری ضرورت بھی۔ تم یہ سمجھنا چھوڑ دو کہ انھوں نے تمھیں استعمال کر کے پھینک دیا ہے۔ تم کوئی چیز نہیں انسان ہو۔ انسانوں کو چھوڑا نہیں جاتا۔''

پارک میں تاریکی پھیل چکی تھی۔ دور کہیں کچھ لائٹس جل رہی تھیں مگر ان کی روشنی ان دونوں تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ اسے معیز کا چہرہ اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف آواز سنائی دے رہی تھی۔ بعض دفعہ چہرے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف آوازوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی ایسی آواز کی جس میں آپ کے لیے ہمدردی ہو، جو آپ کے وجود کے تمام ناسوروں کو نشتر کی طرح کاٹ پھینکے اور پھر بہت نرمی سے ہر گھاؤ کو سی دے۔ اس وقت اس کی سماعتوں میں ایک ایسی ہی آواز آ رہی تھی، وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ زندگی گزارنے کا ہنر سکھا رہا تھا۔ اس کا محاسبہ کر رہا تھا۔ اس کے عیب دکھا رہا تھا۔ اسے کچھ بھی برا نہیں لگ رہا تھا۔ بہت عرصہ کے بعد وہ کسی کے سامنے اس طرح آنسو بہا رہی تھی اسے اپنے آنسوؤں پر شرمندگی نہیں تھی۔ وہ اس شخص کے سامنے بہہ رہے تھے جو اس کے اندر کو اس سے بھی بہتر جانتا تھا۔ وہ اس سے دوسرے لوگوں کی طرح کچھ بھی چھپا نہیں سکی تھی حتیٰ کہ آنسو بھی۔

''آؤ اب چلتے ہیں۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ ہتھیلی کی پشت سے اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔

''ہاں اور امی کو اپنے بارے میں یہ بتانے کی حماقت مت کرنا۔ بہت سی چیزیں ان کے لیے کبھی بھی قابل قبول نہیں ہوں گی۔''

وہ اس کے آگے چلتا ہوا کہتا جا رہا تھا۔ وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے واکنگ ٹریک پر آگئے تھے۔ الیکٹرک پولز پر لگی ہوئی روشنیاں راستے پر چلتے ہوئے لوگوں کو بھی روشن کر رہی تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر اپنے آگے چلتے ہوئے اس دراز قد، معمولی شکل کے غیر معمولی انسان کو دیکھا جو اسے ہمیشہ ہی بہت بہتر، بہت بلند تر لگا تھا اور آج اس کا قد کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔

ختم شد